بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تقریب

جس طرح جامعہ ملیہ نے ہمیشہ داد وتحسین یا عام پسندیدگی و پذیرائی کے خیال سے علٰحدہ ہو کر محض اپنے مساعی کی تکمیل اور اپنے فرائض کی ادائیگی کو اپنا نصب العین قرار دیا اسی طرح جامعہ یا اُس کے متعلقین نے محض رسمی طور پر کسی چیز کو اختیار نہیں کیا۔ مثلاً نصاب تعلیم میں ایسی چیزیں بھی آپ کو نظر آئیں گی جو بالعموم دوسری درسگاہوں میں داخل نصاب ہیں، یا تقسیم اوقات، طریق امتحانات اور دوسری ضروری چیزوں کو آپ جامعہ اور دوسری یونیورسٹیوں میں مشترک پائیں گے۔ لیکن یہ اس لئے نہیں کہ وہ ہر تعلیم گاہ کا شعار ہے بلکہ خود ان کا وجود بھی ہمارے جامعہ کے لئے فی الحال ضروری سمجھا گیا ہے اور اس لیے ان کو اختیار کیا گیا۔

ہر دار العلوم کی یہ بھی قدیمی سنت ہے کہ اس کا ایک مخصوص علمی رسالہ ہو لیکن جامعہ ملیہ نے اس کو اُس وقت تک ضروری نہیں سمجھا کہ طلبہ کے علمی ذوق، مشاغل تصنیف و تالیف کی مقبولیت، اور جامعہ کی علمی زندگی کی تدریجی ترقی کے ساتھ خود رسالہ کا وجود بھی مسئلہ ارتقا کے عالمگیر اثر سے پیدا نہ ہو جائے۔ چنانچہ تقریباً ایک سال تک طلبائے جامعہ اپنے رسالہ "جوہر"* کو قلمی نکالتے رہے

* یہ وہ رسالہ ہے جو اپنی مخصوص علمی و ادبی خوبیوں کے لحاظ سے آج بھی قابل زیارت ہے، لیکن افسوس کہ بعض جوہر اس کو کتب خانہ جامعہ ملیہ کی نذر کر چکے ہیں اور ہمارے مہتمم صاحب کتب خانہ سے کسی قلمی چیز کا حدود کتب خانہ سے باہر حاصل کرنا تقریباً ناممکن ہے۔

اور اس طرح وہ تمام اسباب جو ایک علمی رسالہ کی اشاعت کے لئے ناگزیر ہوتے ہیں خود ہی فراہم ہو گئے
جن کی موجودگی میں مجلس تعلیمی کو رسالہ "جامعہ" کی طبع و اشاعت کی منظوری دینا ضروری ہو گیا۔ اس
عرصہ میں شعبہ تصنیف و تالیف کی گزشتہ یک سالہ کوششوں کے نتائج بھی ظاہر ہونے
آئندہ کے لیے بھی تنظیم و ترتیب کے ابتدائی مدارج سے فراغت حاصل ہو چکی تھی ا
کا اس شعبہ کو ذمہ دار قرار دینا زیادہ دشوار نہ ہوا اس اعتبار سے غالباً یہ عرض کر
کہ رسالہ "جامعہ" جو بفضل خدا آج آپ کے ہاتھوں میں ہے کسی بیرونی ضرورت یا خارجی اثر سے نہیں
بلکہ خود ہی عالم وجود میں آیا ہے، گویا

ما نبودیم بدیں مرتبہ راضی غالب
شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فن ما

اور یہ "جامعہ ملیہ" جیسے تعلیمی مرکز کے لئے ہرگز قابل تعجب بھی نہیں۔

"جامعہ" کے متعلق اسقدر عرض کرنا ضروری ہے کہ اگرچہ یہ رسالہ شعبہ تصنیف و
تالیف کے زیر نگرانی شایع ہوگا لیکن یہ طلبائے جامعہ ملیہ ہی کا رسالہ ہے، انھیں کا اہتمام
ترتیب و تہذیب میں، انھیں کی کوششیں اس کی طبع و اشاعت میں، اور انھیں کی کاوش
محنت اس کے علمی و ادبی مضامین میں نظر آئیگی۔

نورالرحمن

شذرات

نجم رسالہ اردو کے پچھلے دو نمبروں میں شعر العجم پر محمود شیرانی صاحب پروفیسر اسلامیہ کالج کی تنقید شایع ہوئی ہے اور یہ سلسلہ غالباً ابھی ایک عرصہ تک جاری رہے گا۔ کیونکہ ابھی صرف رودکی سے فردوسی تک بحث کی گئی ہے۔ زیادہ تر واقعات، تواریخ و رجال کی غلطیاں دکھائی ہیں اس لئے تصنیف کے نقائص تو قابل تسلیم معلوم ہوتے ہیں مگر اُن سے مصنف کا استخفاف جائز نہیں ہوسکتا جن کتابوں کی بنا پر شعر العجم کے اغلاط دکھائے گئے ہیں قریب قریب وہ سب یا تو تالیف شعر العجم کے وقت تک شایع ہی نہیں ہوئی تھیں یا مؤلف تک پہنچی نہ تھیں یا غیر زبانوں میں تھیں۔ اس لحاظ سے تصنیف میں ہزار عیب سہی، مصنف کو خاطی قرار دینا ویسا ہی ہے جیسے کسی طالب علم ہیئت جدید کا جدید دوربینوں اپنے مشاہدوں اور تجربوں کی بنا پر قدیم نظام فلکی کے لئے بطلیموس پر استہزا کرنا۔ آئندہ اشاعت میں اس تنقید پر کسی قدر تفصیل کے ساتھ نظر کی جائیگی۔

تلک مہاراشٹر ودیاپیٹھ

دیگر قومی درسگاہوں کی طرح یہ یونیورسٹی بھی ترک موالات کے سلسلہ میں عالم وجود میں آئی۔ اس نے اپنا مقصد "نہ صرف مہاراشٹر اعظم کی دیگر قومی درسگاہوں کے ساتھ اتحاد عمل پیدا کرنا، بلکہ وید، ہندی علم ہیئت اور فلسفہ کی اعلیٰ تعلیم کے لیے ایک مرکز قایم کرنا" رکھا ہے۔ اس کی ضروریات فی الحال یہ ہیں:۔

۲ لاکھ	یونیورسٹی کے قیام کے لئے
۵ لاکھ	ایک رصدگاہ کی تعمیر کے لئے
۳ لاکھ	طلبا کے دار الاقامہ کے لئے

رصدگاہ کے لئے زمین سر گنپت مہاراج نے عطا فرمائی ہے۔

احاطۂ مدراس میں اشاعت ہندی

ہندی پرچار (مبلغین ہندی) کی ترقی کی رپورٹ پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دکن

میں اس زبان کی اشاعت کے لئے کس سرگرمی سے کوشش کی جارہی ہے۔ رپورٹ مذکور سے یہ معلوم
ہوتا ہے کہ اندھرا تامل اور ملیالا کے صوبوں میں ۴۰ مرکز ہیں اور ۳ ہزار طلبا ان مبلغین کی ماتحت
ہندی سیکھتے ہیں یہ تعداد [illegible] کے علاوہ ہے جو خارجی طور پانچ کے طور پر پڑھتے ہیں اس کا آغاز
مہاتما گاندھی جی کی ان کوششوں سے ہوتا ہے جنہیں موصوف نے ۱۹۱۸ء میں ہندی ساہت سمیلن
(انجمن ترقی ہندی) کے سالانہ جلسہ بمقام اندور کیا تھا۔

شانتی نکیتان

ڈاکٹر این ونٹرنسٹز مشہور فاضل مشرقیات شانتی نکیتان کے زمرۂ اساتذہ میں شامل ہو گئے
ہیں اور فی الحال ایک سال تک طلبا کو علوم سنسکرت کی تحقیق میں درس دیں گے مہابھارت
آپ کا خاص موضوع ہوگا۔

لازمی تعلیم

نومبر ۱۹۲۱ء میں مجلس مدارس نے بمبئی میونسپل کارپوریشن کو ۲۵-۱۹۲۴ء تک شہر میں مفت و جبریہ
تعلیم جاری کرنے کی ایک اسکیم پیش کی ہے۔ سال زیر بحث کے عرصہ میں ۵۴ نئے مدارس کھولے گئے اور
اب مجموعی تعداد مدارس کی ۲۹۸ ہو گئی اور طلباء کی تعداد ۳۲۲۱۱ سے بڑھ کر ۳۵۰۶۲ ہو گئی۔ کل مصارف
۱۵۹۱۲۹۸ روپیوں سے ۱۹۶۳۵۷۳ روپے ہو گئے۔
اسی سلسلہ میں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ صوبہ متحدہ میں مفت جبریہ تعلیم کا آغاز سب سے پہلے مراد آباد
اور بریلی سے ہوا ہے۔

راجپوتانہ یونیورسٹی

الہ آباد یونیورسٹی کے قواعد کی حال میں جو ترمیم ہوئی ہے اس کی وجہ سے اجمیر، جے پور، جودھپور
کے ملحقہ کالجوں کی حالت نازک پڑ گئی ہے۔ اس بنا پر راجپوتانہ کے بعض حامیان تعلیم اس
کوشش میں ہیں کہ خود راجپوتانہ میں ایک یونیورسٹی قائم کی جائے۔ اس کے لئے ایک وفد وہاں
کے راجگان اور والیان ریاست کی خدمت میں جائے گا۔ ان کا خیال ہے کہ نصف مصارف

گورنمنٹ کے ذمہ اور نصف کے کفیل والیان ریاست ہوں۔

حبشی اقوام گزشتہ جنگ عظیم نے دنیا کے ہر حصہ کو متحرک اور ہر خفتہ بخت قوم کو بیدار کر دیا ہے جس کا ثبوت مختلف ممالک سے مختلف صورتوں میں ظاہر ہوا ہے۔ ایشیا اور یورپ کا تصادم گو ابھی دور ہی لیکن مقابلہ کے ابتدائی لوازم پیدا ہوتے جاتے ہیں اور زمانہ کے بعض شناس اپنے اپنے خیال کے مطابق آیندہ کے متعلق پیشین گوئی پر آمادہ نظر آتے ہیں۔ لیکن اس جدوجہد کے بعض نمایاں پہلو بالخصوص دلچسپ ہیں۔ مثلاً امریکہ سے اطلاع ملی ہے کہ وہاں کے قدیم باشندوں میں اندر ہی اندر ایک عجیب بیداری اور احساس پیدا ہو رہا ہے جو کسی طرح متمدن اقوام سے کم نہیں ہے۔ ابھی حال میں مسٹر ڈوبلیر کے قلم سے ایک تصنیف شایع ہوئی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ کے حبشی باشندوں کے اخبارات و رسائل کی تعداد ۵۰۰ ہے جن میں سے سب سے بڑے اخبار کی اشاعت ۶۰ ہزار روزانہ کے قریب ہے اور ان کے چھوٹے اخبارات بھی مقامی اور جماعتی اصلاح میں مصروف ہیں۔ یہ اخبارات و رسائل متحدہ طور پر حبشی اقوام بھی آزادی کی کوشش کر رہے ہیں اور ایک عظیم الشان سلطنت افریقہ میں قایم کرنے کا خواب دیکھ رہے ہیں۔

ریاست بڑودہ ریاست بڑودہ کی تعلیمی ترقی کا حال اخبارات اور رسائل میں اکثر شائع ہوتا رہتا ہے لیکن اس کی صنعتی ترقی کے متعلق ہمارے ملک میں کافی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا گیا جو موجودہ حالات میں کچھ زیادہ قابل تعجب بھی نہیں۔ سنہ ۱۹۲۰-۲۱ء کی رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ اس ایک سال کی دوران میں ریاست کی طرف سے ۲۴½ لاکھ روپیہ مندرجہ ذیل کارخانہ جات کو بطور امداد دیا گیا۔

(۱) دو سمنٹ بنانے کے کارخانے (۲) ایک پارچہ بافی کا کارخانہ (۳) ایک تیل نکالنے کا کارخانہ۔ اس امداد کے علاوہ آٹھ درخواستیں اور منظور کی گئیں مثلاً (۱) کم قیمت پر بہم رسانی آب (۲) ریلوے لائن کے متصل زمین کی منظوری (۳) کارخانہ کے لئے نئی سڑک کی تعمیر (۴) چار کارخانوں کے لئے قانون حصول اراضی کا نفاذ

رپورٹ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ چھ کارخانے سال ۲۱ء میں جاری ہو گئے حالانکہ

گزشتہ سال ہی دس کارخانے جاری ہو چکے تھے ان دس کارخانوں کی بابت جو سال گزشتہ میں جاری ہوئے تھے محکمہ صنعت و تجارت ظاہر کرتا ہے۔ کہ نو کارخانے خوب ترقی کر رہے ہیں۔ ساتھ ہی چند ناکام کوششوں کا ذکر بھی اس رپورٹ میں ہے مثلاً ٹاٹا کا کارخانہ شکر سازی جس میں کافی نقصان ہوا اور اب اُس میں کچھ کام نہیں ہوتا۔ اسی طرح چینی مٹی کے کارخانے نے کوئی ترقی نہیں کی مکھن بنانے کے متعدد کارخانے قائم کئے گئے مگر اُن میں سے اس وقت صرف چند باقی ہیں۔ کیمیاوی طریقہ سے لکڑی کا تیل نکالنے اور مچھلیوں کو محفوظ کرکے دیگر حصص ملک میں بھیجنے کے لئے بھی یہ محکمہ کوشش کر رہا ہے اور ممکن ہے کہ اگر کامیابی ہو تو یہ دونوں چیزیں بڑودہ کے عظیم الشان ذریعہ تجارت قرار پائیں۔

ہمارے نامہ نگار امید ہے کہ جامعہ کے صفحات میں یورپ کے اکثر تعلیمی مرکزوں کے دلچسپ حالات اور اطلاعات بھی شایع ہوتے رہیں گے اور اس کے متعلق جو خاص انتظامات کئے گئے ہیں اونہیں فی الحال اسی قدر کامیابی ہوئی ہے کہ جرمنی کی دو تازہ ترین تحریریں "مکتوب جرمنی" کے نام سے شایع کی جاتی ہیں۔ جو حالات حاضرہ صنعتی و علمی تعلیم اور اکثر مفید و اہم واقعات پر نہایت ہی معتبر شہادت ہے اگر ہم کو اس مقصد میں کامیابی ہوئی تو امید ہے کہ جامعہ کی یہ خصوصیت ایسا خوشگوار اضافہ ہوگا جو عام طور سے پسند کیا جائے گا۔

مطبوعات جدیدہ ہر ملک کی مطبوعات جدیدہ حکومت کے پاس جاتی ہیں جنکو وہ ایک کتب خانہ میں محفوظ رکھتی ہے اور اس طرح ہر متمدن ملک میں ایک سرکاری کتب خانہ محض اون کتابوں سے طیار ہو جاتا ہے جو ہر سال تقریباً ہزاروں کی تعداد میں اس ملک میں شایع ہوتی رہتی ہیں۔ ہندوستان میں بھی کثیر التعداد کتابیں مختلف زبانوں میں شایع ہوتی رہتی ہیں اور وہ حکومت ہند کو بھیجی بھی جاتی ہیں لیکن ہماری علم دوست گورنمنٹ بجائے ہندوستان میں کتب خانہ قایم کرنے کے اون تمام مطبوعات کو انگلستان بھیجدیتی ہے تاکہ وہ انڈیا آفس اور اہل انگلستان کی دولت علمی میں مزید اضافہ ہو۔ یہ وہ واقعہ ہے جس پر انصاف پسند انگریز بھی افسوس و تعجب کرتے ہیں جیسا کہ سنت نہال سنگھ نے کلکتہ لائبریری کے مہتمم سے شکایت کی۔

سیاسی انقلابات

کا اثر

علوم ایران پر

جسطرح چوٹ سے ٹھنڈے پتھر سے شرارے نکلتے ہیں اسی طرح حوادث کے صدمات سے دماغ کا جوہر کھلتا ہے۔ مختلف اقوام کا اختلاط خواہ وہ فاتح و مفتوح ہی کی حیثیت سے کیوں نہ ہو بوسیدہ دماغوں میں تازگی اور فرسودہ قویٰ میں زندگی بخشتا ہے۔ اسی لئے سیاسی انقلاب ہر ملک اور ہر قوم میں علمی، معاشرتی، تمدنی، مذہبی اور زندگی کے تمام شعبوں میں انقلاب کا باعث رہا ہے۔ یہ ایک واضح حقیقت ہے۔ مگر ایران میں یہ سب سے زیادہ نمایاں نظر آتی ہے۔

ساسانی عہد تک ہم ایرانیوں میں کوئی قابل ذکر آثار علمیہ نہیں پاتے۔ ان کا جوہر قابل انکے دماغوں میں پڑا سوتا ہی رہا یکایک فتح اسلام نے انکے جوہر کو حرکت دیکر بیدار کر دیا۔ انہوں نے عہد اسلام میں وہ ذہنی کارنامے دکھائے جن سے آجتک اکثر لوگوں کو یہ دھوکا ہوتا ہے کہ یہ صدیوں کی مشق دماغی کا نتیجہ ہیں۔ مگر تاریخ اس قیاس کی تائید نہیں کرتی۔ دراصل ایرانی دماغ کی یہ خصوصیت امتیازی ہے کہ خارجی تحریک و اختلاط سے متاثر ہو کر محیر العقول مہیں سر کر لیتا ہے۔

تاریخ ایران میں اس خیال کی تائید میں متعدد نظیریں ملتی ہیں۔ عہد قبل الاسلام کی موہوم و مشتبہ تاریخ سے قطع نظر کر لیں اور اسلام کے بعد سے آج تک کی صرف واضح و محقق تاریخ پر نظر کریں جب بھی یہ حقیقت صاف طور پر منکشف ہو جاتی ہے۔

(۱) عہد فتح اسلام عربوں کی فتح ایران سے عباسیوں کے عروج تک نظاہر ہے کہ اس عہد کی تمام و کمال اسلامی حرکات علمیہ کا سہرا انہیں کے سر رہا۔ اگرچہ ایک غیر زبان (عربی) ان کے افکار علمیہ کا وسیلہ رہی۔ مگر اس بار کے باوجود کوئی شعبہ علم و فن ان کے دسترس سے بچ نہ رہا۔ پروردۂ عجم حکومت عباسیہ کے انحطاط

کے ساتھ عجم کی ماعی جولانیوں میں بھی اختلاط شروع ہو گیا۔ تمام ادبیات ایران میں بالک قصیدہ گوئی اور پھبتی کی گرم بازاری تھی۔ اسی میں موشگافیاں اور نکتہ پردازیاں ہوتی تھیں عربی تصانیف کا بازار ماندہ پڑ گیا۔

۲۔ عہد ایلخانی | سنہ ۶۱۶ھ ۱۲۱۹ء تاخت چنگیزی سے لیکر سنہ ۶۶۴ھ ۱۲۶۵ء ہلاکو کی موت تک تقریباً آدھی صدی کی مدت مغلوں کی شمشیر بے نیام نے بظاہر کوئی تسمہ لگا نہ رکھا سلطنتیں مٹائی گئیں۔ کتب خانے جلائے گئے اہل دول لوٹ لئے گئے۔ علما بے دریغ تہ تیغ ہوئے۔ بایں ہمہ یہ سیلاب انقلاب اترنے کے بعد ویران و بلند افتادہ زمینوں کو جو آبیاری سے محروم تھیں شاداب و سرسبز کر گیا۔ فارسی زبان کی بہترین کتابیں اسی عہد میں تصنیف ہوئیں۔ بغداد سنہ ۱۲۵۸ء میں غارت کیا گیا اور تاریخ طبقات ناصری مولفہ منہاج سراج سنہ ۱۲۶۰ء میں تالیف ہوئی۔ خود ہلاکو خاں کے نمک خوار مورخ عطاملک جوینی نے اسی سال چنگیز خاں کی سیرت و تاریخ خاندانی پر بے نظیر کتاب تاریخ جہاں کشا تمام کی۔ ہلاکو کے چہیتے وزیر و مشیر نصیر الدین طوسی نے بغداد کی لوٹ سے چار لاکھ جلد کتابیں جمع کر کے ان کی مدد سے پروفیسر براؤن کے شمار کے مطابق فلسفہ مذہب، ریاضی، طبیعیات اور ہئیت پر چھپن کتابیں مدون کیں مشہور خطاط یاقوت اسی زمانہ سنہ ۶۶۷ھ ۱۲۶۸ء میں فوت ہوا۔ فارسی میں عروض پر بہترین کتاب المعجم فی معاییر اشعار العجم۔ مولفہ شمس قیس اسی وقت کی تالیف ہے۔ شعرا میں کمال اسمٰعیل، جو سنہ ۱۲۳۷ء میں مغلوں کے ہاتھ سے شہید ہوئے، شیخ فرید الدین عطار جو بقول جامی سنہ ۱۲۲۹ء میں انھیں کی دہشت کا شکار ہوئے مولانا روم اور سب سے بڑا ایرانی شاعر و حکیم شیخ سعدی اسی کشت انقلاب کی پیداوار ہیں۔ صوفیائے کرام میں فضلائے مذکورین کے علاوہ شیخ نجم الدین کبریٰ "ولی تراش" جو انھیں کے ہاتھ سے سنہ ۶۱۸ھ ۱۲۲۱ء میں شہید ہوئے سعد الدین حموی متوفی سنہ ۶۵۰ھ ۱۲۵۲ء نجم الدین دایہ متوفی سنہ ۶۵۴ھ ۱۲۵۶ء شیخ شہاب الدین سہروردی متوفی سنہ ۶۳۲ھ ۱۲۳۵ء اسی دور کی یادگار ہیں۔

(۳) عہد تیموری ۱۳۳۶ء میں ایلخانی مغل خاندان (اولاد ہلاکو) کے آخری فرمانروا ابوسعید کی وفات اور تیمور کی پیدائش سے لیکر ۱۴۰۵ء تیمور کی موت تک ستر سال کا زمانہ طوائف الملوکی، خانہ جنگی، اور سیاسی ابتری سے شروع ہوا اور خونریزیوں اور ستم رانیوں پر تمام ہوا۔ بااین ہمہ تاریخ ایران کا یہ مہیب دور بھی زبان فارسی کے بہترین شعراء اور بلند پایہ مصنفین کے لئے خاص طور پر ممتاز ہے۔ بقول صاحب مطلع السعدین۔

"جہاں پنجاہ سالہ عہد تیموری نے فارسی کے درجن بھر جلیل القدر شعراء پیدا کئے وہاں ۲۴۳ سال کی طویل حکومت صفوی باہمہ جاہ وجلال وطاقت وجبروت چھ شاعر بھی ایسے پیدا نہ کر سکی جن کی شہرت ان کے زاد بوم سے باہر نکلی ہو"! آسمان شعر کے درخشاں ستارے خواجہ حافظ شیرازی، ابن یمین، خواجو کرمانی، سلمان ساوجی عبید زاکانی، کمال خجندی، مغربی تبریزی اسی طوفانی افق میں طلوع ہوئے۔ عربی میں تصنیف کرنیوالے ایرانی علامہ سعدالدین تفتازانی صاحب مطول ومختصر السید الشریف الجرجانی صاحب کبری وصرف میر اور ابوطاہر فیروزآبادی صاحب قاموس بھی اسی دور کے یادگار ہوئے۔

علمی ترقی کی یہ رفتار عجم کو پھر نصیب نہ ہوئی۔ دماغی قوی شکست ہوتے ہوتے معطل سے ہو گئے۔ نقلی شاعری (تغزل) کے سوا کوئی ذہنی حرکت تمیز طور پر نظر نہیں آتی۔ اس حالت کو چھ سے زیادہ صدیاں گذر چکیں۔ انکے علمی کارنامے دفتر پارینہ ہو گئے۔ ان کی شاعری قصہ ماضی بن چکی۔ دنیا ان کی مزید علمی جدوجہد سے مایوس ہو چکی۔ یہاں تک کہ چودھویں صدی

۴۔ چودھویں صدی ہجری کے آغاز میں چند وقت شناس اور صاحب دل محبان وطن نے ایران سے باہر نکل کر اخبار نکالے، رسالے اور کتابیں شائع کیں جن سے اپنے ہم وطنوں کے دلوں کو گرمانے کی کوشش کی۔ ان میں ایک اخبار اختر تھا جو قسطنطنیہ سے نکلتا تھا۔ اور ٹرکی کے پردیسی ایرانیوں کے جوش ملی کے بل پر چلتا تھا۔ اس کے بعد ارمنی اہل قلم نظام الدولہ ملکم خان نے ۱۳۰۸ھ میں لندن سے ایک اخبار قانون نکالا۔ یہاں سے

ایران کے انقلاب جدید کا عہد شروع ہوجاتا ہے ساسی نظام الدولہ اور سید جمال الدین افغانی کی مساعی کی بدولت ایران کے مستبدانہ طرز حکومت کا احساس عام ہوگیا یکم مئی ۱۸۹۶ء کو ناصر الدین سید افغانی کے ایک شاگرد مرزا کرمانی کے ہاتھ سے قتل ہوا نظام الدولہ کے اخبار قانون ہی نے آیندہ انقلاب کے لئے راستہ صاف کردیا۔ اسی کی بدولت ۱۸۹۱ء میں "رعایت تمباکو" کے خلاف شورش کامیاب ہوئی۔ اور یہ کامیابی انقلاب جدید کا پہلا زینہ ثابت ہوئی۔

اس سیاسی کشمکش کے صدقے میں فارسی لٹریچر نے بھی ہاتھ پاؤں نکالے قانون نے ایک جدید سیدھے سادے اور موثر اسلوب بیان کی بنیاد ڈالی جس نے اسے ہر دلعزیز بنادیا۔ جدید اصطلاحات مثلاً قانون تنظیمات (اصلاحات) اصول ادارہ (نظام حکومت) وغیرہ وضع کرکے زبان فارسی میں جاری کردیں۔ جہاں اس نے ایران کی سیاسی بیداری میں سب سے زیادہ حصہ لیا۔ وہاں فارسی زبان کی ملداری میں بھی سب سے زیادہ اعانت کی۔ اس کے بعد ۱۳۱۱ھ میں کلکتہ سے حبل المتین اور قاہرہ سے حکمت جاری ہوا۔ مگر مصر کے ثریا اور پرورش ان سب سے آگے بڑھ گئے۔

ان وطن پرستوں نے اخبار نویسی کے علاوہ کتابیں بھی شائع کیں جن کے اثرات دوگانہ تھے ایک طرف قوم کو سیاسی نیند سے جگا دیا۔ دوسری طرف زبان کو ایک خاص قدرت بخشی۔ ان میں بھی نظام الدولہ

سلہ پروفیسر براؤن صاحب اس سلسلہ میں ہمیں یہ لطیف نکتہ بتلاتے ہیں کہ وطن۔ ملت حریت وغیرہ الفاظ کے موجودہ معانی سے جو پہلے مفقود تھے اول اول عثمانی ترکوں نے مشرق کو روشناس کیا۔ "جوان ترکوں" کے سرآمد شناسی آفندی (متوفی ۱۸۷۱ء) ضیا پاشا (متوفی ۱۸۸۰ء) اور کمال بے (متوفی ۱۸۸۸ء) نے اپنے تمام سیاسی اور ادبی خیالات جدیدہ فرانس سے اخذ کئے۔ کمال بے نے جو مدبر و ماہر سیاست ہونے کے علاوہ شاعر اور ڈراما نویس بھی تھے ان تینوں الفاظ کو جدید مفاہیم کے ساتھ صرف ٹرکی ہی میں نہیں بلکہ تمام ممالک اسلامیہ میں جاری کردیا۔ ظاہر ہے کہ وطن کے اصل معنی مولد کے تھے۔ اب ایک قوم کے مسکن اور اس کے حقوق کے مفہوم پر حاوی ہے لفظ ملت پہلے ہم مذہب جماعت یا دین کے معنی تک محدود تھا اب ایک ہم وطن ہم زبان یا ہم سلطان قوم کے مفہوم میں بولا جاتا ہے۔ اسی طرح لفظ حریت پہلے ذاتی غلامی کا ضد تھا اب قومی آزادی حقوق کے معنی دیتا ہے۔ یہ الفاظ اس قدر مقبول اور شائع ہوئے کہ جنوری ۱۹۱۲ء میں جو محبان وطن تبریز میں دار پر چڑھائے گئے وہ "زندہ باد وطن! زندہ باد وطن!" کا کلمہ رٹتے ہوئے قربان ہوگئے۔

کے سیاسی رسائل قابل ذکر ہیں۔ جو بصورت مسودہ شاہ کے درباریوں، مدبروں اور تمام اکابر کے ہاتھوں سے گذر کر تمام ایران میں عام ہو گئے۔ ان کے ساتھ ہی نظام الدولہ نے حروف تہجی کی اصلاح کے لئے رسائل مسمی بہ تجدد ترقی اور شیخ و وزیر تصنیف کئے۔ اپنے ایجاد کردہ حروف تہجی کی اشاعت ونشر کی غرض سے اس نے انہی حروف میں کئی کتابیں شایع کیں۔ اس عہد کشاکش کی کتابوں میں سیاحت نامہ ابراہیم بیگ خاص طور پر قابل ذکر ہے جس میں ایک ایرانی تاجر آقا زین العابدین مقیم روس نے ایک فرضی سیاح ابراہیم بیگ کی سیاحت ایران کے پیرایہ میں اہل وطن کو عبرت کے تازیانے لگائے ہیں۔ اسے حبل المتین کلکتہ نے شایع کیا اور انقلاب آتیہ کی محرکات میں ایک اہم بالشان تحریک ثابت ہوا۔ اس سلسلہ میں مرجان ماریر کی کتاب حاجی بابا اصفہانی کا ترجمہ فارسی جو ایرانی معاشرت و تمدن کی ہجو ملیح ہے کچھ کم نتیجہ خیز نہ رہا۔ اسی طرح ایک فرانسیسی رسالہ کا ترجمہ سالنامہ ۱۳۱۳ھ کے شائع ہوا اور نصیر الدین شاہ کے حکم سے تلف کر دیا گیا۔

نومبر ۱۹۰۶ء میں اعلان مشروطیت کے بعد کثیر التعداد اخبار مجلس، ندائے وطن، صبح صادق وغیرہ جاری ہوئے۔ ہجو ملیح، پھبتیوں اور ظریفانہ مضامین کے علاوہ خزاں رسیدہ گلستان شاعری میں عجیب وغریب شگوفہ کاریاں اور جدت طرازیاں کی گئیں۔ پرانی بساط سخن الٹ دی گئی اور نئی بساط بچھادی گئی۔ قدیم طرز کی فرسودگی سے اس قدر نفرت ہو گئی کہ تمام شعرائے متقدمین کے قصائد غزلیات کی نظر میں ہیچ در ہیچ نظر آنے لگے۔ شہید حریت مرزا آقا خاں کرمانی نے شاہنامہ کے تتبع میں سالارنامہ نظم کیا۔ اور اسکے دیباچہ میں اپنی جدت طرازیوں کی معذرت میں طرز قدیم کا یوں استخفاف کیا ہے[1]۔

"قدیم شعراء وفصحاء فارسی کی مضمون آفرینی اور ماثر خیزی میں کسی کو کلام نہیں۔ نہ اُن کے کلام کی شوکت وشکوہ میں کوئی شبہ ہے۔ اکثر متاخرین کے شعر کی شوخی اور دل آویزی

[1] صحافت وشاعری ایران جدید از پروفیسر براؤن۔ دیباچہ مترجم صلا

بھی مسلّم ہے۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ ہمارے شعرا اور ادبا کی تصانیف سے کس قسم کے اثر مترتب ہوتے رہتے ہیں اور اُن کے تخم کیسے برگ وبار لائے ہیں؟ اُن کے مبالغہ اور غلو نے قوم کے سادہ دلوں میں باطل کا تخم بو دیا۔ اُن کی مدح سرائی اور چاپلوسی نے سلاطین اور ان کے وزرا کو نشے خود پرستی سے سرشار کرکے انواع واقسام کی بیہودگیوں میں مبتلا رکھا، اُن کے فلسفہ اور تصوف کا نتیجہ صرف یہی نکلا کہ وحشیانہ کاہلی وغفلت عام ہوگئی اور درویشوں اور بھیک منگوں کی تعداد بہت زیادہ ہوگئی۔ اُن کی غزل سرائیوں کا نتیجہ ہمارے نوجوانوں کے اخلاق کی تخریب اور بے حیائی ورندی کی تعلیم کے سوا اور کیا نکلا؟ ان کی ہجووں کا نتیجہ بے غیرتی، بے حیائی اور بیہودہ سرائی کی ترویج کی صورت میں ظاہر ہوا۔

"اگر ہم شعرائے اسلام اور ان کے ممدوحین کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوجائیگا کہ ابو نواس اور اس جیسے دوسرے شعرا کی مدیحہ خوانی ہی نے خلفائے عباسیہ کو مے نوشی، روز خوانی اور دوسری برائیوں میں مبتلا کردیا۔ عنصری، رودکی، فرخی اور ان جیسے اور شعرا کے قصائد ہی نے خاندان سامان وغزنیں کو تباہ وبرباد کیا۔ عراقی اور مغربی جیسے شعرا کے فلسفۂ الہیات ہی نے نکمے، اپاہج، درویش پیدا کردئے۔ انوری ظہیر فاریابی کمال اصفہانی کی خوشامدوں اور چاپلوسیوں ہی نے ایسے ناکارہ، ظالم اور مغرور فرماں روا پیدا کئے۔ سعدی اور ہمام جیسے شعرا کے عاشقانہ اشعار ہی نے جوانان فارس کے اخلاق کا ناس کیا۔ سوزنی سنائی وغیرہ کی ہجووں نے بے حیائی اور جرائم کو اس قدر عام کیا۔ خاقانی جیسے شعرا کی قابلِ نفرت دقت پسندی اور موشگافی ہی نے مرزا مہدی خاں (مورخ نادرشاہ) عطا ملک جوینی (مؤلف تاریخ جہاں کشا) اور صاحب وصاف حضرت کو بے معنی لفاظی اور لغو سخن بافی کا مرتکب کیا۔ صبا کی خود ستائی، شہاب کی موشگافی اور قاآنی کی کلاہ بلی وعلی تعلی (قوافی قصیدہ مدح) نے آج ایرانی شرفا کے دلوں سے نیکی کی رغبت اور بدی کی نفرت دھو کر انھیں بے شمار گناہوں اور ضلالتوں میں غرق کررکھا ہے۔

"شاعری کا صحیح مصرف اور جائز اثر یہ ہی کہ سامعین کے دلوں کو متہیج کر کے اُن کے جذبات رحم کو حرکت دے۔ اُن کے خیالات میں ذکاوت پیدا کرے۔ ساتھ ہی ان کو نیکی پرہیزگاری اور اعتدال کی طرف مائل کرے، نہ کہ بیہودگی، بدکاری اور غارت کی طرف"۔

اس میں شک نہیں کہ مرزا آقا خاں کا تمام شعرا فارسی کو ایک لاٹھی سے ہانک دینا صحیح مبالغہ اور انصاف کا خون کرنا ہی۔ ان میں سے دو ایک ایسے بھی گزرے ہیں جنھوں نے اپنے کلام سے قوم اور ملک کے اخلاق سدھارنے کی کوشش کی ہی۔ شیخ سعدی کی ہزلیات کی نسبت جو چاہیں کہہ لیں۔ مگر گلستاں بوستاں کے فیض سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی۔ بایں ہمہ مرزا کی نکتہ چینی من حیث المجموع کلہ حق ہے۔

پروفیسر براون صاحب نے اپنی متذکرہ بالا کتاب میں فارسی زبان میں "تمنائے مخصوص از قارئین کرام" کے عنوان سے ایک تمہید لکھی ہے۔ جس میں ایران کی جدید شاعری کی خصوصیات امتیازی پر عالمانہ رائے زنی فرمائی ہی۔ یہاں ہم ان کی خاص عبارت فارسی کا اقتباس ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں تاکہ وہ پروفیسر موصوف کی قدرت زبان فارسی کی داد بھی دے سکیں۔

" اگر درست دقت کنیم خواہیم دید کہ این اشعار جدیدہ دارای دو صفت ممتازہ است کہ در ادبیات قدیمہ موجودہ نبودہ و بہمان نسبت شاید تاثیر آتش در طبقۂ عامہ بیشتر باشد۔

اولاً از حیث موضوع۔ موضوع اشعار قدما تقریباً عبارت بود از مدائح پادشاہان و بزرگان و غزلیات و اخلاق و فلسفہ و تصوف۔ وانچہ راجع باوضاع و احوال معاشیہ بر رشتۂ نظم کشیدہ بود نسبۃً کم است۔ اگرچہ ہمین ادبیات مدار افتخار ابدی ایران بودہ و زبان فارسی با آنہمہ شکوہ داشتہ است۔ و لیکن از جہت تاثیر خارجی در اوضاع اجتماعی مردم گویا چندان ثمر نبودہ است۔ زیراکہ دلکشی آنہا آن محدود و تقریباً منحصر بطبقۂ عالیہ و عالمۂ ملت بودہ و فائدۂ تعمیم نداشتہ است۔

"تجارب تاریخی وجریان اوضاع اجتماعی ملل دریں قرون اخیرہ بخوبی نشاں میدہد
کہ موثر حقیقی در گردانیدنِ چرخ حیاتِ اجتماعیِ یک ملتِ عامہ یعنی طبقات او اسطہ و ادانی
آں ملت است۔ وچنانکہ امواجے کہ روئے دریا را بتلاطم آوردہ و بزرگ ترین کشتیہا
را بازیچۂ طوفان خود می سازد۔ ہمانا امواجے است کہ از قعر دریا و از طبقات پائین آں با
مے آید۔ ہمیں طور است در انقلابات سیاسی۔ انقلابے کہ ثمرہ خوب میدہد انقلابیت
کہ در سایہ جنبش طبقۂ عامۂ ملت بظہور رسد، والا انقلابے خواہد بود نارس و نابہنگام و سطحی
کہ مانند امواجِ سطحیِ دریا ہرگز آں قوت را نخواہد داشت کہ بنائے استبداد و خرافات متراکم
چندیں قرن را از بیخ براندازد۔ ازیں رو طبقۂ عامۂ ملت بیشتر از طبقات دیگر باید منظور نظر
ارباب سخن و واعظین و مخصوصاً شعرا و ادبا باشند .... وما
مے بینیم کہ ادبا و شعراء عصر حاضر پے بدیں نکتہ بردہ اند یعنی ابکار معانی را ازاں دائرہ محدود
بیروں آوردہ و خوان الوان نظم را بیش خاص و عام گستردہ طبقۂ عامہ را ازاں برخوردار
کردہ اند۔ و اغلب موضوعات ایں ادبیات را از وقائع یومیہ و راجع بمسائل معاشی و اجتماعی
گرفتہ اند کہ ہر یک از افراد ملت مے تواند بدوں صعوبت درک نماید۔
"ثانیاً از حیث اسلوب نیز ایں ادبیات جدیدہ یک تازگی و اہمیت مخصوصے دارد و
آں این است کہ در اغلب اشعاریکہ دریں دور جدیدہ سرودہ اند حقیقت را باداے اینکہ
ہمہ کس بتواند فہم نماید در لباس ہزل و مزاح جلوہ دادہ اند و یا یکے از پردہ ہاے موسیقی
ہم آہنگ ساختہ اند تا باسانی قبول عامہ بہم رساند۔
"بدیہی ست کہ شخص ہر قدر دارائے اخلاق حمیدہ و تہذیب نفس باشد باز وسے را شنیدن
عیوب خود بے پردہ چنداں خوش آیند نخواہد بود و حقیقت گوئی در وے تاثیرے چنداں نخواہد
کرد۔ ولے در شکل ہزل و مزاح آں را بمیل و رغبت خواہد خواند و البتہ بے تاثیر ہم
نخواہد ماند............"

نمونہ پروفیسر موصوف نے اپنی تصنیف متذکرہ بالا میں عہد مشروطہ کے جواہرات شاعری کا جو نمونہ جمع کیا ہے۔ اس میں سے ہم مختصر اقتباس ہدیۂ ناظرین کر کے دکھانا چاہتے ہیں کہ ایران کے اس سیاسی انقلاب نے اصلی شاعری پر کیا اثر ڈالا جس سے ہم اہل ہند بے خبر ہیں۔ اردو شاعری فارسی شاعری کی پیرو ہونے کی حیثیت سے اسی نئی شاہ راہ میں بھی اس کے نقش قدم پر چلنے کی بجائے اب تک باستثنائے قلیل پرانی لکیر پیٹے جاتی ہے۔ امید ہے کہ ہمارے شعراء خصوصیت کے ساتھ توجہ فرمائیں گے۔

بعض ترکمانی جو روسی رعایا تھے روسی ایرانی سرحد قاچان (واقع خراسان) سے آصف الدولہ کی چشم پوشی سے کچھ نوجوان لڑکیوں کو پکڑ لے گئے۔ اخبار صور اسرافیل نے جون ۱۹۰۷ء کی اشاعت میں طفلس کے ایک ہوٹل میں روسیوں اور ترکمانیوں کے حضور ان بیکس قاچانی لڑکیوں کے ناچ اور نغمۂ ہم آہنگ کا یوں فرضی نقشہ کھینچا ہے۔ کس قدر مؤثر طرز ہے!

(ایک لڑکی)	(سب ملکر)
بزرگان جملگی مستِ غرورند	خدا کسے فکر ما نیست
زانصاف و مروت سخت دورند	خدا کسے فکر ما نیست
رعیت بے سواد و گنگ و کورند	خدا کسے فکر ما نیست
ہفدہ و ہژدہ و نوزدہ و بیست	اے خدا کسے فکر ما نیست
فلک دیدی بما آخر چہا کرد	خدا کسے فکر ما نیست
زخویش و اقربا ما را جدا کرد	خدا کسے فکر ما نیست
جفا بیند کہ با ما این جفا کرد	خدا کسے فکر ما نیست
ہفدہ و ہژدہ و نوزدہ و بیست	اے خدا کسے فکر ما نیست
نسیم بوم ما بس جاں فزا بود	خدا کسے فکر ما نیست

هوایش روح بخش و غم زدا بود — خدا کسے فکر ما نیست
وے در داکہ ہجرش در قضا بود — خدا کسے فکر ما نیست
ہفدہ و ہژدہ و نوزدہ و بیست — اے خدا کسے فکر ما نیست
مگر مردان ما را خواب بردہ — خدا کسے فکر ما نیست
غیوران وطن را آب[1] بردہ — خدا کسے فکر ما نیست
کہ اغیار آب از احباب بردہ — خدا کسے فکر ما نیست
ہفدہ و ہژدہ و نوزدہ و بیست — اے خدا کسے فکر ما نیست
کہ خواہد بردتا مجلس پیامم — خدا کسے فکر ما نیست
کہ اے دل بردہ نا دادہ کامم — خدا کسے فکر ما نیست
چرا شد محو از یادِ تو نامم — خدا کسے فکر ما نیست
ہفدہ و ہژدہ و نوزدہ و بیست — اے خدا کسے فکر ما نیست

روسی اور ترکمانی تماشائی اپنی اپنی زبانوں میں "زندہ باد حسینان فارس" ۔ "زندہ باد آصف الدولہ" ۔ "زندہ باد وزارت ایران" کے نعرے بلند کرتے ہیں ۔

ذیل کی نظم مجتہد شیخ فضل اللہ مخالف مشروطیت کی غداری و ملک فروشی صدائے نیلام کے طرز میں اخبار نسیم شمال مورخہ ۱۲ر جولائی ۱۹۰۹ء میں شائع ہوئی ۔

حاجی ! بازار رواج[2] ست رواج — کہ خریدار ؟ ہراج[3] ست ہراج
من فروشم ہمہ ایراں را — عرض ناموس مسلماناں را
رشت و قزوین و قم و کاشاں را — بخریداین وطن ارزاں را
یزد و خوانسار ہراج است ہراج — کہ خریدار ؟ ہراج است ہراج

---

[1] غیرت و حرمت [2] گرم [3] نیلام

بلبل و شیپور علم را کے میخا[1]د؟ — شیر و خورشید[2] رقم را کے میخاد
تخت جمشید عجم را کے میخاد؟ — تاج کے مسند جم را کے میخاد
اسپ و افسار ہراج است ہراج — کو خریدار؟ ہراج است ہراج

میدہم تخت کیاں را بگرو — مے زنم مسند جم را بہ علو
میکشم قاب خورش را بہ چلو[5] — مےخورم قیمہ[4] پلو قرمہ چلو
رشتۂ خوش[3] ہراج است ہراج — کو خریدار؟ ہراج است ہراج

گر ز اسلام بشد قطع اثر — دربپا گشت بجیلاں محشر
در تبریز ارش[6] کرد مقر — ہر چہ پشد شد بجہنم بسقر
فوج افشار ہراج است ہراج — کو خریدار؟ ہراج است ہراج

جد مرحوم شہ از ہمہ وداد — ہفدہ شہر ز قفقاز بہ داد
آنچہ از مال پدر ماندہ زیاد — میفروشد ہمہ را باد اباد
ہمہ یکبار ہراج ست ہراج — کو خریدار؟ ہراج است ہراج

ذیل کی نظم محمد علی شاہ کے عزل اور اس کے چھوٹے فرزند سلطان احمد شاہ کی تخت نشینی کے موقع پر نسیم شمال مورخہ یکم اگست ۱۹۰۹ء میں شائع ہوئی چند شعر ہدیہ ناظرین ہیں شاہِ نو سے خطاب ہے۔

اے شہنشاہ جواں شیراں جنگ آور نگر، درنگر، عالمے دیگر نگر
ملتے را راحت از مشروطہ سرتا سر نگر، درنگر عالمے دیگر نگر
در معارف دشمنان علم را نابود کن، بود کن جہل را مفقود کن
وقت تنگ و رخش لنگ و بختی مضطر نگر، درنگر عالمے دیگر نگر

---

[1] میخواہد [2] نشان قومی ایران [3] آتگے [4] پلاؤ [5] چلاؤ [6] روس

پارلماں را ز وکیلاں صحیح آباد کن، داد کن[1]، ملتے را شاد کن
خائنیں را زود کن اخراج، برمعصنہ نگر دزنگر، عالمے دیگر نگر

مدتے با شیخ[1] رفتی، با حریفاں ساختی، تاختی، دیدی آخر باختی
حال و روز بعد از نیت را ازیں بد تر نگر، دزنگر، عالمے دیگر نگر

سینہ کوباں شیخنا گوید بزاری درملو، کوچلو لخ چہ شد خرما پلو
کو فسنجن کو متنجن، جائے شربت تر نگر، دزنگر، عالمے دیگر نگر

ملک الشعرا بہار مشہدی کی مندرجہ ذیل نظم جو قیام مشروطیت کا نغمہ شادی ہے اخبار ایران نو مورخہ ۲۴ اگست ۱۹۰۹ء میں شائع ہوئی۔ چند شعر نقل کئے جاتے ہیں۔

سے دہ کہ سطے شد دوراں جان کاہ — آسودہ شد ملک الملک للہ
شد شاہ نور اقبال ہمراہ — کوس شہی کوفت بر رغم بدخواہ
شد صبح طالع طے شد شبانگاہ — الحمد للہ، الحمد للہ

پس مستبدین سختے جہیدند — گفتند سختے، سختے شنیدند
ناگہ ز ہر سو شیران رسیدند — آں روبہاں باز دم درکشیدند
شد طعمہ شیر، مکار روباہ — الحمد للہ الحمد للہ

بخت سپہدار، فرخندہ بادا! — سردار اسعد پائندہ بادا!
صمصام ایمان برندہ بادا! — ضرغام دیں را دل زندہ بادا!
کافتاد از ایشاں بدخواہ درچاہ — الحمد للہ الحمد للہ

ذیل کی نظم بھی ایران نو مورخہ ۱۲ فروری ۱۹۱۰ء میں "لاہوتی کرمان شاہی" کے نام سے لوری کے طرز میں شائع ہوئی کس قدر دلپذیر اور موثر اسلوب ہے۔

---

[1] مجتہد شیخ فضل اللہ ذکی الصدر مخالف انقلاب تھا کہ حریت کہ سپہسالار لشکر تھت۔ سردار اسعد بختیاری اور ضرغام السلطنت بختیاری فاتح حریت جولائی ۱۹۰۹ کے سربراوردہ ہیرو تھے۔

لام لائے لائے لائے وہ صدا ہے جو بچوں کو تھپکیوں کے ساتھ دی جاتی ہے۔

آمد سحر و نسیم کار است بالام لائے	خواب تو دگر باعث عار است بالام لائے
لائے لائے بالا، لائے لائے	لائے لائے بالا، لائے لائے
جنگ است کہ مردم ہمہ در کار و تو در خواب	اقبال وطن بستہ بکار است بالام لائے
برخیز و سوئے مدرسہ بشتاب	لائے لائے بالا، لائے لائے
خاک تن آبائے تو باخون شہیداں	برگرد تو زاں خاک حصار است بالام لائے
گردید غمیں مادر ایراں	لائے لائے بالا، لائے لائے
تو کودک ایرانی و ایران وطن تست	جاں را تن بے عیب بکار است بالام لائے
تو جانی و ایراں چو تن تست	لائے لائے بالا، لائے لائے
برخیز ملخو رو تو در حفظ وطن کوش	اے تازہ گل ایراں نہ بہار است بالام لائے
پس جامۂ عزت بہ بدن پوش	لائے لائے بالا، لائے لائے
جائے تو نہ گہوارہ بود، جائے تو زین است	اے شیر پسر وقت شکار است بالام لائے
برخیز کہ دشمن بکمیں است	لائے لائے بالا لائے لائے
مگذار وطن قسمت اغیار بگردد	با آنکہ وطن را چو تو یار است بالام لائے
ناموس وطن خوار بگردد	لائے لائے بالا، لائے لائے

مندرجۂ ذیل نظم نسیم شمال بابت دسمبر ۱۹۱۱ء میں "تو تو لیقو" (مرغ کی بانگ ککڑوں کوں) کے عنواں سے شائع ہوئی۔ منتخب بند نقل کئے جاتے ہیں۔

بیخو اند خروسے بشبستاں۔ تو تو لیقو	میگفت کہ اے فرقۂ مستاں۔ تو تو لیقو
کو بہمن و کورستم و ستاں۔ تو تو لیقو	آوخ[1] کہ خزاں زد بگلستاں۔ تو تو لیقو

---

[1] افسوس

فریاد ز سرمائے زمستاں ۔ تو تو لیقو

خوں گریہ کند مزرعہ بر حال دہاتی | سوز د جگر سنگ بہ احوال دہاتی
عریاں و برہنہ ہمہ اطفال دہاتی | اے وائے ز بدبختیِ دہقاں ۔ تو تو لیقو

فریاد ز سرمائے زمستاں ۔ تو تو لیقو

اُف باد بایں زندگی و طالع منحوس | تُف باد بایں غیرت و ایں دفتر معکوس
افسوس کہ تبریز شدہ دستخوش روس | قزوین شدہ جولانگہ روساں ۔ تو تو لیقو

فریاد کشیدند خرد ساں ۔ تو تو لیقو !

کو بلخ و بخارا و چہ شد خیوہ و کابل | کو ہند و سمرقند و چہ شد بابل و زابل
کو نقطۂ قفقاز و چہ شد آں چمن گل | ایں بحر خزر بود ز ایراں ۔ تو تو لیقو !

فریاد ز سرمائے زمستاں ۔ تو تو لیقو

ہیہات بجز و شید کہ بازاول کار است | شیرانہ بکوشید کہ ہنگام شکار است
مردانہ بکوشید کہ دشمن بکنار است | زیر لگد افتادہ خروساں ۔ تو تو لیقو

کافر بجا خاکِ مسلماں ۔ تو تو لیقو

یہ عامیانہ طرزِ سخن ہمارے پنج اخباروں نے کم و بیش برتا ہے مگر وہ اکثر حدِ متانت سے
س قدر دور جا پڑے ہیں کہ طبقۂ خواص میں قبولیت حاصل نہ کر سکے ۔ تازہ ایرانی طرزِ شاعری
ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ طبقۂ عوام الناس کو متاثر کرنے کے لئے جہاں عامیانہ اصناف
اسالیب اور ظریفانہ لہجہ کی ضرورت ہے وہاں یہ لحاظ بھی ضروری ہے کہ کلام حدِ متانت سے
ل کر قعرِ سفاہت و دناءت میں نہ جا پڑے ۔ ورنہ اصل مقصود فوت ہو جائے گا ۔

محمد مسلم ۔ ایم اے
ایم ۔ او ۔ ایل

سیاست بین الاقوامی

علم الانسان کے مطالعہ کرنے والے پر یہ حقیقت ہرگز پوشیدہ نہیں کہ جماعات واقوام عالم کی ترتیب اُن کے مخصوص اوصاف وخصائل مماثلت اخلاق وجذبات تعلقات نسلی شراکت لسانی واعتقادی غرض کہ زندگی کا ہر شعبہ دیگر مادی اشیاء کی طرح تغیرات خارجی سے اثر پذیر ہوتا ہے۔

ارتقائے انسانی کی کڑیوں کو بغور دیکھنے سے صاف طور پر معلوم ہوجاتا ہے کہ انسان خارجی اثرات کا بندہ ہے۔ ایک سطحی نظر کو اس کی طبیعت میں تلون معلوم ہوگا۔ نہیں۔ یہ تلون نہیں بلکہ یہ حالت اس امر کی بدیہی دلیل ہے کہ وہ گردوپیش کے حالات سے بیزاری ظاہر کرتا ہے اور ہمیشہ ایک مقصد کے درپے رہتا ہے جس کا سلسلہ اسی طرح غیر مختتم و نا متناہی رہے گا۔ انسان سے میری مراد انسان کی ہیئت اجتماعیہ ہے۔ چونکہ قومیں بھی منزل ارتقا پر اسی طرح غیر محسوس وغیر مرئی طریقہ سے گام زن ہوتی ہیں جس طرح فرد اپنی منزل حیات کی مختلف حالتوں سے گذرتا ہے۔

اس مختصر تمہید سے میرا مطلب یہ ظاہر کرنا ہے کہ انسان کی طرح اقوام وملل کے لئے بھی یہ امر بالکل طبعی ہے کہ ہمیشہ ایک مقصد کے حصول کے لئے سرگرم کار رہتی ہیں اور تبدیلی وانقلاب کی آرزو ہمیشہ ان کے سینہ میں بھی جزن رہتی ہے۔ چنانچہ یہی نیرنگیاں اور انقلابات نظام تمدن کے جزو لاینفک کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ قوانین حیات اجتماعی کے ہر شعبہ پر عمل پیرا ہیں۔ نظام مدنی کے سیاسی پہلو کو لیجئے۔ ازمنہ سابقہ میں یونانیوں کا سیاسی مقصد اور حد نظر "امارت بلدی" کے حصول کے بغیر اور کسی ذریعہ سے حاصل نہیں ہوسکتا تھا۔ ارسطو اپنی مشہور کتاب "سیاسیات" میں لکھتا ہے کہ حکومت کا اصل منشاء رعایا کو اطمینان وامن کی زندگی بسر کرنے کا موقعہ دینا اور اپنے فرائض انصاف

اور دیانت داری سے انجام دینا ہے۔ اور یہ فرائض بصورت احسن اسی حالت میں انجام دیئے جا سکتے ہیں جب حاکم و محکوم میں بالواسطہ تعلق ہو یعنی رعایا کا ہر فرد با آسانی اپنے حقوق کی نگہداشت کرا سکے۔ وہ اپنی ہمسایہ قوموں کی حالت پر افسوس کرتا ہے اور ایران کی سلطنت کی طرف اشارۃً کہتا ہے کہ جس مملکت کا رقبہ اس قدر وسیع اور آبادی اس قدر زائد ہو وہاں رعایا کی داد خواہی اس کی دانست میں ایک امر محال ہے۔ اس کا خیال بالکل درست تھا کیونکہ اس کے زمانہ تک دنیا میں طریق نمایندگی و نیابت کا انکشاف نہوا تھا اور حکومتوں کے دستور اساسی میں یہ طریق رائج نہ تھا۔

یونانیوں کی "امارت بلدی" بہت عرصہ تک قائم نہ رہ سکی، تمام دنیا میں بڑے بڑے رقبوں اور آبادیوں کی حکومتیں قائم ہوگئیں۔ فرماں روا مطلق العنان ہوتے تھے تا آنکہ اسلام کا ظہور ہوا۔ اسلام نے اپنے سیاسی و عمرانی معاملات میں مجلس شوریٰ پر بہت زور دیا، لیکن جب مسلمانوں کی حکومت کی توسیع ہوئی تو اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار باقی نہ رہا بجز اس کے کہ ایک حکمراں جو مطلق العنان ہو جس کا اقتدار تمام عالم اسلامی تسلیم کرے وہ اس شیرازہ کی حفاظت کرے اور اس کو انتشار سے بچائے۔ چنانچہ امیر ابن معاویہ نے یہی کیا۔ طریق نیابت اس زمانہ میں بالکل ناممکن تھا ممالک کی وسعت ذرائع آمد و رفت کا فقدان ایسے اسباب تھے جنھوں نے لوگوں کے دماغوں میں اس خیال کو آنے تک نہ دیا۔

انھیں حالات کے بعد جب یورپ اپنے خواب غفلت سے ہوشیار ہوا، برق و بخار کی ایجاد نے ذرائع آمد و رفت میں آسانی پیدا کی، حکمرانوں کی دراز دستیوں نے لوگوں میں اپنے حقوق کا احساس پیدا کیا اور انتظام ملکی میں ان کو بھی اپنی شرکت کا خیال پیدا ہوا غرض کہ ان چند در چند اسباب سے سترھویں صدی عیسوی میں انگلستان میں طریق نیابت کی ابتدا ہوئی۔ اب "قومی حکومت" کا زمانہ شروع ہوا جو اب تک جاری ہے "قومی حکومت"

کے استحکام میں دنیا کے لئے امن و راحت کا پیام تھا۔ اشتراک زبان، اشتراک وطن اور اشتراک اغراض اقتصادی "قومی حکومت" کے لئے ضروری قرار دئے گئے۔ محکوموں نے بھی آزادی کی جد و جہد شروع کر دی کیونکہ ان کے اور ان کے حکومت کرنے والوں کے اغراض و مقاصد میں قطعی تضاد تھا۔ اس منتہائے نظر یعنی "قومی حکومت" کی خاطر تمام دنیا میں ایک کشمکش برپا ہو گئی۔ جن آزاد ملکوں کو "قومی حکومت" کی نعمت عظمیٰ حاصل تھی ان کو بھی امن نصیب نہیں ہوا۔ اور یہ بے چینی موجودہ جارحانہ وطن پرستی کا نتیجہ تھی۔ اغراض و مقاصد کے تصادم نے اب نہایت ہی ہولناک شکل اختیار کر لی۔ یعنی جس حرکت میں انگلستان کا مفاد پنہاں ہے وہ یقیناً فرانس کے لئے مضرت رساں ہے، ایک ملک کی اقتصادی ترقی اس کے ہم معنی ہے کہ ہمسایہ قوم تباہ و برباد ہو، تجارت کی گرم بازاری کے لئے لازم قرار پایا کہ ان ممالک کو جو صنعتی ترقی کے میدان میں اپنے دوسرے معاصرین کے دوش بدوش نہیں ہیں اور جن ممالک نے اس منزل میں ابھی قدم ہی رکھا ہے اُن کو بھی "تجارتی مقابلہ" کے آلہ کے ذریعہ سے نقصان پہونچایا جاتے اور ہمیشہ کے لئے ان کے حوصلے پست کر دئے جاویں۔ اس کو "تجارتی یا جارحانہ قوم پرستی" کہا جاتا ہے۔

یہ خیال کہ تمام دنیا ایک ہی حکمراں کے زیر نگیں ہو اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ خود تاریخ انسانی۔ مذکورہ بالا حالات نے اس خیال میں از سر نو زندگی پیدا کر دی۔ قدرۃً لوگوں کا رجحان اس طرف ہونے لگا کہ دنیا میں ایسی متحدہ طاقت قائم کی جائے جو کمزور اور غیر ترقی یافتہ اقوام کے حقوق خود اختیاری کو محفوظ و مامون رکھ سکے۔

واقعات ماحول کے موثرات کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اٹھارویں صدی عیسوی میں مختلف انکشافات کا ہونا برق و بخار کی ایجاد، تجارت کی گرم بازاری مختلف ممالک کے مختلف اللون اور اور مختلف اللسان باشندوں کا آپس میں خلط ملط ہونا ساتھ ہی ذرائع آمد و رفت کی سہولت مدنی زندگی کے مختلف شعبوں میں گوناگوں تصادم

اغراض واقع ہونا' ان سب اسباب نے بین الاقوامی قوانین کی تدوین کی طرف توجہ منعطف کرائی۔ اس زمانہ میں یورپ کے بحر سیاست میں جو بلا کی طوفان خیزی ہوئی اور متعدد جنگوں کا یکے بعد دیگرے یورپ کو سامنا کرنا پڑا ان واقعات نے حکما و فلاسفہ یورپ کے ذہن میں یہ خیال اور بھی راسخ کر دیا کہ آپس میں اطمینان و عافیت سے زندگی بسر کرنے کے لئے ایک ایسے دستور اساسی کی ضرورت ہے جس کو تمام قومیں تسلیم کر سکیں۔

ہالینڈ کے مشہور مقنن گروٹیس نے قوانین بین الاقوامی کے اصول اساسی منضبط کئے۔ ان اصول کے مبادیات ہی میں یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ دنیا کی تمام حکومتیں ایک مستقل آزاد حیثیت رکھتی ہیں' سیاست ملکی میں ہر حکومت کو اختیار کلی حاصل ہوگا کہ اپنی قومی روایت کے مطابق جس طرح چاہے حکومت کرے۔ سیاست بین الاقوامی کے لحاظ سے مفاد عام کی خاطر اپنا ذاتی فائدہ قربان کر دینا پڑے گا۔ اور اس میں تمام وہ امور داخل کئے جاوینگے جن کا بالواسطہ تعلق تمام ممالک کے اغراض سے ہے مثلاً اسلحہ یا سامان جنگ کی تعیین حدبندی قیام امن' استیصال جنگ وغیرہ۔

ان قواعد وضوابط کو قوانین کہنا حقیقت کے سراسر خلاف ہوگا۔ قوانین سے کسی حکومت کے وہ احکام مراد ہیں جن کے تسلیم کرانے کے واسطے حکومت اپنی قوت مادی بھی استعمال کر سکے۔ اگر ان اصول وضوابط کو قوانین کہا جاے تو اس سے مراد یہ ہوگی کہ ان کی عدم تعمیل کے موقعہ پر ان کے تسلیم کرانے کے لئے ایک قوت موجود ہے حالانکہ جب سے تعلقات بین الاقوامی کے استحکام کا غلغلہ بلند کیا گیا ہے اب تک ان قوانین کے تسلیم کرانے کی غرض واحد کے لئے ہر کسی مستقل مادی طاقت کا انتظام نہیں کیا گیا ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جن حکما و فلاسفہ کے دماغ میں پہلے ایسے قوانین وضع کئے جانے کے خیالات پیدا ہوئے ان کا معہود ذہنی دنیا کی تمام قومیں اور حکومتیں تھیں نہ صرف یورپ کی متمدن اور ترقی یافتہ قومیں۔ چنانچہ انیسویں صدی عیسوی کے اواخر میں

ہم دیکھتے ہیں کہ ایک عدالت بین الاقوامی قائم کی گئی جس میں وہی اقوام شریک ہوئیں جو فاتح اور دیگر ممالک کی غاصب تھیں۔ یعنی ایک جماعت قائم کی گئی جس کا مقصد یہ تھا کہ غیر ترقی یافتہ ممالک کے بانٹنے اور تقسیم کرنے میں آپس کے تصادم کے خطرہ کو ہمیشہ کیلئے مٹا دیا جائے۔

اٹھارویں صدی عیسوی سے قبل پا پائے روم یورپ کی حکومتوں کے معمولی تنازعات کا فیصلہ کیا کرتے تھے، لیکن انیسویں صدی میں یورپین اقوام کے تعلقات کی پیچیدگی کی وجہ سے ایک ایسی عدالت کے قیام کی ضرورت محسوس ہونے لگی جو ان معاملات میں غیر جانبدار فیصلہ دے سکے۔ چنانچہ مقام ہیگ میں ایک عدالت قائم کی گئی۔ اسی باب میں مختلف حکومتوں کے مابین متعدد عہد نامے ہوئے کہ اپنے آپس کے تنازعات کو اس عدالت کے فیصلہ پر چھوڑ دینا چاہئے ۱۹۰۸ء میں امریکہ نے دنیا کی چوبیس حکومتوں سے اسی باب میں معاہدہ کیا ہے کہ وہ معاملات جو حکمت عملی کے ذریعہ طے ہو سکیں گے اس بین الاقوامی عدالت کے سپرد کئے جاویں گے برطانیہ فرانس جرمنی اٹلی وغیرہ کے نمایندوں نے اس معاہدہ پر دستخط ثبت کئے ہیں۔ اس عہد نامہ کی وقعت جو اقوام یورپ کی نظر میں تھی گذشتہ جنگ عظیم نے بخوبی ظاہر کر دی۔ اس عہد نامہ کی ایک شرط خاص طور پر قابل لحاظ ہے کہ وہ اہم معاملات جن کا بالواسطہ تعلق فریقین میں سے کسی کی ملکی آزادی، قومی عزت، اور خودداری و وقار سے ہوگا اس عدالت بین الاقوامی کے پاس فیصلہ کی غرض سے نہیں بھیجے جا سکتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عدالت کا وجود و عدم تقریباً برابر ہوگیا۔ ہر حکومت کو اختیار کلی باقی رہا کہ جس معاملہ کو چاہے جتنی اہمیت دے۔ یعنی جنگ کے سدباب کے لئے یہ عدالت بھی قاصر رہی چونکہ اس کے پاس اپنے فیصلہ کو تسلیم کرانے والی کوئی قوت نہ تھی

جنگ عظیم شروع ہونے سے قبل سیاسیات بین الاقوامی کی یہ کیفیت تھی۔ دوران جنگ میں اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ یہ جنگ گویا نفس جنگ کا ہی خاتمہ کن ثابت ہوگی۔ لیکن اختتام جنگ پر ان تمام فلسفیانہ اور خوش اعتقادانہ امیدوں پر پانی پھر گیا۔ اور یہ معلوم ہوا کہ یہ جنگ اس سے بھی زیادہ ہولناک اور مہیب جنگوں کا پیش خیمہ ہے۔ یقیناً اس خیال کی صحت

کلام نہیں ہے لیکن ان فرضی خطروں کی وجہ سے نہیں بلکہ اس ذریعہ سے اپنے مقاصد
سریع الحصول بنانے کی خاطر اتحادیوں کے نمایندوں نے ۲۸۔اپریل ۱۹۱۹ء میں ایک
معاہدہ کیا جس کی غرض و غایت دنیا میں امن و امان قائم کرنا تھی۔ اس طرح لیگ اقوام کی
بنیاد پڑی۔ لیگ کی خاص کارکن جماعتیں چار ہیں۔

(۱) مجلس۔ جس کے ممبر تمام ممبران لیگ ہونگے۔

(۲) کونسل۔ جس میں صرف اتحادیوں کے ممبر شامل ہوسکیں گے۔ اس جماعت کی
خاص ذمہ داری یہ ہوگی کہ ان معاملات کی تفتیش وتحقیق کرے جن کا تعلق اس کی بہ ندار
میں سیاست بین الاقوامی سے ہے۔

(۳) سکریٹریٹ۔ جو اسٹاف اور ایک معتمد عام پر مشتمل ہوگی۔ معتمد عام کونسل کی کثرت
آراء سے منتخب کیا جاویگا۔

(۴) عدالت بین الاقوامی۔ یہ ان معاملات پر غور کرے گی جو کونسل اس کے پاس
اظہار رائے کی غرض سے بھیجے اور تنازعات پر فیصلہ بھی صادر کریگی۔

لیگ کا صدر مقام جنیوا ہوگا۔ اگرچہ اس لیگ کے معاہدہ کے مبادیات میں یہ ظاہر کردیا
گیا ہے کہ قیام امن استیصال جنگ، اور غیر ترقی یافتہ ممالک کی مدافعت اس لیگ کے مقاصد
اولین ہیں۔ لیکن ایسی دفعات بھی ہیں جن کی وجہ سے لیگ طاقتور قوموں کے ہاتھ میں اپنے
غلبہ وتسلط کی پالیسی اختیار کرنے کے لئے ایک زبردست آلہ بنگئی ہو۔ چند ایسی دفعات ذیل میں
پیش کی جاتی ہیں (۱) لیگ کو ممبران میں سے کسی حکومت کو فرمانروائی تفویض کرنیکا اختیار ہوگا
جب تک وہ ملک جس کو فرمانروائی تفویض کی گئی ہے اپنی ذمہ دار حکومت قائم کرنے کی
اہل ہو جائے' اس ممبر لیگ کو چاہئے کہ نظام تمدن کے اصول پر اس ملک کے لوگوں کو
کاربند کرائے۔ (۲) اگر ممبران لیگ میں سے کسی میں تعلقات کی کشیدگی پیدا ہونے کا خطرہ
ہو تو حتی المقدور لیگ مفاہمت باہمی کی کوشش کرے گی، لیکن کسی معاملہ میں ہاتھ ڈالنے سے

قبل مجلس و کونسل کی متفقہ رائے کی ضرورت ہوگی۔

(۳) ممبران لیگ پر واجب ہے کہ مسئلہ متنازعہ فیہ کو عدالت کے فیصلے یا کونسل کی تفتیش کے لئے پیش کریں اور اُس وقت تک جنگ شروع نہ کریں جب تک کہ عدالت کا فیصلہ یا کونسل کی تحقیقاتی رپورٹ شائع ہوئے تین ماہ نہ گذریں۔

موجودہ حالت میں لیگ زبردست اقوام کی خواہشوں اور منصوبوں کو پورا کرنے کے لئے ایک آلہ کار ہے۔ حکم برداری کے یہی معنی ہیں کہ تسلط و استیلاء کے مذموم حرکات کو خوش نما لباس میں ظاہر کیا جائے۔ دیگر دفعات سے صاف عیاں ہے کہ لیگ اسی وقت تک ان قوموں کی نظروں میں وقیع ہے جب تک کہ اپنی ذاتی غرض پر ٹھیس نہیں لگتی۔ بوالعجبی ملاحظہ ہو۔ لیگ نے اپنی غایت الغایات قیام امن قرار دی ہے اسی کی خاطر تمام ممبران لیگ سے سالانہ مقررہ رقم بین الاقوامی اخراجات کے لئے وصول کی جاتی ہے۔ ہندوستان کو بھی بہ حیثیت ممبر سالانہ رقم اداکرنی ہوتی ہے۔ ان رقوم کے ناجائز استعمال کی توضیح کے لئے ایک حال ہی کا واقعہ کافی روشنی ڈالے گا۔ جب قسطنطنیہ پر ترکان احرار نے تسلط کر لیا اسی دوران میں مالٹا سے دو برٹش جنگی جہاز قسطنطنیہ روانہ ہوگئے۔ صرف ان افواج اور جنگی جہازوں کی نقل و حرکت میں تقریباً ایک لاکھ پونڈ خرچ ہوئے۔ یہ رقم برطانیہ نے اپنے ذاتی خزانہ سے نہیں خرچ کی بلکہ یہ اخراجات بین الاقوامی نوعیت کے لحاظ سے لیگ کے خزانہ عام سے خرچ کئے گئے۔ چونکہ یونان لیگ کا ممبر ہے اور جو صرف لیگ کے ایک ممبر کی کمک و اعانت کی خاطر کیا جائے اس کا بار لیگ کے خزانہ عام پر پڑنا چاہئے یہ جنگ زرگری دنیا کو محض دھوکا دینے کے لئے کیجا رہی ہے۔

دنیا میں ایسا اکثر ہوا ہے کہ وہ تعلیمات جو بنی نوع انسان کے لئے نافع اور سودمند تھیں اپنی مسخ شدہ صورت میں بیحد مضرت رساں ثابت ہوتی ہیں۔ بعینہٖ یہی حال لیگ اقوام کا ہے۔ بین الاقوامی تعلقات کا استحکام، بنی نوع انسان کی مرفہ الحالی، اور قیام امن و صلح مقاصد

تھے۔ گروشیس اور اس کے رفقا جن کے قوانین بین الاقوامی کا بانی کہا جاتا ہے۔ ان قوانین کی تدوین ہی سے ایک حقیقت شناس کو پتہ چل سکتا ہے کہ یورپ بھی عرصہ سے اپنی حالت سے بیزار ہو چلا ہے۔ انقلابات ذہنی انقلابات مادی کا پیش خیمہ اور مقدمہ ہوا کرتے ہیں۔ اگر ماضی کا علم مستقبل کے لئے رہنمائی کر سکتا ہے تو ارتقائے عالم کا یہی تقاضا معلوم ہوتا ہے کہ ایک ایسی "دولت متفقہ" قائم ہو جس میں دنیا کے تمام ممالک کے نمایندے شریک ہوں۔ اس "دولت متفقہ" کو ان معاملات میں جن کا تعلق بین الاقوامی مفاد سے ہو اپنی قوت حاکمہ وقوت نافذہ کے استعمال کرنے کا پورا اختیار ہوگا۔ کیونکہ جب تک قوت نفاذ کسی سیاسی جماعت کی حمایت اور پشت پناہی پر نہ ہو اس کی مثال اس نعش کی سی ہے جس میں روح نہیں۔ میں اس خیال سے متفق نہیں کہ فطرت انسانیہ اس قدر نیک اور سلیم الطبع واقع ہوئی ہے کہ وہ بغیر کسی خارجی قوت وطاقت کے استعمال کے نیکی اور خیر کی طرف مائل ہوتی جائیگی۔ یہ خیال غلط فہمی پر مبنی ہے اور واقعات کے سراسر خلاف ہے۔ جب تک دنیا میں حرص کے بندے موجود ہیں اس وقت تک کم از کم اپنی مدافعت ہی کی خاطر مادی قوت ناگزیر ہے۔ اس "دولت متفقہ" کی بنا فلسفیانہ تخیلات پر نہیں بلکہ واقعات پر۔ اور اگر اس کو متحد و منتظم مرکز بنانا مقصود ہے تو یہ فرض اولین ہوگا کہ مادی فلاح وبہبود کو پیش نظر رکھا جائے، کیونکہ افراد کی طرح اقوام بھی صرف تخیلات اور وجدانی کیفیات پر زندہ نہیں رہ سکتیں۔

سب سے زیادہ ضروری یہ امر ہے کہ ایک ایسی ذہنی حالت پیدا کی جائے جسکو بین الاقوامی ہونے سے تعبیر کیا جا سکے، ایک سیاست داں اور علم النفس کے ماہر کا کیا خوب قول ہے کہ "ہماری اشیا بہ نسبت ہمارے ذہنوں کے زیادہ بین الاقوامی ہیں" کسی ملک کے دہقان کے لباس اور دیگر ضرورت زندگی پر اگر نظر ڈالیے تو معلوم ہو کہ بکثرت چیزیں ان ممالک کی ہیں جن کے نام سے بھی وہ نابلد ہے۔

اس ذہنی حالت کے فقدان کے دو اسباب ہیں۔ دنیا میں یا حاکم اقوام ہیں یا محکوم، حاکم اقوام کی حریصانہ پالیسی نے ان کو اتنا کوتاہ نظر بنا دیا ہے کہ صرف اپنے مفاد واغراض چاہے ان سے

دیگر اقوام کو سراسر نقصان ہوا انکے پیش نظر رہتے ہیں۔

محکوم اقوام میں غلامی کی وجہ سے وسعت نظر مفقود ہے۔ اس لئے بین الاقوامی مواخات اور تمام بنی نوع انسان کی برادری قایم کرنے سے پیشتر تمام انسانی بستیوں کا فطری حق ہے کہ آزادی حاصل کریں۔ اس کے بعد ہماری محبت اپنی قومیت کے جغرافی حدود تک ختم نہ ہو جائے میرے نزدیک آزادی حاصل کرنے کا مقصد اپنے حقوق کی نگہداشت کے علاوہ یہ ہونا چاہیئے چونکہ ایک قوم غلامی کی وجہ سے بنی نوع انسان کی عام خوش حالی میں اضافہ نہیں کر سکتی اس لئے اس کا آزادی حاصل کرنا فرض اولین ہے یعنی آزادی بھی بذاتہ ایک اور بڑے مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ ممکن ہے کہ لوگوں کو اس تخیل کے صورت عمل اختیار کرنے میں شبہات ہوں۔ زمانے کا رجحان بجائے خود ایک معلم ہونا چاہیئے۔ ابھی حال ہی کا ذکر ہے کہ ہندوستان کے چند لیڈروں کو "اتحاد ایشیا" قایم کرنے کا خیال پیدا ہوا ہے۔ اس اتحاد سے ایشیائی حکومتوں کا نہیں بلکہ باشندوں کا اتحاد مراد ہے۔ یہ اتحاد گویا اپنے اغراض ومقاصد میں لیگ اقوام کے بالکل خلاف ہوگا۔ لیگ کا مقصد یہ ہے کہ غیر ترقی یافتہ ممالک سے سیاسی واقتصادی فائدہ حاصل کرنے میں آپس کے تصادم کو حتی المقدور بچایا جاوے۔ اس "اتحاد ایشیا" کا یہ مقصد ہوگا کہ ایسی صورت حالات پیدا کرنی چاہیے جس کے ذریعہ سے سیاسی واقتصادی محکومیت سے نجات حاصل کی جائے۔ جیسا کہ میں بتلا چکا ہوں یہی "اتحاد ایشیا" مختلف حالات کی وجہ سے مختلف صورتیں اختیار کرتا ہوا، قوانین فطرت کے تابع اس "دولت متفقہ" کی شکل میں ظہور پذیر ہوگا جس کا میں نے ذکر کیا ہے۔ موجودہ جبارانہ "قوم پرستی" کے طلسم ٹوٹنے سے میری مراد اس اقدام کی طرف ہی جو زمانہ غیر مرئی طور پر کر رہا ہے۔

یوسف حسین خاں

متعلم جامعہ ملیہ اسلامیہ

علی گڑھ

مسئلہ تاوانِ جنگ

عہدنامہ ورسیلز کی رو سے اتحادیوں کو جرمنی سے مندرجہ ذیل نقصانات کے لئے تاوان حاصل کرنے کا استحقاق ہے۔

(۱) ان نقصانات کی تلافی جو سویلین مجروحین یا مقتولین کو اس جنگ میں پہونچے۔ اس تلافی میں بم، بری یا بحری حملے، ہوائی جہاز کے ذریعے اور ہر طرح کے دیگر نقصانات شامل ہیں۔

(۲) ان نقصانات کی تلافی جو سویلین مقتولین یا ان کے پسماندگان کو بذریعہ بیرحمانہ سلوک یا تشدد کے جرمنی یا اس کے حلیفوں کی طرف سے پہونچے۔ (اس تلافی میں صحت اور جان کے وہ تمام نقصانات شامل ہیں جو قید، جلاوطنی، شہر خالی کرانے، سمندر پر روک رکھنے اور جبریہ محنت لینے میں بطور نتائج پہنچے ہیں)

(۳) ان نقصانات کی تلافی جو سویلین مقتولین اور ان کے پسماندگان کو جرمنی یا اس کے حلیفوں کی طرف سے اپنے ملک یا مقبوضہ و مفتوحہ صوبجات میں ہوئے ہیں جن میں صحت و عزت وغیرہ کا نقصان بھی شامل ہے۔

(۴) ان نقصانات کی تلافی جو جنگی قیدیوں کو کسی قسم کی بدسلوکی سے پہنچے ہیں۔

(۵) ان نقصانات کی تلافی جو دول اتحادی اور ان کے شرکاء کے فوجی اور بحری مجروحین مقتولین یا اس کے پسماندگان کو بہ صورت پنشن یا معاوضہ زرچوان کو دیے جاتے تھے پہونچے ہیں ان رقموں میں سے ہر ایک موجودہ عہدنامہ کے عمل میں آنے تک ادا کر دینی ہوگی اور ان رقوم کا تعین اس شرح سے ہوگا جو اس وقت فرانس میں تھی۔

(۶) اس امداد کی قیمت بھی جو اتحادی حکومتوں اور ان کے شرکاء کی طرف سے جنگی قیدیوں، ان کے خاندانوں اور پسماندگان کو دی گئی ہے، ادا کرنی ہوگی۔

(۷) اس بھتے کی ادائیگی بھی جو اتحادی حکومتوں اور ان کے شرکاء کی طرف سے بھرتی شدہ یا فوجی اشخاص کو یا ان کے خاندان اور پسماندگان کو ملتے تھے، جرمنی کے ذمہ ہوگی۔ ان رقوم کی تشخیص

ادائیگی کا تعین فرانس کے اس زمانہ کی شرح سے ہوگا۔

(۸) ان نقصانات کی تلافی جو سویلین کو جرمنی یا اس کے حلیفوں کے جبریہ محنت لینے اور مناسب اجرت نہ دینے کی وجہ سے ہوئے ہیں۔

(۹) ان تمام منقولہ وغیر منقولہ اشیاء کے نقصانات کی تلافی جو اتحادیوں یا اُن کے شرکا میں سے کسی ایک کی ملک ہیں۔ اس سے وہ سامان جنگی یا بحری مستثنیٰ ہے جو جرمنی یا اُس کے حلیفوں نے ہوائی جہاز کے ذریعہ سے یا خشکی و بحری طریقہ پر برباد کیا ہے۔

(۱۰) ان تمام نقصانات کی تلافی جو جرمنی یا اُس کے حلیفوں نے سیولین آبادی سے بصورت تاوان وجرمانہ وغیرہ لیا ہے۔

مذکورہ بالا نقصانات کے لئے رقوم کی تعین "کمیشن تاوان جنگ" کے متعلق کر دی گئی اور حقیقت ہر شخص پر جس کو اقتصادیات اور مالیات سے کچھ بھی تعلق ہے ظاہر ہے کہ اگر اس رقم کا صحیح تخمینہ کیا گیا تو اس کی ادائیگی جرمنی کی قوت سے یقیناً باہر ہوگی۔

علاوہ بریں وظائف کی ادائیگی کا مطالبہ جو کل رقم کا نصف شمار کیا جاتا تھا وہ پریسیڈنٹ ولسن نیز دوسرے آزاد خیال اور غیر متعلق ناقدین کے نزدیک اس سمجھوتہ کے منافی تھا جس کی بنا پر جرمنی نے التوائے جنگ قبول کی تھی، امریکہ کے اعتراضات کو فرانس اور برطانیہ نے ناجائز قرار دیکر وظائف کے قبولیت کی تجویز آخر الذکر کے ذمہ کر دی جس کا مقصد غالباً مسٹر لائڈ جارج کے لئے ۱۹۱۸ء کے انتخاب عام میں ووٹ حاصل کرنا تھا حالانکہ بالآخر شرائط صلح کی حقیقت سے ہم سب آگاہ ہوگئے تھے اور برملا اس پر مقر رہے کہ ان کو زیادہ معتدل بنانا چاہیئے، یہاں تک کہ مئی ۱۹۲۱ء میں ہم سب لوگ اس پر متفق ہوئے کہ تاوان جنگ کی جملہ رقم .... پونڈ مقرر کی جائے جو ۳۰ سال کے دوران میں متفرق اقساط میں ہر سال واجب الادا ہوگی، یہ جانتے ہوئے کہ یہ مقدار بھی جرمنی کی امکانی حدود سے متجاوز ہیں۔

جرمنی نے بہت کچھ نقد اور جنس کے صورت میں ادا کر دیا۔ صلحنامہ پر دستخط کرنے کے بعد سے

موسم گرما ۱۹۲۱ء میں اس نے کامیابی کے ساتھ وہ رقم بھی فراہم کرلی جس کی ادائیگی کا وعدہ اس نے مئی ۱۹۲۱ء کے اقرارنامہ میں کیا تھا۔ متفرقات کی پہلی سالانہ قسط جو نومبر میں واجب الادا تھی وہ صرف جنس پر مشتمل تھی، لیکن سال کے اختتام پر حکومت برلن کی طرف سے اقساط سہ ماہی مقررہ اور متفرقات کے لیے جو جنوری اور فروری میں واجب الادا تھیں عدم استطاعت ادائیگی کا اعلان کردیا گیا، اس اثنا میں مارک کی قیمت میں تخفیف شروع ہوگئی تھی، غرضکہ جرمنی کی مالی مشکلات سے متاثر ہوکر جس کو ملحوظ رکھتے ہوئے فرانس اور برطانیہ نے پہلے پیرس کے مقام پر دسمبر کے مہینہ میں پھر مارچ میں کینز کے مقام پر باہم مشورہ کیا، اور یہ طے پایا کہ جرمنی کو ۱۹۲۲ء میں قدرے مہلت دیجائے اور اس دوران میں اس سے صرف ۰۰۰,۰۰۰,۳۶ پونڈ نقد اور ۰۰۰,۰۰۰,۷۲ پونڈ جنس کی صورت میں ادا کرنے کو کہا جائے، یہ رقم اس کی نصف ہے جس کی ادائیگی کے لیے مئی ۱۹۲۱ء کے اقرارنامہ کے مطابق آئندہ سے وعدہ لیا گیا تھا، اس رعایت کے عوض میں جرمنی سے کہا گیا کہ وہ اپنی مالیات کو بہتر حالت میں منظم کرے، دوسرے اخراجات میں تخفیف کرے، ایک ملکی قرضہ کے لیے انتظام کرے، کوئی ایسی تجویز عمل میں لائے جس سے ملکی سرمایہ کی برآمد رک سکے اور کمیشن تاوان جنگ کے اختیارات میں اور وسعت کی اجازت دے کہ وہ "کمیٹی آف گارنٹیز" کے ذریعہ سے تمام انتظامات کی خبرگیری کرسکے جرمنی نے پہلے تو احتجاج کیا اور توقف بھی لیکن رفتہ رفتہ اتحادیوں کی تمام تجاویز تسلیم کرلی گئیں اور جدید انتظام کے مطابق جولائی تک ماہواری قسطیں ادا کرتی رہی لیکن اتحادیوں کے تمام مراعات اور جرمن حکومت کی اپنے فرائض سے عہدہ برآ ہونے کی مخلصانہ کوششیں ایک اہم خطرہ کو باز رکھنے میں کامیاب نہ ہوئیں جنگ کے زمانہ میں ایک پونڈ کے بیس مارک ملتے تھے، مئی ۱۹۲۱ء میں ۲۴۰ مارک کی ایک گنی ملنے لگی، اگست میں اس کی قیمت ۳۰۰ مارک ہوگئی اور ستمبر کے آخر تک ۴۰۰ مارک ہوگئی، پھر اکتوبر کے آخر میں ۷۰۰ اور نومبر میں ۱۱۵۰ ہوگئی۔ شروع جون ۱۹۲۱ء میں مارک کی قیمت

مبادلہ ۱۲۰۰ تھی لیکن مہینہ کے آخر میں ۱۶۰۰ تک پہونچ گئی، پھر جولائی کے پہلے ہفتہ میں ۲۴۰۰ اور اگست کے پہلے ہفتہ ۳۴۰۰ ہوگئی تھی۔* "مارک" کی قیمت گرجانے کی وجہ جسقدر آسان ہے اسی قدر واضح بھی ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جرمنی کا قدم بھی آسٹریا ہی کی طرح چلتا جارہا ہے قبل اس کے کہ وہ تاوان جنگ کی ادائیگی واقعاً شروع کرے۔ موسم بہار ۱۹۲۱ء کے فیصلہ کے مطابق تاوان جنگ کی رقم یاد ہوگا کہ ۶٬۶۰۰٬۰۰۰٬۰۰۰ پونڈ مقرر کی گئی تھی۔ ۳۔ اگست کو دارالعوام میں تقریر کرتے ہوئے سر رابرٹ ہارن نے فرمایا تھا کہ ابتدائے جنگ سے اب تک جرمنی نے اتحادیوں کو ۱۰۷٬۰۰۰٬۰۰۰ پونڈ نقد اور ۳۰۴٬۰۰۰٬۰۰۰ پونڈ جنس کی صورت میں ادا کیا ہے۔ آخر الذکر رقم ۱۴۰٬۰۰۰٬۰۰۰ پونڈ کے قیمتی جہازوں کوئلہ اور دوسرے چیزوں پر مشتمل ہے اور ۱۲۵٬۰۰۰٬۰۰۰ پونڈ مفتوحہ علاقوں میں حکومت کے املاک کی قیمت ہے۔ اس کے علاوہ چند اور چھوٹی چھوٹی رقمیں بھی شامل ہیں، علاوہ ۴۱۵٬۰۰۰٬۰۰۰ پونڈ کے جو اس طرح پر وصول کئے گئے ہیں ۳۸۰٬۰۰۰٬۰۰۰ پونڈ اس قرض کے تصفیہ کے لئے ادا کی جو جنگ شروع ہونے سے پہلے باشندگان جرمنی کے ذمہ اتحادیوں کا باقی رہگیا تھا۔ اس مد میں جرمنی کا کل قرضہ ۳۰٬۰۰۰٬۰۰۰ پونڈ ہے، اس سال اگست کے مہینہ تک ۲٬۰۰۰٬۰۰۰ پونڈ ماہوار کے حساب سے یہ قرضہ باسانی ادا ہورہا تھا، لیکن اگست کے مہینہ میں "مارک" کی قیمت زیادہ گرجانے کی وجہ سے حکومت برلن کو واجب الادا اقساط میں تخفیف کے لئے درخواست کرنی پڑی، فرانس نے تخفیف کرنے سے صاف انکار کیا اور اپنے اختیارات کو کام میں لانے کی دھمکی دی اور اس طرح اُن پیچیدہ معاملات کو جو مسٹر پائینکارے اور مسٹر لائڈ جارج کو اپنی ملاقات کے وقت لندن میں درپیش تھے اور بھی الجھادیا۔ اس رقم کی قلت اُن امداد کے مقابلہ میں جن کی وصولیابی کا یقین برطانوی اور فرانسیسی باشندوں کو دلایا گیا تھا، اس خیال کے لئے اور بھی تقویت

* موجودہ حالات میں فرانس کے جرمنی علاقوں پر قبضہ کرنے کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ مارک کی قیمت بالکل گر گئی یعنی اس وقت ۵۰٬۰۰۰ فی پونڈ ہے۔ مترجم۔

محض ثابت ہوئی کہ جرمنی کی مشکلات جن کا اندازہ مارک کی قیمت گر جانے سے کیا جاتا ہے وہ محض ایک مبالغہ آمیز بناوٹ ہے تاکہ قرض خواہ اس کو دیوالیہ سمجھکر دھوکہ کھا جائیں۔ اس میں شک نہیں کہ جرمنی بہت کچھ اس مسئلہ کو حل کر سکتا تھا اگر وہاں ایک مستحکم مرکزی حکومت قائم ہوتی جو حکومت کے مختلف محکموں اور ملازمت عالیہ میں مالی انتظامات کرنے کے قابل ہوتی۔ یہ بھی صحیح ہے کہ کچھ تجار اور اکثر ماہرین مالیات نے ایسے طریقہ اختیار کئے جس سے جرمنی کے اعتماد کو ضرور صدمہ پہنچا حالانکہ ان کی اپنی جیبیں بھر گئیں، لیکن جرمنی کی مالی تباہی کے وجوہات زیادہ تر اس صورت حال سے پیدا ہوئے جو جنگ کا نتیجہ ہے اور جس کی ترکت صلحنامہ ورسیلز کے ان دفعات سے اور بھی بڑھ گئی جن کا تعلق تاوان جنگ سے ہے۔

جرمنی کی مالی تباہی کی حقیقی وجہ یہ نہیں ہے کہ اس کو اتنی کثیر رقمیں ادا کرنی پڑیں بلکہ اس کے ذمہ اتنی بڑی رقم کا واجب الادا ہونا جس کی ادائگی ناممکن ہے۔ جرمنی مقروض ہے اور اس کا بار اس کی قوت سے کہیں زیادہ ہے جرمنی کو تیار شدہ مال باہر بھیجنا پڑتا ہے تاکہ ان خام اشیاء کی قیمت ادا کرے جس میں سامان خورد و نوش بھی شامل ہوتا ہے۔ شروع سال میں جرمن حکومت نے یہ اندازہ کیا تھا کہ درآمد برآمد سے ۱۰۰،۰۰۰،۰۰۰ پونڈ زائد تھی اور اغلب تھا کہ کچھ عرصہ تک تجارتی حالت یوں ہی رہیگی۔ مئی ۱۹۲۱ء کے فیصلہ کے مطابق جرمنی کو ہر سال ۱۰۰،۰۰۰،۰۰۰ پونڈ نقد اور برآمد کا ۲۶ فی صدی متفرقات کی صورت میں ادا کرنا پڑیگا، جس کے معنی یہ ہوئے کہ اس کو اپنی پوشیدہ برآمد یا اپنے اعتماد، یا دوسرے ذرائع سے کچھ رقم زائد فراہم کرنا پڑیگی تاکہ وہ موجودہ نظام عمل پر قائم رہکر ۲۰۰،۰۰۰،۰۰۰ پونڈ سالانہ سے کچھ فاضل رقم یا ۴۰۰ کاغذی مارک فی پونڈ کے حساب سے ۸۰،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰ مارک غیر ممالک سے سامان سکہ اور دوسری قیمتی اشیاء خریدنے کے لئے مہیا کرے، یہ سچ ہے کہ جرمنی نے واجب الادا تاوان کا کوئی حصہ بھی پورا ادا نہیں کیا، اور بڑی بڑی تعداد میں کاغذی مارک کو طبع کرا کر غیر ممالک میں فروخت کیا تاکہ جو کچھ فائدہ اس طرح حاصل ہو اس سے اپنی تجارتی اور سیاسی ضروریات کو پورا کرے۔ اس نے

موجودہ حالت میں تاوان جنگ کی ادائیگی کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ تمام دنیا کے ممنون کو مارک خریدنے کا لالچ دلایا؛ حالانکہ اب ان کی کوئی قیمت نہ رہی تھی غرض طمع کرنے والے بریں کثیر التعداد مارک کا ممنون کی ملکیت میں ہونا، علاوہ آئندہ کی عدم ادائیگی کا خوف یہ وجوہات تھیں جن کی وجہ سے مارک کی قیمت اس قدر زیادہ اور تیز رفتاری سے گر گئی اور اس کا نتیجہ وہی ہوا جس کو "مارک کی پرواز" کہتے ہیں یعنی بجائے اس کے کہ جرمن والے اپنے سرمایہ کو اپنے ہی وطن کی تجارت میں لگائیں، انہوں نے فاضل رقم کو بیرونی ممالک میں منتقل کر دیا اور اگر بیرونی ممالک انہوں نے کچھ حاصل کیا تو اس کو بھی وہیں اپنے اپنے خاندان والوں کے لئے جمع رہنے دیا تاکہ ٹیکس سے بچیں اور جب کوئی افتاد پڑے تو تہی دست نہ رہیں، علاوہ بریں بینک اور تجارتی کارخانہ اپنی دولت کی حفاظت اور غیر ممالک پر اپنا اعتماد قائم رکھنے کے لئے مجبور ہو گئے کہ بیرونی سکوں کو کثیر تعداد میں جمع رکھیں، اس کو کسی طرح پر بھی عیاری اور چالاکی نہیں کہا جا سکتا، بلکہ انسانی فطرت کا ایسی حالت میں یہی اقتضا ہے اور جس کے اثرات آسٹریا میں بھی آج انہیں اسباب کی بنا پر نظر آرہے ہیں، وہ بداخلاقیاں جو سکوں کی متعینہ قیمت کے گر جانے سے عموماً رونما ہوتی ہیں اس کا اثر جرمنی کی "مالیات" میں اسیقدر ہے جتنا کہ آسٹریا میں۔ جرمنی کی تجارتی خوشحالی کے قصہ سننے میں آتے ہیں، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہاں بیروزگاری بالکل نہیں ہے، ان کی تجارتی مرکزوں میں چہل پہل ہے، بڑی بڑی تعمیرات کے لئے تجاویز شدہ سے پیش کی جا رہی ہیں اور رفاہ عامہ کے لئے سڑک، ریل اور بندرگاہوں میں ترقی اور مرمت کے کام شروع ہوتے والے ہیں، پھر یہ دریافت کیا جاتا ہے کہ یہ تمام حالات کہاں تک اس بیان کے مطابق ہیں کہ جرمنی مالی نقطۂ نظر سے آخری سانسیں لے رہا ہے۔ کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ دنیا کو محض فریب میں ڈال رہی ہے؟ لیکن نہیں! یہ دھوکا نہیں ہے بلکہ اگر جرمنی اس انہماک اور تیزی سے سامان تیار کر رہی تو کچھ تو اس لئے کہ بیرونی تجارت سے زیادہ فائدہ کی توقع ہے اور کچھ اس لئے کہ ملکی ضروریات کو پورا کرے اس لیے کہ ہر قوم جس کے سکہ کی قیمت گر جائے وہ قدرتی طور پر یہی چاہے گی کہ اپنے نقد سرمایہ کو کسی چیز میں گراں قوت سے لیکر عمارات تک میں لگائے بجائے اس کے کہ قیمت گرنے کے لئے بنکوں میں پڑا

رہنے دیا جائے" اور یہ واقعات صحیح ہیں تو جرمنی کی تجارتی کارگذاریاں "مارک" کی قیمت گرنے
کی ایک مزید علامت ہے کہ مارک کی قیمت کا کوئی اعتبار نہیں رہا ہے اور اس صورت میں دوسرے
ممالک میں منتقل کیا جا رہا ہے۔ بیروزگاری کا نہ ہونا بھی انھیں اسباب پر مبنی ہے کہ جن کی وجہ سے
مزدوروں کی تعداد ۱۹۱۹ء میں سکہ کی قیمت گر جانے کے بعد بہت بڑھ گئی تھی۔

مارک کی گذشتہ تباہی سے پہلے بھی برسس کے علاوہ ہر جگہ یہ محسوس کیا جاتا تھا کہ اگر جرمنی کو
کافی مہلت نہ دی گئی اور موجودہ تاوانی تصفیہ کو قابل عمل صورت میں مرتب نہ کیا گیا تو جرمنی کبھی اپنے
قرض کی ادائگی کے قابل نہ ہوگی اپریل اور مئی کے مہینہ میں جینوا میں محض موسیو پائنکارے کی وجہ سے
یہ سوال نہیں اٹھایا گیا تھا۔ لیکن جون میں تاوانی کمیشن کی دعوت پر مختلف اقوام کے ماہرین مالیات
کی ایک کمیٹی اس امر پر غور کرنے کے لیے منعقد کی گئی کہ جرمنی تاوان جنگ ادا کرنے کے لیے بیرونی
ممالک سے قرضہ حاصل کر سکتی ہے۔ اس کمیٹی کی طرف سے باقاعدہ کوئی رپورٹ شایع نہیں کی گئی
اس لئے مذکورہ کمیٹی نیز تاوانی کمیشن کے جلسوں کی کارروائیوں سے یہ صاف ظاہر ہو گیا تھا کہ تاوان
جنگ کی تخفیف بہر حالت میں ایک ضروری شرط ہے قبل اس کے جرمنی غیر ممالک سے قرضہ کی درخواست
کرے اور دوسری طرف فرانس کسی قسم کی تخفیف پر اس وقت تک تیار نہ تھا جب تک کہ امریکہ اور
برطانیہ اُس کے قرضہ میں تخفیف نہ کرینگی۔

بہرحال کچھ تو ضرور حاصل ہوا اور فرانس نے وعدہ کیا کہ وہ بعض حالات میں قرضہ جرمنی میں آخری
بار ایک معقول رقم کی تخفیف پر غور کرنے کو تیار رہے گی۔ فرانس کے فیصلہ میں سب سے بڑا خیال اپنی
باقی مشکلات کا تھا۔ ہم لوگوں نے ہمیشہ اپنے میزانیہ کو تاوان جنگ کے شمار کے بغیر تیار کیا یہ سمجھ کر
کہ اگر اس سلسلہ میں کچھ وصول ہوا تو وہ نعمت غیر مترقبہ ہوگی لیکن فرانس نے اپنی دولتمندی کا انحصار
جرمنی پر رکھا اور خطرہ میں پڑ گیا، وہ اپنے اخراجات کو اس امید پر بڑھاتا رہا کہ عنقریب "مرہائن"
اُس پار سے بہت بڑی دولت اس کے خزانوں میں ڈھلنے والی ہے۔

۱۹۲۳ء میں فرانس کے اخراجات قریب ۲۰۰،۰۰۰،۰۰۰ پونڈ تھے اور اسی قدر اُس کی

آمدنی بھی تھی ۔ سنہ ۱۹۲۳ء کے لیے اخراجات کا تخمینہ ۴۴۰،۰۰۰،۰۰۰ پونڈ ہے اور آمدنی کا کل تخمینہ ۳۰۰،۰۰۰،۰۰۰ پونڈ کیا گیا ہے ۔ اس طرح ۱۴۰،۰۰۰،۰۰۰ پونڈ کی کمی واقع ہوئی ہے ۔ سال رواں میں بھی غالباً اسی قدر کمی واقع ہو ۔ لیکن اگر یہی ایک معاملہ ہوتا تو یہ کہا جا سکتا تھا کہ فرانس اپنے اخراجات ملکی میں رفتہ رفتہ ایک حد تک تخفیف کر کے برطانیہ کی طرح ٹکس میں اضافہ کر دے تو تمام مشکلات حل ہو جائیں اور آمد و خرچ میں توازن قائم رہے ۔ لیکن اصل معاملات کچھ اور ہیں جس سے اس کا کوئی تعلق نہیں ۔

حکومت فرانس بڑی بڑی رقمیں خرچ کرتی جا رہی ہے جس کا شمار میزانیہ میں کہیں نہیں کیا گیا ہے یہ بیان کیا جاتا ہے کہ فرانس نے التوائے جنگ سے اب تک ۱،۲۰۰،۰۰۰،۰۰۰ پونڈ واپس ملنے کی امید میں خرچ کیا ہے ۔ اور سرکاری تخمینہ کے مطابق یہ امید کی جاتی ہے کہ اس کو ۲،۴۰۰،۰۰۰،۰۰۰ پونڈ تباہ شدہ علاقوں کی مرمت اور مقتولین جنگ کے معاوضہ کے لئے ادا کرنا پڑیگا ۔ علاوہ اس رقم کے جو ہر سال وظائف میں خرچ کی جاتی ہے اور جو آجکل ۴ ملیرڈ یا ۸۰،۰۰۰،۰۰۰ پونڈ کے برابر ہے جس کو اگر اصل کی صورت میں تبدیل کیا جائے تو ۱،۶۰۰،۰۰۰،۰۰۰ پونڈ کے برابر ہوگی ، یہ رقم صلحنامہ کے مطابق جرمنی سے وصول ہو سکتی ہے اسی لیے فرانسیسی مضمون نگار ہمیشہ اس رقم کو قرضہ جرمنی میں شمار کرتے ہیں ۔ غرض اندازہ کرنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ سنہ ۱۹۲۳ء میں واپس ملجانے والے اخراجات مجوزہ ۵۴۰،۰۰۰،۰۰۰ پونڈ ہونگے جنمیں اگر ۸۰،۰۰۰،۰۰۰ پونڈ میزانیہ کی کمی بھی شامل کر دی جائے تو فرانس کو ۶۲۰،۰۰۰،۰۰۰ پونڈ قرض لینا پڑیگا بشرطیکہ جرمنی سے تاوان جنگ وصول نہ ہوا ۔

غرض اجمالی طور پر اس اہم مسئلہ کا یہ ایک مختصر سا خاکہ ہے کہ فرانس تباہ شدہ علاقوں کی مرمت کے لیے بڑی بڑی رقمیں خرچ کرنے پر مجبور رہے ۔ حالانکہ اس کے نزدیک انصافاً یہ بار جرمنی کی گردن پر ہونا چاہیئے تھا ۔ جرمنی موجودہ حالات میں اس بار کو اٹھانے کے لیے اپنے کو معذور سمجھتا ہے ، آسٹریا کی طرح جرمنی کے تباہی و بربادی کے آثار جن کے نتائج کا کسی کو علم

نہیں، فرانس کا اپنے قرضہ کی گرانباری سے معاندہ طرز عمل اور اپنے تاریک مالی مستقبل کا روح فرسا خیال، اور اپنے غیر منصفانہ رویہ کا احساس نیز اس پر غصہ اور خفگی باوجود فتحمندی کے اس قدر بےبسی کا عالم ہی سب صحیح۔ لیکن ہمارے نزدیک باوجود ان تمام واقعات کے فرانس کو اپنے داخلی اخراجات کے بار کو اپنے ہی کاندھوں اٹھانا چاہیے۔

(ماخوذ از لوئڈ جبیل) (شفیق الرحمن قدوائی متعلم جامعہ ملیہ)

ہندوستانی تعلیم کا مرکز

ذیل کا مضمون ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کے وہ خیالات ہیں جو مسئلہ قومی تعلیم پر ایک مدت کی غور و فکر کے بعد اپنی یونیورسٹی کے متعلق انہوں نے تقریباً پانچ سال قبل ظاہر کیے تھے اور جو بعد میں ایک رسالہ کی شکل میں شایع ہوئے ہیں۔ ہندوستان میں قومی تعلیم ابھی تک تجربہ کے حدود سے آگے نہیں بڑھی ہے اس لیے ان ضروریات پر بار بار توجہ کرنا ہمارا پہلا فرض ہے جن کی نسبت ڈاکٹر ٹیگور نے بطور ذیل میں اشارہ کیا ہے۔

(۱)

اس مضمون میں میں جس مسئلہ پر بحث کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ ہندوستان میں تعلیم کا نصب العین کیا ہونا چاہیئے؟

ناظرین کو آخر مضمون تک منتظر رکھنے کی بجائے میں توضیح کرنے سے پیشتر اس سوال کا جواب ابتدا ہی میں مختصر طور پر دے دینا چاہتا ہوں۔ ہر قوم کا فرض ہے کہ دنیا کی روشنی دینے کے لئے اپنے حصہ کے طور پر اپنی شمع دماغ روشن رکھے۔ کسی قوم کا چراغ گل ہو جانے کے یہ معنی ہیں کہ ضیافت گاہ عالم میں وہ اپنی جگہ سے محروم کر دی گئی۔ جس کے پاس کوئی روشنی نہیں وہ بدنصیب تو ضرور ہے لیکن بہت ہی بدقسمت ہے وہ قوم جو اسے کبھی رکھنے کے باوجود اب اس سے محروم ہو گئی ہے یا اُسے دماغ سے

بالکل محو کردیا ہے۔

ہندوستان اس بات کا ثبوت دے چکا ہے کہ اس کا اپنا ایک دماغ ہے جس نے مسائل زندگی کو اپنی روشنی میں حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہندوستانی تعلیم کے یہ معنی ہیں کہ ہندوستان کے اس دماغ کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ صداقت معلوم کرسکے اور اس کو اپنا بنا سکے اور اس کو اس طرح پر ظاہر کرے کہ صرف وہی اُسے کرسکتا ہے۔

اس غرض کے لیے سب سے پہلے ہندوستان کے دماغ کو ایک نقطہ پر لانا اور آپ اپنا حقیقت شناس بنانا ہے۔ اس کے بعد وہ اپنے اساتذہ سے صحیح معنوں میں تعلیم قبول کرسکتا ہے، اپنے معیار کے مطابق فیصلہ کرسکتا ہے اور اس فیصلہ کو اپنی قوت اجتہاد سے عمل میں لاسکتا ہے۔ تمام انگلیوں کا لیتے اور دیتے وقت دونوں حالتوں میں متحد رہنا ضروری ہے۔ چنانچہ جس وقت ہم ہندوستان کے منتشر دماغ کو یکجا کرسکیں گے اسی وقت ان میں داد ستد دونوں قوا موجود ہوں گے ــــــ اور روح پرور پانی کا بہکر نکلجانا جس سے نیچے کی زمین خشک رہجائے، بند ہوجائے گا۔

ایک دوسری بات یہ ہے کہ تعلیم کا ایک بڑا اہم جزو یہ ہونا چاہیئے کہ فضا اجتہادی اور اختراعی مشاغل سے معمور رہے اس بنا پر ہماری یونیورسٹی کی ابتدائی غرض علم کا تعمیری کام ہونا چاہیئے۔ اشخاص بہم پہنچانے چاہئیں اور انھیں علمی تحقیق و تفتیش کے لیے پورا موقع دیا جانا چاہیئے اور تعلیم دریا کے بہاؤ کی طرح ضروری اور آزادہ رد ہو۔ تعلیم صرف اسی وقت قدرتی اور مفید ہوسکتی ہے جبکہ وہ زندہ اور بڑھتے ہوئے علم کا نتیجہ ہو۔

آخری امر یہ ہے کہ تعلیم کو ہماری زندگی کے معاشی، علمی، روحانی اور معاشرتی ہر پہلو سے مَس ہونا چاہیئے اور ہماری درسگاہوں کو ہماری سوسائٹی کے اندر ہونا چاہیئے تاکہ وہ اتحاد عمل کی زندہ کڑیوں سے وابستہ رہیں۔ کیونکہ حقیقی تعلیم وہ ہے جو ہمیں یہ بتائے کہ ہر قدم پر ہماری تعلیم و تربیت کو ہمارے ماحول سے تعلق ہے۔

(۲)

اس وقت تمام ہندوستان میں موجودہ طرز تعلیم سے ایک عام بے چینی پھیلی ہوئی ہے۔ اس کو بدلنے کے لیے متعدد بار خواہش کی جاچکی ہے۔ ہمارے قومی دماغ میں ایک احساس پیدا ہو چلا ہے جس سے نئی نئی درسگاہیں کھل رہی ہیں اور جدید تجربے عمل میں لائے جا رہے ہیں مگر چونکہ ان کی خواہش ایسی زبردست ہوتی ہے اور وہ اُس کے پورا کرنے میں اس قدر عجلت سے کام لیتا ہے کہ بسا اوقات مقصد کی تعیین میں اس جذبہ کو صحیح طور پر کام میں لانا دشوار ہو جاتا ہے۔

ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ کی دماغی نشو و نما اسی موجودہ طریقۂ تعلیم کے احاطہ میں ہوئی ہے۔ ہم اس کے ہمہ تن گرویدہ ہو گئے ہیں اور ہمارے دماغ میں یہ خیال جم گیا ہے کہ یہ طریقہ کبھی بدل نہیں سکتا۔ ہمارا تخیل اس احاطہ سے باہر پرواز کرنے کی جرات نہیں کر سکتا اور نہ ہم اس سے باہر ہو کر کوئی رائے قائم کر سکتے ہیں۔ ہم میں اس قدر ہمت و دلیری نہیں کہ ہم یہ کہہ سکیں کہ اس کی بجائے کوئی دوسرا طریقہ رائج کیا جائے کیونکہ خود ہماری ذہنی و دماغی زندگی بھی تو اسی طریقۂ تعلیم کا نتیجہ ہے جس کی حمایت و توصیف کرنا ہمارے لئے قدرتی امر ہے۔

تاہم اس اطمینان پر بھی ہمارے دلمیں ایک کانٹا سا کھٹکتا ہے جو ہمیں چین سے سونے نہیں دیتا۔ جس وقت یہ اندرونی خلش زور کرتی ہے ہم اپنی بے چینی کا کوئی خارجی سبب بتلانے لگتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ ہماری تعلیم میں صرف یہ نقص ہے کہ ہمارے کامل قبضۂ و اختیار میں نہیں۔ کشتی دریا میں چلنے کے قابل ہے لیکن اس کو تباہی سے بچانے کے لیے پتوار ہمارے ہاتھوں میں ہونا چاہیئے۔ ابھی حال میں قومی اسکول اور یونیورسٹیاں قایم کرنے میں صرف اس خیال سے بہت کچھ کوشش کی گئی ہے کہ جس چیز کی ہمیں اشد ضرورت ہے وہ خارجی آزادی ہے۔ ہم یہ فراموش کر دیتے ہیں کہ ہمارے اخلاق یا حالات کی جس کمزوری نے ہم کو نقل اتارنے پر آمادہ کیا وہی ہمارا پیچھا اس وقت بھی نہ چھوڑے گی جب ہماری آزادی محض خارجی ہوگی کیونکہ اس وقت ہماری یہی آزادی غیر ملکی تعلیمگاہوں کے نقل اتارنے میں ہوگی اور اس سے گویا مشین سے تیار شدہ بیجان یونیورسٹی بنے گی اور وہ بھی ایسی جو ایک خراب مشین سے تیار ہوئی ہو۔

اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ وہ جماعت جو بازی میں ہار جاتی ہے، اپنی شکست کا سبب باہم ایک دوسرے کی غلطی پر محمول کرتی ہے۔ اسی طرح ہمارے اس بیکار طریقۂ تعلیم میں ہم دو فریق یعنی ہمارے انگریزی حکام اور ہم خود ایک دوسرے کی الزام دہی کا وہی طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ الزام ہم دونوں پر برابر برابر عائد ہو پھر بھی فریق ثانی سے اس کے حصۂ غلطی کے متعلق جھگڑنا میرے نزدیک غیر مفید سا ہے ہمارے لئے جو بات سب سے ضروری ہے وہ اس کا جاننا ہے کہ اس خامی میں جس کے ہم شاکی ہیں ہمارا حصہ کس قدر ہے۔

جن لوگوں کو شدروں کی حالت پر ترس آتا ہے وہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کو اس ذلت آمیز حالت میں رکھنے کے ذمہ دار صرف برہمن ہیں لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ یہ کہنا شدروں کے حق میں اس سے زیادہ مفید ہے کہ اس ذلت کے ذمہ دار وہ خود ہیں کہ انہوں نے برہمنوں کو تذلیل و تحقیر کا موقع دیا۔

چنانچہ اس معاملہ میں ہم کو اپنے فریق مخالف کا خیال دل سے نکال دینا چاہیئے۔ ہم کو اپنی کمزوری کا اعتراف کرنا چاہیئے کہ اس خیال میں دیوانے ہو گئے کہ ہمیں صرف لکڑی کی بدشتی ٹانگوں کی ضرورت ہے صرف اس وجہ سے کہ ہم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ کھڑے ہونے کے لئے ہماری ٹانگیں نہیں ہیں۔ میں نے ایسا ہی واقعہ ایک ایسے بدنصیب شخص کا سنا ہے جو ایک بار دریا کے تھوڑے سے پانی میں ڈوب گیا۔ محض اس سبب سے کہ اس نے یہ سمجھ لیا کہ وہ اپنے ڈوباؤ سے آگے بڑھ گیا ہے۔

جونہی ایک یونیورسٹی کا خیال ہمارے دماغ میں آتا ہے اسیوقت کیمبرج، آکسفرڈ اور دیگر یورپین یونیورسٹیوں کے خیالات سے ہمارا دماغ بھر جاتا ہے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہماری نجات اسی میں ہے کہ ہر ایک کے عمدہ اجزا چن کر ایک مکمل یونیورسٹی بنائیں ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ یورپین یونیورسٹیاں یورپ کی زندگی کے زندہ اجزا ہیں جہاں پر ہر ایک کی نشو و نما قدرتی طور پر ہوئی ہے، موجودہ فن جراحی میں ناک کان یا کوئی عضو اگر کٹ جائے تو دوسرے شخص کے چمڑے سے اس کی مرمت ہو سکتی ہے لیکن دوسروں کے متفرق اعضا کو ملا کر ایک پورا آدمی بنا کر کھڑا کر دینا سائنس کی دسترس سے نہ صرف موجودہ زمانہ میں بلکہ آئندہ بھی باہر رہے گا۔

یورپین یونیورسٹی اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ ہمارے نگاہوں کے سامنے آتی ہے یہی سبب ہے

کہ ہمیں اس کے علاوہ اور کسی دوسری یونیورسٹی کا خیال بھی نہیں آتا۔ یہ دیکھکر کہ میرے ہمسایہ کے ہٹا کٹا جوان بیٹا ہے قدرتاً میرے دلمیں یہ رشک پیدا ہوتا ہے کہ کاش میرے دل میں بھی ایک بیٹا ہوتا لیکن اگر حقیقتاً میری یہ آرزو ہے کہ جوان بیٹا فوراً پیدا ہو جائے تو اس عجلت میں میں کسی شخص کو پکڑ لوں گا جو قدوقامت ویسا ہی رکھتا ہو لیکن وہ میرا لڑکا تو نہ ہوگا بے صبری کے ساتھ نتایج کا انتظار کرنا اور نقل اتارنے کی کمزوری ان دونوں باتوں نے ہمارے دل میں یہ غیر فطری خواہش پیدا کر دی ہے کہ قومی یونیورسٹی ابتدا ہی سے خوب آب وتاب کے ساتھ قایم ہو یہی سبب ہے کہ ہماری کوششیں اکثر ضایع جاتی ہیں یا اگر کچھ ثمرات نکلتے ہیں تو ان کی مثال مٹی کے ان خوبصورت پھلوں کی سی ہے جو جسامت رنگ وروپ اور شکل وشباہت میں قدرتی پھلوں کی مانند ہے لیکن انہیں کھانا تو ایک طرف، دانت سے کاٹنے کے قابل بھی نہیں۔ یہ یونیورسٹیاں جن سے ہمارے ملک کی توقعات وابستہ ہیں مثل ان ابالے ہوئے انڈوں کے ہیں جن سے بچے نکلنے کی امید کرنا عبث ہے۔

صرف ہمیں نہیں بلکہ یورپین حضرات بھی اس امر کو فراموش کر بیٹھے ہیں کہ ان کی یونیورسٹی کی ترقی ان کی قومی ترقی کے ساتھ ساتھ ہوئی ہے۔ اور اس کی مادی شان وشوکت ابتدا ہی سے نہ تھی نیز اس شان وشوکت کو یونیورسٹی کی اصلی روح سے کوئی تعلق نہیں۔ بیشک وہ وقت آگیا ہے۔ جبکہ وہ اس بات کو بھول جائیں کہ ان کی تعلیمی ترقی کے اصلی باعث خانقاہوں کے وہ غریب راہب تھے اور ایک وہ زمانہ تھا جبکہ طلبہ بیشتر غربت وافلاس کی زندگی بسر کرتے تھے۔ لیکن جب وہ ان امور کو بھی فراموش کر دیں گے کہ ہندوستان جیسے غریب ملک میں ہماری یونیورسٹیوں کے مادی ساز وسامان ہماری حیثیت سے زیادہ نہ ہونے چاہئیں اور اصل جگہ کم کر کے سامان خارجی بڑھا کر ہمارے اسکول اور کالجوں کی تعداد کم سے کم تر نہ کرنی چاہیے، تو اسی وقت ہماری قوم کی تباہی لازمی ہے۔

میں اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ کھانا اور کھانے کے لئے برتن دونوں چیزیں انسان کے لئے ضروری ہیں۔ لیکن جب کھانے کی کمی ہو تو ظروف میں بھی کفایت شعاری کرنی ضروری ہوتی ہے۔ سامان تعلیم کو اس قدر گراں کر دینا کہ حصول تعلیم دشوار ہو جائے ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص روپیہ کے لیے تھیلیاں خریدے

میں اپنے سارے روپیے صرف کرتے۔

ہم مشرقیوں کو اپنے سارے زندگی کے مسائل آپ حل کرنے ہیں۔ ہم نے حتی الامکان اپنے طعام و لباس کو ناقابل برداشت نہیں بنا رکھا ہے اور اس کا باعث خود ہمارے ملک کی آب و ہوا ہے۔ ہم کو دیواروں سے زیادہ روزن کی ضرورت ہے۔ ہمارے لباس میں جولاہے کی کرگہ سے زیادہ ہوا اور روشنی کو دخل ہے آفتاب ہمارے لئے گرمی پیدا کرنے کے وہ سامان خود مہیا کرتا ہے جو دوسرے مقامات میں غذا سے پیدا کئے جاتے ہیں۔

میں یہ نہیں کہتا کہ افلاس کوئی اچھی چیز ہے لیکن سادگی لوازمات عیش سے کہیں بہتر ہے جیسی سادگی کی طرف میرا اشارہ ہے کہ وہ افراط اور فضول خرچی میں کمی کا نام نہیں بلکہ وہ کمال انسانی کی ایک علامت ہے جب بنی نوع انسان میں آجاتی ہے اس وقت تمدن کی تمام خرابیاں دور ہو جاتی ہیں یہ سادگی کا ہی کا فقدان ہے کہ ہماری ضروریات زندگی اس قدر کمیاب اور گراں ہو گئی ہیں۔

متمدن دنیا میں بہت سی چیزوں نے مثلاً کھانا، پینا، عیش و آرام، تعلیم و تہذیب، حکومت و عدالت نے اپنی اپنی مناسب حیثیتوں سے زیادہ اہمیت اختیار کر لی ہے مہذب انسانوں پر اس کا بار ضرورت سے زائد ہے، اور ان کے اٹھانے میں وہ تدبیر کی بجائے طاقت یا بہ الفاظ دیگر عقل کی بجائے بازو سے کام لیتے ہیں۔ ان کی مثال اس دیو ہیکل کے ہاتھ پاؤں مارنے کی سی ہے جو ابھی اپنے ڈبا ؤ سے نکلا ہے لیکن تیرنا نہیں جانتا۔ وہ اپنی بے سود کوششوں سے تالاب کا تمام پانی گدلا کر رہا ہے لیکن ساتھ ہی اس کے وہ اس خیال سے خالی بھی نہیں کہ اس اظہار زور و قوت میں کچھ تدبیر کی بھی ضرورت ہے۔

مغرب میں جب سادگی آجائے گی اس وقت کاروبار، عیش و آرام، تعلیم و تعلّم سب آسان ہو جائیں گے۔ یہ کب ہوگا؟ اس کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن اس وقت تک ہم کو بزرگوں کے پند و مواعظ سنتے رہنا چاہیئے کہ اعلیٰ تعلیم سربفلک عظیم الشان عمارتوں ہی میں ہو سکتی ہے!

یہ کہنا کہ ظاہری ساز و سامان تہذیب کے نتائج ہیں اور ان سے چشم پوشی کرنا غریب ہونا ہے، میں اسے اچھی طرح سمجھتا ہوں اگرچہ یورپ ہمیشہ اس کے لیے کوشاں رہا ہے لیکن اب تک اس نے

اس مقصد زریں کو نہیں پا یا پھر ہم اپنی راہ تحصیل میں روڑے کیوں ڈالیں سخو عجیب ہوئے بغیر یہ ایک مسئلہ ہے جسے ہر شخص کو اپنے مذاق طبیعت کے مطابق حل کرنا چاہیئے لیکن جب ہم مغز تعلیم قبول کرنے کیلئے باہر سے ہمیشہ تیار رہتے ہیں تو مذاق طبیعت کا اپنے پر بجبر پیدا کرنا اور بھی بُرا ہے۔

ہمارے اساتذہ کے اس رویہ نے شاگردوں کے دماغ پر بُرا اثر ڈالا ہے اور ظاہری ساز و سامان کی تلاش میں ہم اصل روح سے بیخبر ہو رہے ہیں۔

(۳)

جب بنگال میں قومی مجلس تعلیم (نیشنل کونسل آف ایڈوکیشن) کا سنگ بنیاد رکھا جا رہا تھا اس وقت میں نے اس کے ایک سرگرم کارکن سے پوچھا کہ آیا در اصل تم کو یقین ہے کہ ایک یونیورسٹی کا عظیم الشان درخت مع اپنے شاخ و برگ کے ایک دن کے اندر وجود میں آسکتا ہے ؟ اس نے جواب دیا کہ "اگر ایسا نہ کیا جائے تو ملک کی توجہ مبذول کرنے میں کامیابی نہ ہوگی، لہذا اس کو مکمل صورت میں ابتدا ہی سے پیش کرنا چاہیئے"۔ بہرحال یونیورسٹی اسی صورت میں پیش کی گئی ملک کی توجہ بھی اس جانب منعطف ہوئی قوم نے روپیوں کی تھیلیاں کھول دیں عوض کسی چیز کی کمی نظر آتی تھی بجز ایک صداقت کے ـــــ وہ صداقت "جو ادنیٰ شروعات کو حقیر نہیں سمجھتی جو اپنے شاندار مستقبل کو معمولی طریقے پر چلنے سے نہیں شرماتی۔ وہ نقلی درخت بار آور ثابت ہونے کی کوشش کے باوجود خشک ہو کر اس قدر کمزور اور بے ثبات نظر آتا ہے اور اس میں اتنے برگ و بار بھی نہیں ہوتے کہ خود کو دھوکا دیسکے پس اس بات کو بخوبی ذہن نشین کرلو کہ کسی شخص کے یونیورسٹی کی بنا ڈالدینے اور کسی کے زیر اختیار رکھنے سے وہ اس کی ملک نہیں ہو جاتی۔

اب اس کے بعد یہ معلوم کرنے کی کوشش کرو کہ ہمارے دماغی بیچینی کا آخر سبب کیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ کوئی سو برس ہوتے ہیں کہ ہم انگریزی مدرسے میں داخل ہوئے اور اب تک اس سے نکلنے کے لائق نہ ہوسکے ہم ہمیشہ متعلم کے متعلم ہی رہے ہم نے وہاں جا کر ویسی ہی پناہ لی جیسے چوہا چوہے دان میں۔ اور اندیشہ ہے کہ یہ پناہ گیری کہیں دائمی نہ ہو جائے۔

کوئی شخص اب تک یہ نہیں بتا سکا کہ زندگی کیا شے ہے؟ کیونکہ جب اس کی تعریف کرنے کے لئے اس کے اجزار کی تقسیم کی جاتی ہے تو زندگی ان سے کہیں زیادہ فائق اور بالاتر نظر آتی ہے۔ زندگی جو کچھ پیدا کرتی ہے وہ ان مادی اجزا سے بلحاظ قدر وقیمت کہیں زیادہ ہے جن سے وہ مرکب ہے۔ زندگی صرف مختلف ہواؤں اور اجزار کے مجموعہ کا نام نہیں ہے جنہیں یہ اپنی غذا کے ساتھ استعمال کرتی ہے اس بنا پر ہمارا دماغ بھی اپنی زندگی کے لحاظ سے اُن معلومات اور تربیت سے جو وہ حاصل کرتا ہے کہیں بڑھ کر۔ حقیقی تعلیم وہی ہے جو دماغ کو یک زندہ شئے تسلیم کرتی ہے اور جس کے ذریعے سے دماغ جتنا حاصل کرتا ہے اس سے زیادہ مقدار واوصاف دونوں میں پیدا کرنے کے قابل ہو سکے۔ لہذا ہم کو اپنی تعلیم کا فیصلہ اسی معیار پر کرنا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا ہم نے اس زمانے میں جسقدر حاصل کیا اُس سے زیادہ پیدا کیا ہے یا نہیں اور کوئی ایسی چیز بھی اختراع کی ہے جسے ہم اپنی کہہ سکیں؟ جب کوئی قوم دنیا کے لیے ایک بار ہو جاتی ہے اور اپنے فرائض کا معتدبہ حصہ ادا نہیں کرتی تو یہ اس قوم کو لیے موت سے بھی بدتر ہے کیونکہ اس دوامی الزام میں پستے رہنا انسان کے لئے نہایت ہی ناقابل برداشت مصیبت ہے۔ رہا ہمارے متعلق، تو اس بارے میں اپنی یونیورسٹیوں سے جسقدر حاصل کیا اس سے زیادہ دینا تو درکنار ہم نے اس کے برابر بھی ادا نہیں کیا ہے۔ ہم نے بڑے بڑے الفاظ اور فقرے رٹ لئے عمدہ ضرب المثلیں اور اقوال یاد کیے لیکن اس کے بعد ہم کیا ہوئے محرر، یا ڈپٹی کلکٹر، وکیل، یا ڈاکٹر!

ڈاکٹر یا طبیب ہونا کوئی ادنیٰ پیشہ نہیں ہے لیکن ہمارے ڈاکٹر اور اطبا آجکل ملک کے ہر صوبے و شہر اور قصبہ و قریہ میں طبابت کر رہے ہیں۔ ان میں سے اکثر بہت مشہور بھی ہیں اور خوب روپیہ پیدا کرتے ہیں لیکن انہوں نے اب تک کوئی ایسا نیا مسئلہ یا اصول ایجاد نہیں کیا جس سے فن طبابت میں کچھ بھی اضافہ ہو سکے اسکول کے طالبعلم کی طرح مجرب نسخے جو انہوں نے سیکھے تھے عمل میں لائے لیکن جب متعلم معلم نہ بنے گا تو ہماری مردہ علوم و فنون کو زندہ کرنے کون آسکے گا؟

تاہم میں اِسے تسلیم نہیں کر سکتا کہ یہ حالت ہمارے قوائے فطری کی موروثی خامی یا نقص کی بنا پر ہے۔ زمانہ سلف میں ہمارے یہاں فن طبابت بڑے عروج پر تھا تمام ملک میں اس کی مختلف شاخیں پھیلی ہوئی تھیں اس سے کم از کم یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت ہمارے دماغ کو علوم و فنون کے ساتھ ایک زندہ تعلق تھا، اُس وقت ہم صرف طوطے کی طرح رٹ نہیں لیا کرتے تھے بلکہ خود اپنے مشاہدات اور تجربات حاصل کرتے تھے ہم مبادیات و نظریات کی تحقیق و تفتیش کرتے اور انھیں مختلف شعبہائے زندگی میں کام میں استعمال کرتے تھے۔

ہماری یہ ذہانت اور جرأت کیا ہوئی؟ ہم علم کا بارگراں کندھوں پر رکھے ہونے کے باوجود اسقدر پھونک پھونک کر اور ڈر ڈر کر قدم کیوں رکھ رہے ہیں؟ کیا اس وجہ سے کہ ہم غلام بننے کے لیے پیدا ہوئے تھے۔ اور اس لئے کہ اغیار کے علمی بار تلے ہمیشہ دبے رہیں۔ ؟ نہیں ہرگز نہیں۔ باوجود اس قلت مواقع اور نقائص تعلیم کے جو اجزائے زندگی سے یکسر محروم ہے، سائنس میں سر جگدیش اور سر پرفلا چندر جیسی گراں بہا ہستیاں اور ڈاکٹر سیل جیسے لایق اور فاضل شخص پیدا ہو گئے ہیں جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہماری قوم میں ابھی قوت اجتہاد و اختراع فنا نہیں ہو چکی ہے۔ بلکہ یہ مشین جیسے طریقۂ تعلیم اور عدم حوصلہ افزائی کی وجہ سے کچل دی گئی ہے۔

(باقی آیندہ)

سعید انصاری متعلم جامعہ ملیہ

مکتوب جرمنی

(۱)

برلن

۱۹ دسمبر ۲۲ء

نرخ مبادلہ آپ لوگ اخبار میں صرف نرخ مبادلہ دیکھکر یہاں کے مصارف کے گھٹنے بڑھنے کا کوئی اندازہ نہ کریں نرخ مبادلہ اور قیمت اجناس میں اگرچہ چولی دامن کا ساتھ ہے لیکن دونوں میں گھٹاؤ بڑھاؤ میں یکساں نسبت نہیں رہتی دوسرے یہ کہ قیمتیں اتنی تیزی کے ساتھ نہیں بدلتیں جتنا کہ نرخ مبادلہ۔ مثلاً گزشتہ دو ہفتہ کا حال آپ کو سناؤں اوائل دسمبر میں مارک کا نرخ یہاں کم و بیش ۴۰ اور ۳۵ ہزار مارک فی پونڈ تھا یہ صورت یہاں کمیشن تاوان جنگ (REPORATION COMMISSION-) کے آنے کے بعد سے برابر بتدریج پیدا ہو رہی تھی۔ لیکن اس کمیشن کے آنے کے ساتھ ہی قیمتیں نہیں بڑھیں دکانداروں نے انتظار کیا، عام مقولہ ہے کہ "تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو" جب مارک برابر گرتا گیا تو دسمبر کے دوسرے ہفتہ میں قیمتیں ایک دم بڑھائی گئیں اور جب بڑھیں تو دفعتہً دوگنی سہ گنی ہو گئیں۔ دوکانداروں اور کارخانوں نے یہ سمجھکر کہ مارک کا یہ تدریجی تنزل جاری رہے گا اب اپنی نئی قیمتوں کو اس مفروضہ پر مقرر کیا کہ مارک کا نرخ ۵۰، ۶۰ ہزار فی پونڈ ہو گیا ہے قیمتوں میں اس اضافہ کے چند روز بعد ہی اطلاع ملی کہ امریکہ جرمنی کو ایک مشروط قرضہ دینے کے لئے تیار ہے اور اس کی گفت و شنید ہو رہی ہے۔ مارک اسی روز ۳۵ ہزار ہو گیا، دوسرے روز ۳۰ ہزار اور آج تو ۲۴ ہزار ہے۔ لیکن کیا دکانداروں نے اپنی قیمتوں میں تخفیف کر دی؟ نہیں دکاندار پھر تیل کی دھار دیکھ رہا ہے۔ اگر مارک کی یہ ترقی جاری رہی تو ضرور تخفیف کرے گا لیکن یہ تخفیف اس نسبت سے نہ ہوگی جس سے مبادلہ میں فرق پڑا ہے آپ جانتے ہوں گے، اجرت کی طرح قیمت بھی جس طرح بڑھنے میں جھجکتی ہے اس سے زیادہ تخفیف میں متردد ہوتی ہے۔ غرض یہ کہ آپ لوگ

پانیر میں نرخ مبادلہ پڑھ کر یہاں کے اخراجات کے گھٹنے بڑھنے پر ذرا جلد حکم نہ لگائیں۔ یہاں کی معاشی کیفیت اس درجہ پیچیدہ ہے کہ چند روز قبل بھی کوئی صحیح اندازہ کرنا بہت مشکل ہے لیکن اس تمام گفتگو کا مقصد یہ نہیں کہ یہاں خرچ زیادہ ہے۔ بہت بڑھنے پر بھی یہاں جتنے مصارف ہیں ان میں یہاں کی سی تعلیم دراصل کوڑیوں کے مول ہے۔ مثلاً سنئے کہ اس گرانی اور مبادلہ کے اتار چڑھاؤ کا اثر مجھ پر کیا پڑا۔ نومبر میں ہمارے فیملی[1] والوں نے رہنے اور کھلانے کے لئے ہم سے ایک پونڈ (۱۵ روپیہ) فی کس وصول کیا تھا۔ گرانی جو ہوئی اور قیمتیں دوگنی سہ گنی ہو گئیں تو اس مہینہ میں دو پونڈ (۳۰ روپیہ) کا مطالبہ ہے۔ لیکن یورپ میں رہنے اور کھلانے پر اگر ۳۰ روپیہ ماہوار صرف ہو گئے تو کون بہت ہیں۔ میں یاد کرتا ہوں کہ آتے وقت بمبئی میں ہوٹل والے کو محض قیام کے لیے ۵ روز میں ۱۵ روپیہ دینے پڑے تھے تو کس قدر متعجب ہوتا ہوں۔

خیر یہ تو طویل داستان ہے۔ میں جزئیات میں پڑے بغیر یہاں کے مصارف کے متعلق اپنی رائے بتا دوں تو بہتر ہے۔ میری رائے میں ہر شخص جو یہاں آئے اُسے ۶ پونڈ (۹۰ روپیہ) ماہانہ کا انتظام یقیناً کر لینا چاہیئے۔ بہت ممکن ہے کہ اس سے کم خرچ میں وہ کئی مہینہ یہاں گزارے لیکن تمام زمانہ قیام کو اگر مد نظر رکھا جائے تو اوسط یہی پڑے گا۔ جو اسباب یہاں کی زندگی کو اس قدر ارزاں بنا رہے ہیں ان کی ذرا سی مخالف رفتار ہی اس کو گراں بھی کر سکتی ہے اور پھر یہ نہایت غیر متوقع طور پر عمل پیرا ہونے لگتے ہیں۔ میں نے ہر شخص کے مصارف کے متعلق یہی مشورہ دیا ہے اور مجھے امید ہے کہ یہ مشورہ صحیح ہوگا۔ یہاں یہ مصارف ادبی تعلیم کے لئے ہیں صنعتی تعلیم کے لیے آیندہ خط میں لکھوں گا۔

[1] جس خاندان میں آج کل میرا قیام ہے۔

(۲)

برلن

۲ جنوری سنہ ۲۳ء

صنعتی تعلیم | جرمنی میں صنعت کی تعلیم کے لیے بہترین انتظام یہاں کے ٹکنکل ہائی اسکول میں ہوتا ہے یہ دراصل یہاں کی صنعتی یونیورسٹیاں ہیں جن میں تقریباً ہر صنعت درجۂ تکمیل تک سکھائی جاتی ہے، یونیورسٹی میں اول تو اکثر صنعتوں کی تعلیم ہوتی نہیں اور جن کی ہوتی بھی ہے مثلاً انجینیرنگ اس میں بھی ٹکنکل ہائی اسکول کی سند یونیورسٹی پر ترجیح رکھتی ہے۔

مختلف صنعتوں کے لئے مختلف مدت کا کورس ہے جو دریافت کرنے پر معلوم ہو سکتا ہے۔ البتہ مجھے دباغی کے متعلق کچھ معلومات اس لئے ہیں کہ ایک حیدرآبادی صاحب اس میں داخلہ کا انتظام کر رہے تھے انھوں نے یہ بتلایا تھا کہ ٹکنکل ہائی اسکول میں تین سال کا کورس ہے اور ٹکنکل ہائی اسکول نے ان سے سو پونڈ سالانہ بطور فیس کے طلب کئے ہیں یہاں صنعتی تعلیم کی فیس پونڈ اور ڈالر میں مقرر ہو گئی ہے اور مقابلۃً بہت گراں ہے، رنگ سازی کے متعلق معلوم کر کے آئندہ کسی خط میں لکھوں گا داخلہ میں کسی ڈگری کی سخت قید نہیں ہاں ایف اے پاس ہوں تو اچھا ہے آسانی ہوگی۔

یونیورسٹی | یہاں یونیورسٹی میں علوم کی صرف ایک ڈگری ہے یعنی 'پی۔ ایچ۔ ڈی' اس کے لئے یونیورسٹی میں اوسطاً ۳ سال قیام ضرور ہے، اگرچہ یہاں کی یونیورسٹیوں میں یہ مدت کی قید اس قدر سخت نہیں جتنی کہ انگلستان میں ہے، اساتذہ کے اختیارات زیادہ ہیں اور ان کی سفارش پر اس مدت میں تخفیف بھی ہو جاتی ہے۔ لیکن صرف اس وقت کہ طالب العلم نے اپنے مضمون پر کوئی تصنیف تیار کر لی ہو اور استاد اس سے مطمئن ہو، امتحان کا قاعدہ یہ ہے کہ ایک خاص مضمون منتخب کر کے اپنے استاد کی زیر نگرانی اس پر ایک محققانہ تصنیف کرنی پڑتی ہے اس کے علاوہ دو مضمون اور لینا ہوتے ہیں جن میں سے ایک فلسفہ ہوتا ہے ان دو مضامین کا معیار بہت بلند نہیں ہوتا لیکن پھر بھی آسان نہیں ~~جیسے~~ تصنیف کے موضوع پر عالمانہ اور محققانہ مطالعہ مطلوب ہوتا ہے۔

اس لیے یہ امید کرنا کہ اس تین سال کی مدت میں تصنیف بآسانی ناممکن ہے غلط ہوگا، اکثر تین سال بلکہ اس سے زیادہ ہی زمانہ ڈگری کے لئے درکار ہوگا۔ پھر کم سے کم چھ ماہ زبان سیکھنے کے لیے درکار ہیں تاکہ آدمی لکچر سمجھ سکے، گویا ہر آنیوالے کو اوسطاً چار سال کے لئے یہاں رہنے کی تیاری کرنا چاہیئے۔ رہا داخلہ کا معاملہ تو یونیورسٹی میں پہلے بی۔ اے کی قید تھی، امسال ایف اے بھی داخل کر لئے گئے ہیں، جامعہ کا بی اے یا ابتدائی امتحان بشرطیکہ صداقت ناموں میں یہ درج ہو کہ یہ ایف اے کا مرادف ہے داخلہ کے لئے کافی ہوگا۔ بعض حضرات دریافت کرتے ہیں کہ جرمنی زبان کی شرط ہے یا نہیں؟ جناب یہ ہندوستان نہیں جہاں کی تعلیم میں سب شرطیں ہیں صرف ہندوستانی جاننا شرط نہیں! یہاں تمام لکچر جرمن میں ہوتے ہیں "تصنیف" جرمن زبان میں ہوتی ہے، حوالہ کی کتابوں کا تقریباً سارا ذخیرہ جرمن میں ہے۔ پھر جرمن زبان کی شرط نہ ہونا کیا معنی؟

یہ مقام مسرت ہے کہ اب ہندوستانی بھی جرمنی آنے کا خیال کر رہے ہیں، لیکن بس دعا یہ ہے کہ وہ لوگ یہاں آنے کا قصد کریں جن کے خیالات اور ذہن کی نشو و نما اگر مکمل نہیں تو تقریباً مکمل ہو چکی ہو۔ ہر شخص کا یہاں آنا ممکن ہے کہ اس کے لئے واپسی پر کچھ کما لینے کا ذریعہ ہو جائے لیکن قومی اور ملکی حیثیت سے گویا اُن کا ہاتھ سے بالکل نکل جانا ہے۔ میں جس وقت یہ لکھ رہا ہوں تو میری آنکھوں کے سامنے ان کثیر التعداد ہندوستانی نوجوانوں کی شکلیں ہیں جو جرمنی میں صرف اپنا پیسہ اور وقت ہی نہیں برباد کر رہے ہیں بلکہ اپنی حرکتوں سے اپنے اخلاق کو ہمیشہ کے لئے فنا اور اپنے ملک کی آبروریزی کر رہے ہیں۔ اسلئے وہ لوگ جو صرف یہاں کے مصارف کی کمی کے خیال سے آنا چاہتے ہیں وہ بہتر ہے کہ نہ آئیں۔ ہاں جن لوگوں نے اپنے لئے کوئی مقصد سوچ لیا ہے اور اب اسکے حصول میں یہاں کی ارزانی کی وجہ سے سہولت پیدا ہوگئی ہے تو وہ بیشک اس صورت حال سے فائدہ اُٹھائیں، میں اپنے پچھلے خط میں یہاں کے مصارف کے متعلق تفصیل سے لکھ چکا ہوں۔

راستہ | راستہ اور ضروریات کے متعلق میرا تجربہ یہ ہے کہ پی۔ او لائن سے نہ آئیں "لائیڈ ٹرسٹینو" سے یا کولمبو سے جو جہاز ہمبرگ آتے ہیں اُن سے آئیں، اگر مضبوط آدمی ہیں تو تیسرے درجہ کا سفر کر سکتے ہیں

تکلیف ضرور ہوتی ہے لیکن روپیہ بہت بچتا ہے یعنی تقریباً ۴ پونڈ جو یہاں سال بھر کے واسطے خرچ کے لئے ممکن ہے کہ کافی ہو جاوے ورنہ چھ مہینہ میں تو شک نہیں۔ سامان بہت نہ لائیں، دو سے زیادہ سوٹ کی یہاں کوئی ضرورت نہیں، ذرا اچھے مضبوط کپڑے کے ہوں وہیں سلوالیں یا یہاں آکر ایک خریدلیں اور ایک وہاں سی بنوالے لائیں، رات کے پہننے کے لئے معمولی چار پانچ جوڑے کپڑے لائیں اور چھ قمیصیں۔ انہیں بھی کمی کر سکتے ہیں، اور یہاں آکر لے سکتے ہیں، پاسپورٹ اور ویزا جرمنی کا پہلے سے حاصل کر لینا چاہیئے ورنہ بہت دقت اور پریشانی ہوتی ہے اور بہت ممکن ہے کہ عرصہ تک ادھر اُدھر ٹھوکریں کھانا پڑے۔

مغرب میں مشرقی مبلغ

مولانا صاحب کی تشریف آوری کے متعلق مجھے کوئی اطلاع نہیں ملی اور نہ اُنکے یا دیگر مبلغین کے ورود مسعود میں مجھے زیادہ دلچسپی ہے، ہاں یہ خبریں سُنکر دل ہی دل میں کڑھتا ہوں، بھلا جنکے گرد و پیش اور بہت ہی قریب کفر و ضلالت کی کالی سے کالی گھٹائیں چھائی ہوں اور جن کے پیر تلے کی زمین کا ہر ذرہ تعلیم حق کا پیاسا ہو وہ کیوں ہزاروں میل کا سفر کر کے اس مظلوم اور پریشان ملک ہی کو اپنا تجلی گاہ بنانے پر مصر ہیں؟ یہاں کا کفر نہ معلوم ان لوگوں کے لئے کیوں اتنی کشش اپنے اندر رکھتا ہے۔ میں پچھلے دو تین جملے لکھکر سوچنے لگا کہ آپ ان ہی اس نتیجہ پر پہنچینگے کہ اس معاملہ پر میں ایک دُکھے ہوئے دل کی سی آواز دیتا ہوں۔ یہ خیال صحیح ہوگا۔ میں جب ہندوستان سے چلا تھا تو یہ سوچکر چلا تھا کہ بالکل طالب علمانہ زندگی کے چند سال گزار کر اپنے ملک کو واپس آجاؤنگا۔ یہاں آکر میرا یہ خیال اور پختہ ہو گیا۔ یہاں میں نے "مبلغین اسلام" اور مجاہدین فی سبیل اللہ بھی دیکھے اور ملکی معاملات میں سخت سی سخت انقلاب پسند حضرات کو بھی دیکھا لیکن جسے چکھا کڑوا پایا۔ سب اپنی اپنی دال روٹی کی فکر میں ہیں، کوئی تبلیغ کے نام سے روپیہ وصول کرتا ہے کوئی روس سے مدد کی فکر میں ہے کوئی ان کمیونسٹ ہے کہ انڈین نیشنل کانگریس سے کچھ وصول کرے کوئی کچھ کرتا ہے کوئی کچھ بیشک خدا کی صفت عفو اس کی قہاری سے زیادہ ہے کہ ان لوگوں کو اپنے نام سے یہ سب کچھ کرنے دیتا ہے۔ تھوڑے دن ہی میں سب کا حال معلوم ہو گیا، اب میں اطمینان سے اپنے کام میں مصروف ہوں۔ کبھی کبھی فرصت کے وقت اکبر مرحوم کا یہ شعر پڑھ لیتا ہوں ؎

تو خاک میں مل اور آگ میں جل جب خشت بنے تب کام چلے — ان خام دلوں کے عنصر پر بنیاد نہ رکھ تعمیر نہ کر

رویائے صادقہ

مولوی اقبال احمد صاحب سہیل، ایم اے، ال ال بی، وکیل

شب کہ تھا دل کثرتِ آلامِ دنیا سے فگار
خستگی سے بار بستر ہو رہا تھا جسم زار

فرطِ بیتابی سے آخر ہو گیا پیدا سکوں
کثرتِ فریاد سے چپ لگ گئی انجام کار

کنجِ تنہائی میں آخر مجھکو نیند آ ہی گئی
بیخودی نے بے حسی کی شکل کر لی اختیار

سو گیا جب میں تو جاگ اٹھے مرے سوئے نصیب
آنکھ لگتے ہی ہوئی روشن نگاہِ انتظار

جیتے جی میں نے وہ دیکھا خواب میں جسکو کبھی
مر کے بھی شاید نہ دیکھے زاہدِ شب زندہ دار

لے گئی مجکو کراچی کی طرف پروازِ شوق
وہ کراچی جس کی شعریت پہ سودیوان نثار

جس کا ہر گوشہ ریاضِ خلد کا پہلو نشین
جس کا ہر ذرہ حریمِ قدس کا آئینہ دار

وہ کراچی جس کا گلشن سنبلستاں در بغل
وہ کراچی جس کا محبس یوسفستاں در کنار

سبعہ سیارۂ قومی کا دار الابتلا
جاں نثارانِ وطن کا امتحاں گاہِ وقار

جس میں ہیں دو شیرِ حق محبوسِ زندانِ فرنگ
جلوہ فرما جس میں ہیں سعدین برجِ اقتدار

تا درِ زنداں پہونچکر کیا کہوں جو حال تھا
ہو رہا تھا دل ہجومِ شوق میں بے اختیار

سوے زنداں پھاڑ کر دامن بڑھا دیوانہ وش
تاکہ ان قدموں پہ جا کر نقدِ جاں کر دوں نثار

بیخودیِ شوق میں ان بیڑیوں کو چوم لوں
حور کا خلخال جن کے حسنِ معنی پر نثار

صورِ محشر سے نہیں کم جن کا شورِ الغیاث
عرشِ اعظم تک پہونچتی رہتی ہے جن کی پکار

دیکھکر میرے جنونِ شوق کی بے تابیاں
حاجبِ زنداں پکارا کون ہے؟ ہاں ہوشیار!

امتحاں گاہِ محبت ہے یہ زندانِ بلا
اس حریمِ فیض میں ملتا نہیں غیروں کو بار

یہ شرف مخصوص ہے اہلِ تقرّب کے لئے
خاص ہے منصور و سرمد کے لئے معراجِ دار

عینِ بیتابی میں جب درباں نے روکا اس طرح
ہو گئیں محرومیِ قسمت پہ آنکھیں اشکبار

چشمِ گریاں کے تصدق! دیدۂ دل کھل گیا — دُھل گیا اشکِ ندامت سے مرے دل کا غبار

ہو گئیں نظارۂ زنداں سے آخر بہرہ ور — میری آنکھیں توڑ کر دیوارِ زنداں کا حصار

دیکھتا کیا ہوں کہ اک گوشہ اسی زنداں کا ہے — جس پہ صدقے ہو رہی ہے باغِ جنت کی بہار

ایک اُطاقِ دلکشا ہے رشکِ ایوانِ شہی — صدر میں جس کے بچھا ہے ایک تختِ زرنگار

ہو رہی تھی آسماں سے جس پہ بارش نور کی — چار جانب جس کے تھا حفظِ الٰہی کا حصار

مسند آرا اس پہ ہیں دونوں اسیرانِ بلا — جن کے چہروں سے جلالِ خسروی ہے آشکار

جس کو طوقِ آہنی سمجھی تھی چشمِ ظاہری — ہے حقیقت میں وہ ایک فردوس کے پھولوں کا ہار

ہاں مگر سینوں سے اُنکے اٹھ رہا ہے اک دھواں — جگمگاتے جن میں جگنو کی طرح ہیں کچھ شرار

رقص کرتا جا رہا ہے یہ دھواں سوئے فلک — کوئے لیلےٰ کو چلے جس طرح قیسِ بے قرار

یہ تماشا دیکھ کر میں دم بخود سا رہ گیا — اس قدر دلکش تھا یہ نظارۂ آتش بہار

میں بھی جا لپٹا اسی دودِ فلک پرواز میں — کوئی تنکا جس طرح دوشِ صبا پر ہو سوار

دم زدن میں وہ دھواں القصہ پہنچا تا سپہر — اور پہنچتے ہی کھُلا دروازۂ نیلی حصار

دیکھ کر مجھکو فرشتوں نے پکارا۔ دور باش! — تو کجا اے ننگِ ہستی اور کجا یہ جلوہ زار؟

ناگہاں آواز آئی غیب سے آنے بھی دو — نامراد اس در سے پھر سکتا نہیں امیدوار

خود بھی تر دامن سہی، آخر ہے کس کا ہمرکاب — پھول کے پہلو میں آکر آبرو پاتا ہے خار

گیر و دارِ حاجباں سے اس طرح پا کر نجات — میں بڑھا اس دودِ رقصاں کی طرف مستانہ وار

الغرض طے کر کے دم بھر میں حجاباتِ فلک — ساحتِ فردوس میں پہنچا وہ دودِ شعلہ بار

پیشوائی کے لئے تھے یاں ملائک منتظر — محترم مہماں کا ہو جیسے کسی کو انتظار

حوریں کرتی تھیں تصدق اُن پہ گلہائے ارم — اور قدسی کر رہے تھے گوہرِ انجم نثار

آگے آگے دودِ آہِ مستمنداں محوِ رقص
پیچھے پیچھے قدسی و حور و ملائک کی قطار

اس طرح بابِ اجابت کو چلا اس کا جلوس
جیسے دار السلطنت میں ہو جلوسِ شہریار

تا سوادِ لامکاں جس وقت پہونچا یہ دھواں
بزمِ لاہوتی سے آئی اک نسیمِ خوشگوار

اس نسیمِ روح پرور کے اثر سے یہ دھواں
چھا گیا ہر سو فضا میں بن کے ابرِ نو بہار

اور جو تھیں اس آہِ مظلوماں میں کچھ چنگاریاں
مل کے باہم بن گئیں سب ایک برقِ شعلہ بار

دیر تک چھائی رہی یوں ہی وہ رحمت کی گھٹا
گو کبھی تھم تھم کے پڑ جاتی تھی ایک ہلکی پھوار

پھر چلی اک بادِ تند اور جھوم کر برسی گھٹا
اور رہ رہ کر لگی بجلی چمکنے بار بار

دیکھ کر یہ برق و باراں کا سماں دل نے کہا
دیکھیں اس آغاز کا ہوتا ہے کیا انجامِ کار

بارشِ رحمت کا دیکھیں کس پہ ہوتا ہے نزول
کس پہ گرتی ہے یہ بجلی بن کے قہرِ کردگار

کر رہا تھا میں یہی باتیں دلِ بے تاب سے
دفعۃً مجکو نظر آیا سماں کا دِیار

دیکھتا کیا ہوں کہ اک ہنگامۂ محشر ہے گرم
آ رہی ہے ہر طرف سے اک صدائے گیر و دار

چار سو سے ہی حصارِ جیشِ ترکی اس طرح
قوم یوناں کو کہیں ملتی نہیں راہِ فرار

وہ جو بارش ہو رہی تھی آسماں سے نور کی
جس کی ہر اک بوند تھی در اصل دُرِ شاہوار

زینتِ طربوشِ ترکاں ہو رہے ہیں یہ گہر
کر رہا ہے آسماں، گلدستۂ نصرت نثار

بجلیاں یونانیوں پر گر رہی ہیں پے بہ پے
جس سے روشن ہوتی جاتی ہے نگاہِ اعتبار

محوِ نظارہ تھا میں ناگاہ یہ آئی صدا
"آگئی صبحِ مسرت سونے والو ہوشیار"

یہ صدا سن کر یکایک میری آنکھیں کھل گئیں،
پھر وہی میں اور وہی ہنگامۂ لیل و نہار

نوائے غم

از نتائج قلم جناب مولانا رضا علی صاحب وحشت

ستم برپا کیا پھر اے دل ناشادماں تو نے
کہ چھیڑی عہد ماضی کی غم افزا داستاں تو نے

ری غفلت پرستی نے رکھا محو طرب مجھ کو
سنی گو بارہا بانگ درائے کارواں تو نے

ری تفریح دم بھر کی ترا سرمایۂ عشرت
نہ پایا بے خبر ذوق نشاطِ جاوداں تو نے

سمجھا معنئ نفع ضرر بازار ہستی میں
ہوائے سود میں دیکھا فقط روئے زیاں تو نے

ری لائی ہوئی تھی، جو بلا ٹوٹی ترے سر پر
عبث چھیڑا ہے یہ ذکر جفائے آسماں تو نے

وئی ہمدرد بھی دیکھا؟ کوئی غم خوار بھی پایا؟
سبھوں کو تو سنائی درد و غم کی داستاں تو نے

ربانِ آفرینِ خلق سے کچھ کام بھی نکلا؟
دکھائیں تو زمانے کو بہت نیرنگیاں تو نے

ہ دیکھی کیا کوئی خوبی بہارِ لالہ و گل میں
کہ گلشن سے اڑایا جاکے بس رنگِ خزاں تو نے

صیبت کیا پڑی تجھ پر کہ گویا دست و پا ٹوٹے
دکھائی سخت کمزوری بوقت امتحاں تو نے

ی ہوگا کہ آلودہ کریگا خاک اقدس کو
اگر پیدا کیا شوقِ سجودِ آستاں تو نے

بھرنے کی کوئی صورت نہیں بحرِ معاصی سے
ڈبویا لاکے مجھکو اے خرد دشمن کہاں تو نے

مجھے تو خود نظر آتا ہی تو اک خاک کا تودہ
گرائی کس پہ یہ برق نالۂ آذر فشاں تو نے

ری فریاد نے کھینچا دل شیخ و برہمن کو
طلسم تازہ باندھا وحشتؔ جادو بیاں تو نے

کوئی کہے تو کیا کہے

نتیجہ فکر مولانا محی الدین تمنا عمادی پھلواروی پرفیسر پٹنہ یونیورسٹی پٹنہ

جو نہ سُنے نہ کہے سے بھی اُس سے کہے تو کیا کہے
اُس کو سُناؤں دردِ دل اُس نے جو سب بلا کہے

آہ کو بے اثر کہے - نالے کو نارسا کہے
عاشقِ باوفا مگر تم کو نہ بے وفا کہے

بُلبلیں چیختی رہیں - پھولوں کو کیا؟ وہ کیوں سُنیں؟
یہ تو سُنیں گے بس وہی کانوں میں جو صبا کہے

شیخِ حرم جو سے تھے کبھی ٹھیرے وہ رندِ پختہ کار
سارے جہان میں جنہیں ہر کوئی پارسا کہے

خونِ وفا بھی رات دن کرتے رہو جہاں تہاں
اس پہ ستم کہ روٹھ جاؤ، کوئی جو بے وفا کہے

ماہ کہے تو کچھ نہیں - مہر کہے تو کچھ نہیں،
چاہتے ہیں یہ بت کہ اب ان کو کوئی خدا کہے

عرصۂ گفتگو ہے تنگ، قصّۂ دردوغم دراز
کوئی سُنے تو کیا سُنے، کوئی کہے تو کیا کہے

ہم غمِ دل کو سمجھیں راز - ڈرتے رہیں کہ ہو نہ فاش
اور رخِ زرد یوں اُسے خلق میں برملا کہے!

قاصد نابلد کرے مبحثِ عشق کو نہ خلط
شکوۂ غم، پیامِ شوق، اُن سے جدا جدا کہے

میری زباں سے عرضِ شوق ٹھیری ہے ناشنیدنی
آپ سنیںگے شوق سے گر یہی دوسرا کہے

یاد ہیں اے محی ہمیں راتوں کی وہ عبادتیں
ہائے تم اور شغل مے! کوئی سُنے تو کیا کہے!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جامعہ

جلد ۱ شعبان المعظم ۱۳۴۱ھ مطابق اپریل ۱۹۲۳ء نمبر ۴

راہِ عمل

(برٹرنڈ رسل کی کتاب "ہیئت اجتماعی کی تعمیر نو" کے آخری باب سے اقتباس)

ہم ذیل میں انگلستان کے مشہور فلسفی اور ریاضی داں برٹرنڈ رسل کی کتاب "ہیئت اجتماعی کی تعمیر نو"[1] کے آخری باب کا تفصیلی اقتباس درج کرتے ہیں۔ رسل کی خصوصیت امتیازی یہ ہے کہ وہ جہاں فلسفہ اجتماع کا ماہر ہے وہاں ریاضی میں بھی استعداد تام رکھتا ہے۔ اکثر اجتماعیین کی تحریروں میں صفائی اور اہتمام صحت کمیاب ہوتا ہے۔ نفس انسانی کی ترکیب میں اتنے لاتعداد عناصر کی آمیزش ہے کہ ان کی حکیمانہ تجزی کے لیے نہایت مرتب دماغ درکار ہے۔ رسل کا دماغ اس ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ چنانچہ مسائل اجتماعی پر ان سے زیادہ سلجھی ہوئی رائے رکھنے والا اور کوئی شخص یورپ میں مشکل سے ملے گا۔ رسل دارالعلوم کیمبرج میں ریاضی کا درس دیتے تھے کہ آغاز جنگ پر جنگ کی مخالفت اور فوجی خدمت سے انکار کے باعث محبوس کر دیے گئے جس کتاب سے ذیل کا اقتباس ہدیہ ناظرین کیا جاتا ہے یہ ان خیالات کا نتیجہ ہیں جو جنگ نے رسل کے دماغ میں پیدا کیے۔ تعمیر نو کے روز افزوں تحریروں میں اس کتاب کو نہایت اہم درجہ

---

[1] Allen & Unwin & Co. "Principles of Social Reconstruction"

حاصل ہی۔ اور اس کتاب میں نیز اپنی دوسری کتاب "آزادی کی راہیں"[a] میں جو خیالات مصنف موصوف نے ظاہر کیے ہیں اور انکا جو اثر عام دماغی رجحانات پر ہوا ہی اس کی بنا پر انھیں تعمیر نو کا اخلاقی راہنما کہنا بیجا نہ ہوگا۔

رسل نے ان کتابوں میں محرکات اجتماعی کا ایک بالکل جدید فلسفہ پیش کیا ہی۔ اس جدید فلسفہ میں رسل نے اصول نمو پر بہت زور دیا ہی اس کے نزدیک اعمال انسانی پر ارادہ اور خواہش شعوری کے بہ نسبت ہیجان کا زیادہ اثر ہے۔ چنانچہ اس کے خیال میں وہی نظام اجتماعی صحیح اور عمدہ ہی جس کی ساخت ایسی ہو کہ فطرت انسانی کے ان ہیجانات کو مفید کاموں میں صرف کیا اور ضرر رساں اعمال سے محترز رکھے۔ وہ کہتا ہی "صرف یہی کافی نہیں کہ ہم اپنی شعوری آرزوئیں کو بدل دیں، ضرورت اس کی ہی کہ ہماری ہیجانی زندگی میں تغیر پیدا ہو"۔

ایسی جماعت کی ترتیب کے لیے ملکیت شخصی کے اصول میں بڑی تبدیلی کی ضرورت ہی۔ اشتراکیین بھی ملکیت شخصی کو مٹا کر حکومت کی ملکیت قایم کرنا چاہتے ہیں۔ رسل کا رجحان جماعت کے نزاجی (Anarchistic) نشو و نما کی طرف ہی۔ وہ حکومت کو ہر چیز کا مالک نہیں بنانا چاہتا۔ اور اس طرح اشتراکیین سے مختلف ہی۔ وہ علوم و فنون کے معاملہ میں حکومت کے اختیارات میں اضافہ کو نہایت مشتبہ نظر سے دیکھتا ہی۔ لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ رسل بالکل نزاجی[b] نشو و نما کی طرف ہے اس کے خیال میں حریت کے نقطۂ نظر سے نزاجی اصول بہتر ہی اور لوگوں کو کام کرنے پر آمادہ کرنے کے لیے اشتراکی اصول۔ اور رسل نے اپنی کتابوں میں کوشش کی ہی کہ ان دونوں میں ایک میانہ راستہ نکالے۔ مسائل اجتماعی سے دلچسپی رکھنے والوں کے ان کتابوں کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔ کاش دونوں کتابوں کا ترجمہ اُردو زبان میں شائع ہو جاتا۔

(ذاکر)

---

[a] Roads to Freedom

[b] Anarchistic

ہم اپنی زندگی میں دنیا کے لیے کیا کر سکتے ہیں؟

بہت سے لوگ ہیں، مرد اور عورتیں، جو نوع انسانی کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن یہ سب پریشان ہیں اور ان کی قوت کیسی بے وقعت اور کس درجہ قلیل معلوم ہوتی ہے! بالآخر یاس انھیں آ دباتی ہے۔ اور وہ جن میں جذبۂ خدمت سب سے قوی ہوتا ہے، وہی اس احساس بیچارگی سے سب میں زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ اور فقدان امید کے باعث روحانی تباہی کا احتمال انھیں میں سب سے زیادہ ہوتا ہے۔

اگر ہم محض مستقبل قریب کو پیش نظر رکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہم جو کچھ کر سکتے ہیں وہ چنداں زیادہ نہیں۔ مثلاً ہمارے لیے غالباً یہ ناممکن ہے کہ ہم جنگ کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیں۔ اسی طرح ہم حکومت یا ملکیت شخصی کی مضبوط طاقت کو بھی تباہ نہیں کر سکتے، نہ ہم اسی دم تعلیم میں نئی روح پھونک سکتے ہیں ان معاملات میں اگرچہ ہم خرابی کو دیکھ لیں لیکن سیاسیات کے معمولی طریقوں سے انکا کوئی فوری علاج ممکن نہیں۔ ہمیں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ دنیا پر ایک غلط روح کا تسلط ہے اور اس روح میں آج سے کل تک کوئی تغیر نہیں ہو سکتا۔ ہماری امیدیں، ہماری توقعات، کل کے لیے نہ ہونی چاہئیں بلکہ ہمیں اس زمانہ کا خیال کرنا چاہیے جب وہ خیالات جو آج معدودے چندہ ماغوں میں ہیں پھیل کر اکثریت کا مشترک خیال بنجائیں گے۔ ہم میں اگر جرأت ہے اور صبر تو ہم وہ خیالات سوچ سکتے اور ان امیدوں کو محسوس کر سکتے ہیں جو جلدیا بدیر انسانوں میں روح پھونکینگی۔ اور جن سے پژمردگی اور مایوسی، قوت اور ولولہ میں تبدیل ہوجائے گی۔ اس لیے ہمیں جو پہلا کام کرنا ہے وہ یہ ہے کہ خود اپنے ذہن میں صاف طور پر معلوم کر لیں کہ ہم کس قسم کی زندگی کو اچھا سمجھتے اور دنیا میں کسی نوع کی تبدیلی کے آرزو مند ہیں۔

زندگی بخش اور حیات پرور خیالات رکھنے والوں کی آخری قوت اس سے کہیں زیادہ ہے جتنی سیاست حاضرہ کی نامعقولیت کے شکار انسانوں کو معلوم ہوتی ہے۔ مذہبی رواداری ایک زمانہ میں چند باہمت فلسفیوں کا محض ایک تخیل تھا نظری حیثیت سے حکومت جمہوری کا خیال کرامول کی فوج کے مٹھی بھر آدمیوں میں پیدا ہوا۔ اعادہ شاہی (رسٹوریشن) کے بعد یہ لوگ اسے امریکہ لے گئے، جہاں جاکر یہ جنگ آزادی میں یہ اپنا پھل لایا۔ لافایٹ اور دوسرے فرانسیسی، جو واشنگٹن کے دوش بدوش لڑے تھے، اس نظریۂ جمہوریت کو امریکہ سے فرانس لائے، جہاں روسو کی تعلیم سے مل کر یہ انقلاب کی روح رواں بنا۔ اسی طرح اشتراکیت ہے، کہ ہم اس کے محاسن کے متعلق کچھ ہی سمجھیں، اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ یہ ایک بڑی اور نمو پذیر قوت ہے جو سیاسی اور معاشی زندگی کی کایا پلٹ کر رہی ہے۔ یہ اشتراکیت اپنے وجود کے لیے چند منتشر نظریئین کی رہین منت ہے۔ عورتوں پر جبر و تحکم کے خلاف تحریک، جو آج ناقابل دفاع ہو گئی ہے اور کامل فتحمندی سے کچھ بہت دور نہیں، یہ بھی اسی طرح چند میری وولسٹانیکرافٹ شیلی، جان اسٹوارٹ مل جیسے غیر عملی متخیلین سے شروع ہوئی۔ خیال کی قوت بالآخر تمام انسانی قوتوں سے بڑی ہے۔ اور جن لوگوں میں صلاحیت فکر اور انسانی ضروریات کے مطابق فکر کے لیے تخیل موجود ہے وہ غالباً کبھی نہ کبھی اپنا مقصد ضرور حاصل کر لیں گے۔ اگرچہ ظن غالب ہے کہ اپنے جیتے جی ایسا نہ کر سکیں۔

ہاں۔ جو لوگ دنیا کو قوت خیال سے فتح کرنا چاہتے ہیں انھیں فی الحال دنیا کی مدد سے سبکدوش ہونے پر قناعت کرنی چاہیے۔ کیونکہ اکثر لوگ اپنی راہ زندگی پر بلا بحث سے سوال کیے گزر جاتے ہیں، جن عقائد و اعمال کو رائج پاتے ہیں انہیں قبول کر لیتے ہیں، اور محسوس کرتے ہیں کہ اگر ہم دنیا کے مخالف نہ بنیں تو دنیا ہماری معاون بن جائے گی۔ لیکن دنیا کے متعلق ہر نئے خیال کو اس آرام دہ جذبہ تسلیم سے بیر ہے۔ اس کے لیے ایک طرح کی ذہنی

علیحدگی، ایک تنہا قوت، اور داخلی طور پر دنیا اور اس کے آفریدہ مطمح نظر پر حاوی ہونے کی طاقت درکار ہے۔ تنہائی پر تھوڑی سی آمادگی بغیر فکر جدید اور خیالات تو ممکن نہیں۔ لیکن اگر یہ تنہائی اور علیحدگی، جدائی اور انقطاع کی ہمرکاب ہوئی تو اس کا حصول بے سود ہوگا۔ مثلاً اگر دوسروں سے اتحاد کی خواہش اس علیحدگی کے باعث فوت ہو جائے یا ذہنی تنہائی کے سبب سے دوسروں کی تحقیر پیدا ہو۔ یہ مطلوبہ دماغی کیفیت چونکہ نہایت نازک اور دشوار ہے، چونکہ یہ مشکل ہے کہ انسان ذہنی طور پر ذرا الگ ہو لیکن بالکل قطع نہ ہو جائے، اس وجہ سے معاملات انسانی پر بار آور خیال و فکر عام نہیں اور اسی باعث سے اکثر نظریے یا تو محض رہی ہیں یا بے نتیجہ۔ لیکن ہر چند یہ صحیح فکر کمیاب بھی ہے اور دشوار بھی مگر غیر موثر ہرگز نہیں۔ اور اگر ہم میں دنیا کے اندر نئی امیدوں کے لانے کی خواہش ہے تو ہمیں عدم تاثیر کے خیال سے فکر سے منہ نہ موڑنا چاہیے۔

اگر کسی ایسے سیاسی نظریہ کی تلاش ہو جو کسی موقع پر مفید ثابت ہو سکے تو اس کے لیے ایک خیالی بے عیب دنیا کے اختراع کی ضرورت نہیں، بلکہ حرکت و رفتار کے لیے بہترین راہ اور سمت کا انکشاف ہے۔ ایک وقت میں جو راہ اچھی ہے ممکن ہے بظاہر اس راہ سے بالکل مختلف ہو جو کسی دوسرے وقت صحیح سمجھی جائے۔ مفید خیال وہ ہے جو زمانہ حاضر میں صحیح راہ کا اظہار کرے۔ لیکن صحیح سمت اور راہ کا فیصلہ کرنے میں دو اصول ہمیشہ عائد ہو سکتے ہیں :۔

اول یہ کہ افراد اور جماعتوں کے نمو اور حیات کو حتی الوسع ترقی دینی چاہیے۔

دوم یہ کہ جہاں تک ممکن ہو، ایک فرد یا جماعت کی نشو و نما دوسرے افراد یا جماعتوں کو نقصان پہنچا کر عمل میں نہ آئے۔

. . . .

ان دونوں اصول کو پورا کرنے کے لیے ضرورت ہے پہلے تو حیات انفرادی میں ایک جدت پیدا کرنے کی، اور پھر شخصیت انفرادی کو قربان کیے بغیر حیات اجتماعی اور نیز تمام

دنیامیں اسی وحدت کے وجود کی۔ تاکہ ایک فرد ایک جماعت، یا خود ساری نوع انسانی کی زندگی
بہت سے جدا جدا اجزا پر مشتمل نہ ہو بلکہ کسی معنی میں خود ایک کُل ہو۔ ایسی حالت میں ایک فرد
کی نشو ونما دوسرے کی نشو ونما میں حائل نہیں ہوتی بلکہ اس سے مدد پاتی اور ترقی پذیر ہوتی
ہے۔ اور اس طرح مذکورہ بالا دونوں اصول باہم مطابق ہو جاتے ہیں۔

حیات انفرادی میں یہ وحدت ایک مستقل تخلیقی غرض یا غیر محسوس ہیجان سے پیدا ہوتی ہے
ایک مہذب مرد یا عورت کی زندگی میں یہ وحدت پیدا کرنے کے لیے خلقی جبلت کافی نہیں ہوتی
بلکہ اس کیلئے ضروری ہے ایک ہمہ گیر غرض، ایک حوصلہ، علمی یا جمالی تخلیق کی کوئی آرزو۔
کوئی مذہبی اصول، یا قوی اور پائدار جذبات اس مرد یا عورت کے لیے یہ وحدت حیات بہت
دشوار ہے جسے ایک قسم کی شکست نصیب ہو چکی ہو۔ اور وہ شکست یہ ہے کہ اسکی زندگی میں
جو ہیجان (Impulse) حاوی ہونا چاہیے تھا وہ رک کر پامال ہو جاتا ہے اکثر پیشے
انسان کو زندگی کے شروع ہی میں اس شکست سے دوچار کر دیتے ہیں۔ مثلاً کوئی شخص صحافت
کا پیشہ اختیار کرے تو اسے غالباً کسی ایسے اخبار کے لیے لکھنا پڑے گا جس کی سیاسیات سے
وہ نفرت کرتا ہے۔ اس طرح کام سے جو ولولہ اور فخر پیدا ہوتا وہ فوت ہو جاتا ہے، اور اسی کے
ساتھ احساس خودداری بھی۔ اکثر طبیب ہیں کہ بلا تھوڑی سی دھوکہ بازی اور دھونس کے
کامیاب نہیں ہو سکتے، چنانچہ جو کچھ تھوڑا بہت علمی ضمیر ان میں ہوتا بھی ہے وہ بھی غارت ہو جاتا
ہے۔ سیاسیین اپنی جماعت یا فرقہ کے پروگرام ہی کے پابند نہیں ہوتے بلکہ ساتھ ساتھ اپنے کو
بزرگ اور برگزیدہ بھی ظاہر کرنا پڑتا ہے، تاکہ مذہبی خیال والے ساتھیوں کی تسکین ہوتی
رہے۔ چنانچہ ہماری انگریزی پارلیمنٹ میں مشکل ہی سے کوئی شخص بلا ریاکاری کے پہنچ سکتا
ہے۔ پیشے انسان کے اس طبعی و فطری احساس نفس کی ذرا عزت نہیں کرتے، جس کے بغیر انسان
کامل انسان نہیں رہ سکتا۔ دنیا بے رحمی کے ساتھ اس جذبہ کو کوٹ کوٹ کر اس سے نکالتی ہے

اور یہ کیوں؟ صرف اس لیے کہ یہ عبارت ہے خودداری اور خود مختاری سے! اور انسانوں میں خود آزاد رہنے سے زیادہ قوی آرزو دوسرے انسانوں کو غلام بنانے کی ہے۔ یہ داخلی و نفسی آزادی ایک بیش قیمت جوہر ہے، اور وہ جماعت نہایت پسندیدہ اور آرزو کرنے کے قابل ہے جو اسے برقرار رکھے۔

انسان میں اصل نمو یہ لازم نہیں کہ کسی خاص عمل سے منع کرنے سے برباد ہو۔ بلکہ اکثر اس کی تباہی یوں عمل میں آتی ہے کہ اسے کوئی دوسری چیز کرنے پر آمادہ کر دیا جائے۔ نمو کے لیے تباہ کن وہ چیزیں ہوتی ہیں جو دل کے اندر ان چیزوں میں بے بسی کا احساس پیدا کر دیں جن میں انسان کا ہیجان حیات اپنا اثر دکھانا چاہتا ہے۔ ان میں بدترین چیزیں وہ ہیں جنھیں قوت ارادی تسلیم کر لیتی ہے۔ اکثر عدم خود شناسی کے باعث انسان کا ارادہ اس کے ہیجان سے ادنیٰ سطح پر ہوتا ہے۔ اس کا ہیجان ہوتا ہے کسی قسم کی تخلیق کی طرف، اس کا ارادہ اسے کسی رسمی پیشہ کی جانب لیجاتا ہے جس میں آمدنی اور اہل چشموں میں عزت کافی نصیب ہو......

اور چونکہ یہ ہیجان عمیق ہوتا ہے اور خاموش، چونکہ وہ چیز جو "عام سمجھ" کے نام سے معروف ہے اس کی مخالف ہوتی ہے، چونکہ اس تہیج کی اتباع اسی وقت ممکن ہے کہ انسان اپنے پوشیدہ احساسات کو بزرگوں اور دوستوں کے عقل و فہم اور دانشمندانہ پند و نصایح کا مخالف بنائے اس لیے سو صورتوں میں سے ۹۹ میں یہ تخلیقی ہیجان جس سے ایک آزاد اور قوی زندگی پیدا ہو سکتی تھی شروع ہی میں کچل کر پامال ہو جاتا ہے۔ اور یہ نوجوان بجائے خود مختار کاریگر بننے کے ایک آلہ بننے پر راضی ہو جاتا ہے، اب یہ اس مقصد کا پیرو نہیں رہتا جسے اس کی فطرت اچھا جانتی ہے، بلکہ دوسروں کے اغراض کی تکمیل کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ عین جس آن میں کہ اس سے تسلیم کا یہ فعل سرزد ہوتا ہے، اس کے اندر کسی چیز کی موت بھی واقع ہوتی ہے اس کے بعد وہ کبھی کامل انسان نہیں بن سکتا، اس کی پہلی غیر مجروح خودداری اس میں پھر

کبھی واپس نہیں آسکتی، نہ وہ سربلند احساسِ نفس جو باوجود تمام خارجی مصائب و مشکلات کے اس کی روح کے انبساط کا باعث ہوتا الّا یہ کہ ان کے خیالات میں کامل تبدیلی یا اس کے طریقِ زندگی میں بنیادی تغیر پیدا ہو جائے۔

خارجی موانع، جنہیں قوت ارادی تسلیم نہ کرے، اسقدر ضرر رساں نہیں ہوتے جتنی کہ وہ پوشیدہ ترغیبات جو ارادہ کو بہکا لیتی ہیں۔ مثلاً ممکن ہو کہ عشق و محبت میں کوئی سخت مایوسی نہایت شدید کرب والم کا باعث ہو، لیکن ایک قوی انسان کو یہ مایوسی وہ داخلی نقصان نہیں پہونچا سکتی جو فرض کرو کہ صرف روپیہ کی خاطر شادی کر لینے سے انسانی روح کو پہونچتا ہو۔ اس لیے کہ اصل چیز کسی خاص آرزو کا حصول نہیں بلکہ وہ سمت ہو، وہ راہ ہو جس پر تکمیل یا حصول کی خواہش ہو، تاثیر کی وہ نوع ہے جو مطلوب ہو۔ چنانچہ جب اصلی ہیجان کی مخالفت قوتِ ارادی کرتی ہو، تو ہیجان اپنے کو بےبس محسوس کرنے لگتا ہو، اور پھر اسمیں محرکِ عمل بننے کی امید باقی نہیں رہتی برخلاف اس کے اگر ہیجان قوی ہو تو خارجی جبر سے بےبسی اور لاچاری کا یہ احساس پیدا نہیں ہوتا۔ ورنہ یوں تو بعض مخصوص آرزوں کی پامالی بہتر سے بہتر جماعت میں بھی ناگزیر ہو گی۔ کیونکہ بعض لوگوں کی آرزوئیں ایسی ہوتی ہیں کہ اگر انہیں روکا نہ جائے تو دوسروں پر جبر یا دوسروں کی تباہی انکا نتیجہ ہو۔ مثلاً ایک اچھی جماعت میں نپولین کو اپنا من مانا پیشہ اختیار کرنے کی اجازت نہ ملتی، البتہ وہ کہیں مغربی امریکہ میں نئے علاقوں کی دریافت یا آبادی میں اولیت کا شرف حاصل کر سکتا تھا۔ ایک بنک کے محرر کی حیثیت سے وہ خوشی نہ حاصل کر سکتا اور نہ کوئی معقول نظام جماعتی اسے محرر بننے پر مجبور کرتا۔

حیات انفرادی کی وحدت چاہتی ہو کہ فرد میں جو کوئی تخلیقی ہیجانات ہوں وہ اس کی زندگی میں پائے جائیں، اور اس کی تعلیم و تربیت ان ہیجانات کی حفاظت کرے اور انھیں ابھارے

جماعتی زندگی کی وحدت کے لیے ضرورت ہے کہ مختلف افراد کے مختلف تخلیقی ہیجانات مل کر سب ایک مشترک زندگی اور ایک مشترک غرض (جس کا محسوس ہونا ضروری نہیں) کی طرف مائل ہوں، جس سے جماعت کے ہر فرد کو اپنی ذاتی تکمیل میں مدد ملے۔

انسان کے ہیجانات اور آرزوؤں کی دو قسمیں ہو سکتی ہیں۔ تخلیقی اور تملیکی۔ ہمارے بعض اعمال اس غرض سے ہوتے ہیں کہ کوئی ایسی چیز پیدا کریں جو ان اعمال کے بغیر موجود نہ ہوتی اور بعض دوسرے افعال وہ ہوتے ہیں جو اُن چیزوں کو حاصل کرنے یا اپنے قبضہ میں قائم رکھنے کے لیے ہیں جو پہلے سے موجود ہیں۔ ہیجان تخلیقی کا اچھا نمونہ فنون لطیفہ کے ماہرین میں ملے گا، اور تملیکی ہیجان کا بہترین نمونہ ملکیت شخصی ہے بہترین زندگی وہ ہے جس میں تخلیقی ہیجانات زیادہ سے زیادہ اور تملیکی کم سے کم کارفرما ہیں۔ . . . . سیاسی اور خانگی زندگی دونوں کا اصول اوّلین یہ ہونا چاہیے کہ ہر اس چیز کو فروغ دیں جو تخلیقی ہے اور ہر اس آرزو اور ہیجان کو کم کریں جن کا مرکز تملیک ہے۔ بحالات موجودہ حکومت بڑی حد تک تملیکی ہیجانات کا مجسمہ ہے۔ امور داخلی میں یہ امیروں کو غریبوں کے مقابلہ میں بچاتی اور معاملات خارجی میں یہ اپنی قوت کمزور قوموں سے ناجائز کسب فوائد اور دوسری حکومتوں سے مقابلہ و مسابقہ میں صرف کرتی ہے۔ اسی طرح ہمارا نظام معاشی تمام تر تملیک سے متعلق ہے . . . . تعلیم، ازدواج اور مذہب اصلاً تخلیقی ہیں۔ لیکن تملیکی محرکات کی مداخلت نے انھیں اپنی اصلیت سے بہت کچھ دور کر دیا ہے۔ مثلاً تعلیم اس بات کا وسیلہ سمجھی جاتی ہے کہ طلباء کے دماغ میں تعصبات بھر کر موجودہ نظام کو کسی طرح قایم رکھا جائے۔ یہ کبھی نہیں ہوتا کہ اسے حریت فکر اور آزادی خیال پیدا کرنے کا ذریعہ بنایا جائے یا جذبات و احساسات سنہ کی مثال اور ذہنی حوصلہ کی تحریک سے اس تعلیم کو ایک بہتر مطمح نظر پیدا کرنے میں صرف کیا جائے۔ ازدواج میں محبت نے تخلیقی جذبہ کو رقابت کا تملیکی جذبہ پا بجولاں رکھتا ہے۔ مذہب کا کام ہونا چاہیے ہمارے روح کے تخلیقی

منتہائے نظر کا آزاد کرنا، اب اس کا کام عموماً حیات جبلی و طبعی کو دبانا اور فکر و خیال کی تہ و بالا کرنی والی قوت کا مقابلہ کرنا ہے۔ الغرض مختلف طریقوں سے خوف نے، جو غیر محفوظ تملیک کا آفریدہ ہے، اس امید کی جگہ لے لی ہے جس کی روح رواں تخلیقی قوت ہے۔

(لہذا) مہذب دنیا کو اگر انحطاط سے بچانا ہے تو اس کے لیے ایک بنیادی تغیر کی ضرورت ہے، یعنی اس کی معاشی ساخت اور اس کے فلسفۂ زندگی دونوں میں تغیر ...... زندگی کی ترقی یا تباہی میں نظام ہائے معاشی کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ ایک غلامی کو چھوڑ کر، موجودہ نظام صنعتی زندگی کے لیے ان تمام نظاموں سے زیادہ تباہ کن ہے جو کبھی عالم وجود میں آئے ہیں۔ اس میں سے مشینوں کے استعمال اور بڑے پیمانہ پر پیداوار کے اجزا کا نکالنا تو اب ممکن نہیں اور اس نظام سے بہتر نظام میں بھی یہ باقی رہینگے۔ اصلاح کی بہترین راہ اس معاملہ میں غالباً صنعتی جمہوریتوں کا قیام اور انکا اتحاد ہے۔

جب بہت سے لوگ یقین کریں تو فلسفہ ہائے زندگی بھی جماعت کی قوت اور اس کی حیات پر بڑا اثر رکھتے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں جو فلسفۂ حیات سب سے وسیع حلقۂ معتقدین رکھتا ہے وہ یہ ہے کہ انسان کی مسرت کے واسطے سب سے زیادہ اہم چیز اس کی آمدنی ہے۔ اس کے دیگر نقائص سے قطع نظر یہ فلسفہ اس لیے اور بھی مضر ہے کہ یہ انسان کا مقصد بجائے ایک عمل کے ایک نتیجہ کو قرار دیتا ہے۔ یعنی بجائے ایک تخلیقی ہیجان کے جو انسان کی انفرادی شخصیت کا پرتو ہو یہ مادی اشیائے لطف اندوزی کو اس کا مقصد بناتا ہے جس میں افراد کی کوئی تفریق نہیں۔ دوسرے فلسفے جو اس سے لطیف تر ہیں، مثلاً وہ جو اعلیٰ تعلیم کے ذریعہ پھیلائے جاتے ہیں، وہ عموماً مستقبل کے بجائے ماضی کو، موثر عمل کے بجائے رویہ اور برتاؤ کو توجہ کا مرکز بنا دیتے ہیں۔ لیکن روایات قدیم اور خزانۂ علم کا روز افزوں بار اٹھانے کے لیے انسان کو ان فلسفوں سے کافی قوت نہ ملے گی۔

دنیا کو ایک ایسے فلسفہ یا ایک ایسے مذہب کی ضرورت ہے جو حیات پرور ہو۔ لیکن انفرادی حیات کیلئے محض حیات کے علاوہ کسی اور چیز کی قدر کی بھی ضرورت ہے۔ جو زندگی بس زندگی کے لیے ہی وقف ہو وہ حیوانی زندگی ہے۔ اس میں کوئی حقیقی قدر انسانی نہیں۔ اور نہ اس میں یہ صلاحیت ہے کہ انسان کو ہمیشہ پژمردگی سے یا اس احساس سے محفوظ رکھ سکے کہ سب کچھ ہیچ ہے۔ اگر زندگی کو کامل طور پر انسانی زندگی بنانا ہے تو اسے کسی ایسے مقصد کا خادم ہونا چاہیے جو کسی نہ کسی معنی میں اس سے خارجی ہو، کوئی مقصد جو مافوق الناس اور غیر شخصی ہو، مثلاً اللہ، یا حق، یا جمال۔ جو لوگ سب سے زیادہ ترقی حیات کا موجب ہوتے ہیں۔ وہ اپنی خاطر زندگی نہیں گذارتے۔ ان کی نظر ہوتی ہے حقیقت کے ایک تدریجی حلول پر، وجود انسانی میں حقیقت ازلی کا جزو پیدا کرنے پر۔ اس پیرایہ میں متخیلہ کی نگاہ کو جدال و نامرادی سے مامون اور زمانہ کی ہمہ گیر گرفت سے محفوظ کسی بلندی پر رہتی دکھائی دیتی ہے۔ اس عالم ازلی سے لگاؤ —— خواہ یہ ہمارا خیالی عالم ہی کیوں نہ ہو —— اپنے ساتھ ایک ایسی قوت اور اپنے ہمرکاب ایک ایسا امن و سکون لاتا ہے کہ ہماری دنیاوی زندگی کی کشاکش اور ظاہری ناکامیاں اسے کبھی کلیتہً فنا نہیں کر سکتیں۔ حقیقت ازلی کا یہی مسرت انگیز تصور ہے جسے اسپی نوزا خدا کی عقلی محبت سے تعبیر کرتا ہے جنھوں نے ایک مرتبہ اسے جان لیا، ان کے لیے یہ ہمیشہ کلید گنج عرفاں ہے۔ ....

اگر ہم اس حقیقت ازلی سے لگاؤ پیدا کریں، اگر ہم اپنی زندگی اس لیے وقف کر دیں کہ اس مصیبت زدہ دکھیا دنیا میں اس حقیقت الٰہی کا ایک جز دے آئیں، تو ہم آج بھی کہ ہر چہار طرف ظلم و دغا کی جدال و قتال، نفرت و حقارت سے محصور ہیں، اپنی زندگی کو تخلیقی بنا سکتے ہیں.....

جو لوگ دنیا کی اس حیات نو کا آغاز کرینگے انہیں تنہائی، مخالفت، افلاس، اور بدنامی سے دوچار ہونا پڑیگا۔ انہیں اس قابل ہونا چاہیے کہ صداقت اور محبت کی قوت کی زندہ تصویر بن کر اپنے سینہ کو ایک غیر تسخیر پذیر عقلی امید ہمیشہ کا آباد رکھیں۔ ایماندار ہوں، اور عقلمند۔ بے خوف ہوں، اور ایک مستقل غرض کے تابع۔ ایسے مردوں اور عورتوں کی جماعت پہلے اپنی انفرادی زندگی کی

مشکلات اور پیچیدگیوں پر فتح پائے گی اور پھر کچھ وقت گزرنے پر، اگرچہ شاید زیادہ وقت گزرنے پر خارجی دنیا بھی ظفریاب ہوگی۔ دنیا کو عرفان اور امید کی ضرورت ہے، اور ہر چند وہ ان کے مقابل جنگ آزما ہو، بالآخر ان کے روبرو اپنا ہدیۂ تعلیم پیش کرتی ہی ہے۔ جب قوم گوتھ نے روما کو پامال کر ڈالا اگستین مقدس نے اپنی کتاب "مدینۃ اللہ" لکھی اور تباہ شدہ مادی حقیقت کی جگہ ایک روحانی امید پیدا کی۔ آنے والی صدیوں میں کہ روما ٹوٹے پھوٹے مکانوں کا ایک قریہ رہ گیا تھا، اگستین کی امید زندہ بھی رہی اور زندگی بخش بھی۔ ہم پر بھی لازم ہے کہ ایک نئی امید پیدا کریں اور اپنے خیال سے ایک ایسی دنیا بنائیں جو اس دنیا سے بہتر ہو جو خود اپنے کو قعر تباہی میں ڈھکیل رہی ہے۔ وقت چونکہ برا ہے، اس لیے ہم سے بھی اس سے زیادہ مطلوب ہے جتنا معمولی زمانہ میں ہوتا۔ آنے والی نسلوں کو اس موت سے، جو اس نسل پر آپڑی ہے جسے ہم جانتے اور جس سے ہم محبت کرتے تھے صرف خیال و روح کی دہکتی آگ ہی بچا سکتی ہے۔

خوش قسمتی سے مجھے بہ حیثیت معلم مختلف اقوام کے نوجوانوں سے ملنے کا موقع ملا ہے، وہ نوجوان جن میں شمع امید فروزاں تھی، جن میں وہ تخلیقی قوت موجود تھی جو دنیا میں اس تخئیلی حسن کا کچھ حصہ ضرور پیدا کرتی جس کے خیال سے وہ زندہ رہتے تھے۔ ان کو جنگ کا سیلاب بہا لے گیا کسی کو ایک طرف کسی کو دوسری طرف۔ بعض ابتک جنگ آزما ہیں بعض ہمیشہ کے لیے معذور ہوگئے ہیں، اور بعض مر چکے ہیں۔ جو زندہ ہیں ان کے متعلق خوف ہے کہ اکثر میں حیات روحانی کی شمع گل ہو چکی ہوگی، امید کا چراغ بجھ گیا ہوگا، قوت صرف ہو چکی ہوگی، اور آنے والے ماہ و سال اس تھکے ماندے مسافر کے جادۂ سفر ہونگے جس کی منزل قبر ہے۔ ان کے معلموں میں بہت سے ایسے ہیں جنھیں اس حادثۂ المناک کا کچھ احساس نہیں۔ یہ اپنی بے رحم منطق سے ثابت کرتے ہیں کہ ان نوجوانوں کی قربانی کسی بادۂ غرض مجرد کے لیے ناگزیر تھی۔ چونکہ خود ان کے

آرام میں خلل نہیں پڑا اس لیئے اگر کبھی جذبات کا کوئی آنی حملہ ہوتا بھی ہے تو یہ پھر جلدی سے اپنے آرام و اطمینان میں واپس آجاتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن میں حیات روحانی کی موت ہو چکی ہے۔ اگر یہ زندہ ہوتی تو اپنے پہلو میں باپ ماں کی سی محبت لیے ہوئے ان نوجوانوں کی روحوں سے ملنے کے لیے بڑھتی۔ یہ نفس و ذات کی قیود سے آزاد ہوتی اور ان کی حسرت ناک مصیبت ان کی مصیبت ہوتی۔ پھر کوئی چیز پکار کر ان سے کہتی: "نہیں نہیں۔ یہ ٹھیک نہیں۔ یہ اچھا نہیں۔ یہ غرض مقدس نہیں جس کے لیے شباب کی دمکتی روشنی ماند اور تباہ کی جا رہی ہے۔ یہ ہم سن رسیدہ بڈھے ہیں جو گنہگار ہیں۔ ہم نے اپنے جذبات سو، اپنی روحانی موت کی خاطر ان جوانوں کو میدان پیکار میں بھیجا ہے۔ یہ وہاں اس لیے ہیں کہ ہم اپنے دل میں گرمی اور اپنی روح میں ایک زندہ منظر نہ رکھنے کے باعث بھلائی اور رواداری سے زندگی گذارنے میں ناکام رہے۔ آؤ۔ اب ہم اس موت سے نکل آئیں۔ اس لیے کہ دراصل مردہ ہم ہیں، نہ یہ نوجوان جنھوں نے موت کا منہ اس لیے دیکھا کہ ہم جینے سے خائف تھے۔ ان کے تو مردہ جسموں میں ہم سے زیادہ زندگی ہے۔ اور وہ ہمیں تمام آنے والی نسلوں کے سامنے شرم و ندامت کا منظر بنا رہے ہیں۔ چاہیے کہ ان کے مردہ اجسام سے زندگی پیدا ہو اور وہ ہمیں بھی زندہ کرے۔"

ذاکر حسین خاں از برلن

پارسی علوم اور اسلام

(گذشتہ سے پیوستہ)

بھاٹ اور شاعر

قدیم پارسی شاعری کی تلاش میں باربد اور نین جارا در بھاٹوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ عرب شاعر خالد بن فیاض نے جو اول صدی ہجری کے آخر میں گذرا ہے باربد کا افسانہ عربی میں لکھا ہے۔ باربد ایک بھاٹ تھا جو خسرو پرویز کو گا بجا کر خوش کیا کرتا تھا۔ یہ نہایت مغلوب الغضب بادشاہ تھا۔ جب کوئی ناگوار بات اس کے کانوں تک پہنچانا ہوتی تو اہل دربار باربد کی موسیقی اور بول کے ذریعے آگاہ کرتے تھے چنانچہ بادشاہ کے شبدیز نام گھوڑے کی موت کی خبر باربد نے اُسے کس طرح گا کر دی ہے خالد نے عربی نظم میں اس کو بتایا ہے۔ مگر عربی میں اس قسم کے چٹکلے اور افسانے بہت ہیں جنکو تاریخی رنگ دیکر دلچسپ اور مقبول طبع بنایا گیا ہے۔ عنترہ کے کارناموں کا پورا افسانہ، امیر شہر سبا کی کیفیت الف لیلہ کی بعض تاریخ نما داستانیں۔ حماد الراویہ کی کہانیاں، یہاں تک کہ ہابیل کی موت پر حضرت آدم کا مرثیہ اور ابلیس کا جواب عربی نظم میں موجود ہیں جو بالکل قابل اعتنا نہیں۔ دوسرے اگر باربد کی اصلیت تسلیم بھی کی جائے تو اس کے بول شعر نہ تھے۔ چنانچہ عوفی کا بیان ہے:۔

"نوائے خسروانی کہ آں را باربد در صورت آوردہ است بسیار است فاما از وزن شعر و قافیہ و مراعات نظائر آن دور است بداں سبب تعرض بیان آں کردہ نیامد[۱]"

درحقیقت بھٹئی اور شاعری دو چیزیں ہیں، الگ الگ۔ اور بھاٹوں کا وجود بجائے تہذیب و تمدن کی علامت کے ہمیشہ اور ہر ملک کی تاریخ میں وحشت و بدویت کی نشانی رہا ہے۔ آج تک غیر مہذب پہاڑی علاقوں میں بھاٹ پلے جاتے ہیں جو قومی افسانے گایا کرتے ہیں۔ اسکاٹ لینڈ کے دور وحشت میں امیروں کے دربار میں آزاد آوارہ گرد بھاٹ پہنچا

---

[۱] جلد اصفحہ ۲۰۔ لباب الالباب

رہتے تھے جن کی صحیح تصویر مشہور افسانہ نویس اور قومی شاعر سر والٹر اسکاٹ نے اپنی تصانیف میں کھینچی ہے۔ اسی طرح کوہسار ویلز میں بھی بھاٹ تھے اور سرحدی پٹھانوں میں بھی موجود ہیں مگر ان کا وجود تمدن وتہذیب اور علم وادب سے جو کچھ علاقہ رکھتا ہے محتاج بیان نہیں۔

دولت شاہی روایت

یہی دولت شاہ سمرقندی کی روایت جو آغاز مضمون میں نقل کی جا چکی ہے یعنی عبداللہ بن طاہر گورنر خراسان کی طرف فارسی لٹریچر کی غارت گری کی نسبت اور صاحب مجمع الفصحا کا اُس کو طرح تعمیم کر کے عام عربوں کی طرف اس وحشت کو منسوب کرنا، اول تو یہ اچھوتا مضمون صرف دولت شاہ کی طبع رسا کا نتیجہ ہے اور دولت شاہ کی اکثر روایتوں کی طرح بے سند ہے محمد عوفی اپنے مستند ومعتبر تذکرہ لباب الالباب میں جو خود مجمع الفصحا مؤلفہ رضا قلی خاں مذکور کا بھی ماخذ ہے "باب سوم در معنی اول کسے کہ شعر گفت" باب چہارم در معنی اول شعر پارسی کہ گفت" جیسے مستقل باب باندھ کر ان مسائل پر تفصیل سے بحث کرتا ہے۔ آج عام تذکروں میں اوّلین اشعار پارسی کے جو نمونے منقول ہیں تقریباً سب کے سب اسی کتاب سے ماخوذ ہیں مگر قصۂ وامق و عذرا اور عبداللہ بن طاہر کا افسانہ کہیں نظر نہیں آتا۔ حالانکہ آل طاہر کا ذکر ان الفاظ میں موجود ہے:۔

> "اگرچہ فیض وانعام ایشاں عام بود فاما ایشاں را در پارسی ولغت دری اعتقادے نبود۔ دراں عصر شعراء دریں فن کمتر خوض کردند۔ اما در عہد میمون ایشاں شاعر شکر سخن خاست حنظلہ نام از بادغیس .... ۵۱"

اس کے بعد حنظلہ بادغیسی اور دوسرے اولین شعرائے فارس کے کلام جمع کیے ہیں۔ اس مقام کے سوا مثنوی وامق و عذرا کے ذکر کا اور کون سا موقع ہو سکتا تھا؟ عنصری کی تصانیف کے ضمن میں اس مثنوی کا ذکر بھی آتا ہے مگر وہاں بھی اس واقعہ کا کوئی نشان نہیں۔ پھر درایۃً یہ ناممکن محض معلوم ہوتا ہے کہ خراسان کے گورنر کے حکم سے ساری دنیا کا فارسی لٹریچر فنا ہو جائے۔ زیادہ سے زیادہ خراسان میں یہ حکم چل سکتا تھا، باقی ملک ایران میں عبداللہ

۵۱ لباب الالباب جلد ۱ صفحہ ۲۔

کا کیا دخل ؟

فارسی اصطلاحات علمیہ سے مغالطہ

پروفیسر آزاد نے سخندان فارس میں پہلوی و فارسی قدیم کی اصطلاحات فلسفیہ کا کچھ نمونہ پیش کرکے پارسی قدیم کی مالداری کا ثبوت دیا ہے اور اپنے مخصوص ادیبانہ طرز میں اس کے فنا پرسینہ کوبی کی ہے۔ مگر حسب عادات اپنا ماخذ بتایا نہ کسی کتاب کا حوالہ دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ ساری اصطلاحات پارسی جن پر ماتم کیا گیا ہے ظہور اسلام سے بہت بعد کی کوشش ہیں۔ کیونکہ اوستھا اور اس کی شرح کے سوا فلسفہ وغیرہ پر فارسی قدیم یا پہلوی میں آج دنیا پر جو کچھ اجزا موجود ہیں وہ چودھویں صدی عیسوی (۱۳۲۲ء) تک کے لکھے ہوئے ہیں ایسی حالت میں فاضل ممدوح کا یہ ماتم اشکِ ہمدردی بہانے کے عوض خندہ ملامت کے لائق ہے۔

ایرانیوں کی حب وطنی نے انھیں ہمیشہ سے غیر مخلوط خالص پارسی کے شیوع کا متمنی اور ساعی رکھا ہے۔ یہ کوشش بے سود ہی عہد فردوسی سے لیکر آج تک وقتاً فوقتاً ہوتی رہی ہے۔
محمد صالح دربار شاہجہانی کا مصنف تھا۔ اس نے اپنی ایک کتاب عمل صالح میں عربی اصطلاحات عروض کی جگہ خالص فارسی اصطلاحات گھڑی تھیں جن کا نمونہ یہ ہے۔

قصیدہ	کے لیے	چگامہ	تخلص	"	داغ
غزل	"	چامہ[1]	نثر	"	پراگندہ
وزن شعر	"	دم	نظم	"	پیوستہ[2]
ردیف	"	پ دند			

[1] فردوسی نے چامہ گیت کے معنی میں استعمال کیا ہے۔
[2] فردوسی نے پیوستہ کسی نہ کسی صفت کے ساتھ لاکر اسے نظم کے مفہوم میں مجازاً استعمال کیا ہے۔ جیسے گویا پیوستہ۔ حدیث پیوستہ۔

اخبار روزنامۂ ایران سلطانی نمبر ۴ مورخہ ۱۳۲۱ ھ ہجری میں نصاب ابوالظفر صادق فراہانی کے نام سے ایک منظوم فرہنگ شائع ہوئی تھی۔ چند لفظ یہ ہیں :-

پاک	کے لیے	یزداں	صراط	کے لیے	چینود
خدا	"	ایزد	بہشت (باغ)	"	مینو
حق	"	ہُدہ	افعال مسنون	"	چنب
نبی	"	وخشور	سحر	"	فرہ
شرح	"	آئیں	معجزہ	"	فرہود
نظام	"	دھناد	فاضل و دانا	"	فرجاد
عرش	"	گرزماں	کعبہ	"	آباد
کرسی	"	زہرگر	قرآن	"	نوی
ثواب	"	کرفہ	مسجد الاقصیٰ	"	گنگ دژ ہوخت
عذاب	"	یزہ			

مگر محض چند پہلوی الفاظ کی موجودگی سے یہ نتیجہ نکالنا کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا کہ یہ زبانِ پہلویِ ساسانی کی اصطلاحات ہیں اور ان کی موجودگی علوم و فنون کی موجودگی پر دلالت کرتی ہے۔ ایسے ہی الفاظ کی بنا پر ایک مدعیِ تحقیق پادری صاحب نے اسلام کے تمام عقائدِ معاد کو زرتشتی دینیات سے ماخوذ ثابت کیا ہے[1]

پہلوی ادبیات باقیہ پر ایک نظر

اخیر ساسانی عہد کی پہلوی ادبیات بھی جو کچھ آج موجود ہیں، ان کی قدر و قیمت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے

[1] ینابیع الاسلام مطبوعہ ایران جسے سر ولیم میور نے ترجمہ کرکے خوب چمکایا اور اچھالا ہے اس کا نام The Sources of Islam رکھا ہے۔

کہ بجائے تاریخ و مذہب و تمدن ایران پر روشنی ڈالنے کے وہ اسے تاریک سے تاریک تر بنا رہی ہیں ایک طرف اوستا اور ژند کیومرث کو حضرت آدم قرار دیتی ہیں دوسری طرف دساتیر[1] کا بیان ہے کہ کیومرث کے قبل ایک پیغمبر مہاباد گذرا ہے جس سے موجودہ نوع انسان کی نسل چلی ہے اس میں قدیم مجوسیوں کا یہ فلسفہ بھی درج ہے کہ زمانہ بہت دوروں میں منقسم ہے۔ ہر دورے میں ایک خلقت پیدا ہوئی، بڑھی اور پھیلی، پھر تدریجاً فنا ہو گئی۔ آخر میں صرف ایک مرد و عورت بچ رہے جن سے آیندہ دورہ چلا۔ وعلیٰ ہذا القیاس مہاباد آخری دورے کا بابا آدم ہے جس نے تمدن کے سارے سامان ایجاد کیے۔ اس کے زمانہ میں دنیا میں بہشت کا امن و عیش میسر تھا۔ مہاباد کے خاندان کے بعد ایک پیغمبر جی افرام نے عنان حکومت سنبھالی۔ اس خاندان کی جسے جیانیاں کہتے ہیں مدت حکومت ایک اسپار سال بتائی گئی ہے، جو ان کے حساب سے ایک ہزار ملین یا دس کرور سال کے برابر ہے[2] ۔ مورخین یونان پیشدادی یا ان سے پہلے خاندانوں کا کوئی ذکر نہیں کرتے۔

شاہنامہ فردوسی کو آج ہم محض شاعرانہ افسانہ سمجھتے ہیں لیکن یہ مثنوی بھی بلحاظ واقعات زیادہ تر پہلوی تصنیف کارنامک ارتخشتر پاپکاں (کارنامۂ اردشیر بابکاں) اور خدائے نامک کا چربہ ہے۔ آخرالذکر کتاب آٹھویں صدی عیسوی کے وسط میں ابن المقفع اور دوسرے فضلا کے پانچ چھ مختلف عربی تراجم کے ذریعے سے دنیائے اسلام میں مشتہر ہو چکی تھی اگرچہ اب اصل پہلوی متن نایاب ہے۔ یہ غالباً یزدگرد سوم کے عہد کی تالیف تھی۔ اسی طرح کارنامۂ

---

[1] یہ اوستا اور ژند پاژند سے بالکل الگ ایک قدیم کتاب ہے جو ۵۹۰ء میں عہد خسرو پرویز میں پہلوی میں ترجمہ ہوئی۔ اس میں شاہان ایران کے نامے یا الہامات ہیں۔ اس کے بیان کے مطابق ایران کے تمام شاہان پیشین خدا کے اوتار تھے۔ زیادہ تر آفرینش عالم سے بحث کی گئی ہے جو اوستا سے بالکل مختلف ہے۔

[2] تاریخ ایران سر جان ملکم جلد اول باب دوم۔ تاریخ سنی ملوک الارض والانبیا حمزہ اصفہانی مطبوعہ برلن ۱۳۴۰ء صفحہ ۱۰۔

اردشیر ۲۲۶ء کی تالیف بتایا جاتا ہے لہٰذا ان دونوں کتابوں کو پہلوی لٹریچر کا اعلیٰ نمونہ سمجھنا چاہیے۔ کارنامۂ اردشیر دستبرد زمانہ سے بچ رہا ہے۔ جس کا جی چاہے کسی ایک بحث پر اس کارنامہ اور شاہنامہ دونوں تصانیف کو پہلو بہ پہلو رکھ کر سرجان ملکم اور پروفیسر براون کی طرح مقابلہ کر لے۔ ان دونوں کے بیان کے مطابق کیومرث کی طرف سے اس کے حریف کے مقابلے میں شیر اور بھیڑیے بھی لڑے اور اس کے دشمنوں کا نام ونشان جہاں سے مٹا دیا۔ جمشید، ضحاک، فریدون، زال و رستم، منوچہر، اسکندر و دارا کی مشہور بے تکی کہانیوں کی عام شہرت محتاج تکرار نہیں۔

تاریخی قصوں میں رنگ آمیزی جائز ہو تو ہو مگر آج تک کسی نے خوش سنین و تواریخ میں مبالغہ جائز نہیں رکھا۔ شاہانِ شاہنامہ کی مدت پادشاہی قابل دید ہے :-

(۱) شاہانِ پیشدادی۔ جملہ مدت سلطنت ۱۶۲۰ سال

سلطنت جمشید	۱۰۰۰	"
" فریدون	۵۰۰	"
" منوچہر	۱۲۰	"

(۲) شاہانِ کیانی۔ جملہ مدت سلطنت ۶۰۰ سال

سلطنت کیقباد	۱۰۰	"
" کیکاؤس	۱۵۰	"
" لہراسپ	۱۲۰	"
" گشتاسپ	۱۲۰	"
" بہمن اردشیر دراز دست	۱۱۰	"

طبری، ابومعشر، حمزہ اصفہانی اور دوسرے مسلم مورخین نے بھی پہلوی ماخذوں ہی سے کم وبیش سلسلہ مدتیں نقل کی ہیں۔ ثعالبی نے اپنی تاریخ میں زال وسیمرغ کی داستان نقل کر کے معذرت کی ہے کہ "میں ان افسانوں سے بری الذمہ ہوں۔ اگر تاریخ ایران میں یہ داستانیں یوں ہی علی التواتر بیان ہوتی چلی نہ آتیں تو میں ان کا ذکر نہ کرتا۔ اس زمانہ کی عجیب عجیب باتیں منقول ہیں۔ مثلاً ہزار ہزار سال کی عمریں اور جن وشیاطین کا پادشاہوں کے تابع ہونا وغیرہ"۔ اسی طرح البیرونی جو خود ایرانی نژاد اور محب وطن ہے منوچہر رستم کے ذکر

کے بعد لکھتا ہے - ولم فی التاریخ اعمار الملوک و اقاعیلم المشهورة عنهم ما یستنفر عن استماع القلوب و تمجه الاذان ولا تقبله العقول[1] یعنی ایرانیوں کی تاریخ میں بادشاہوں کی عمریں اور ان کے کارنامے ایسے درج ہیں جن کے سننے سے دل اکتاتا ہے، نہ کان ان کو گوارا کرتے ہیں نہ عقل قبول کرتی ہے - حمزہ اصفہانی اپنی کتاب سنی ملوک الارض والانبیاء میں صاف لکھتا ہے کہ ان کی تمام تاریخی کتابیں محرف اور غیر صحیح ہیں .... مجبوراً میں نے یہاں بادشاہ کے صرف وہی حالات مختصراً جمع کر دیئے ہیں جو ان کتابوں میں موجود نہیں - باقی فضول باتیں ان کی تمام کتابوں میں بھری پڑی ہیں - ان کے خطوط اور وصیت نامے وغیرہ جو کتب تاریخ میں مذکور ہیں ان سے ہم نے اپنی کتاب کو پاک رکھا ہے[2]"

یونانی و پارسی تواریخ میں تناقض

ایران قدیم سے یونان کے تعلقات بہت گہرے رہے ہیں - صدیوں حاکم و محکوم کا واسطہ رہا ہے - اسکندر ایران کے علوم دین کو تلف کر کے باقی تمام علوم و فنون یونان اٹھوا لے گیا اور یونانی و قبطی زبانوں میں ان کے ترجمے کیے گئے - اس[3] سے ظاہر ہے کہ اس عہد کی تاریخ ایران کے لیے دنیا میں بہترین مواد د مواقع یونانیوں ہی کو حاصل تھے - چنانچہ قدیم مورخین یونان نے اپنے عصر کے ایران کے جو تاریخی حالات چھوڑے ہیں وہ ہر اعتبار سے ایرانی بیانات سے زیادہ معتبر سمجھے جانے کے لائق ہیں - مگر وہ بالاکثر ان پارسی روایات سے متناقض ہیں - ثعالبی کا بیان ہے کہ "ہمارے پاس تاریخ ایران کے متعلق دو ماخذ ہیں - ایرانی و یونانی - ہم جانتے ہیں کہ دونوں میں اختلاف ہے، لیکن صاحب البیت ادری بما فیہ - گھر کا حال گھر والا ہی خوب جانتا ہے - اس لیے ہم نے یونانیوں کے مقابلے میں ایرانیوں کا زیادہ اعتبار کیا - لیکن جب صاحب البیت سیکڑوں اور ہزاروں سال پیشتر کے اسلاف کی مبالغہ داستانیں غلو اور اغراق کے ساتھ بیان کر رہا ہو تو اس کے اس بزرگ ہمسایہ کی شہادت

---

[1] آثار الباقیہ مطبوعہ لیپزگ صفحہ ۱۰۰

[2] سنی ملوک الارض حمزہ اصفہانی مطبوعہ برلن ۱۳۴۰ھ صفحہ ۴۳ - [3] ایضاً

بے شبہ کہیں زیادہ معتبر قرار دی جائینگی جو اس کے اسلاف کا ہمعصر یا قریب العصر ہو غرض واقعیت کے اعتبار سے پارسی تاریخوں اور کلیلہ و دمنہ جیسی کہانیوں میں چنداں فرق نہیں ہوتا۔

محمد اسلم۔ ایم اے۔

کلام فانی

نتیجہ فکر مولوی شوکت علی فانی بی اے۔ ایل ایل بی

اب انھیں اپنی اداؤں سے حجاب آتا ہے
چشم بد دور دُلہن بنکے شباب آتا ہے

ہجر میں بھی مجھے امدادِ اجل تھی درکار
میری تربت پہ نہ اب تجھسے حجاب آتا ہے

دید آخر ہے اُلٹ دیجیے چہرے سے نقاب
آج مشتاق کے چہرے پہ نقاب آتا ہے

کس طرف جوشِ کرم تیری نگاہیں اُٹھیں
کون محشر میں سزاوارِ عتاب آتا ہے

موت کی نیند بھی اب چین سے سونا معلوم
کہ جنازہ پہ وہ غارتگر خواب آتا ہے

جلوۂ رنگ ہی نیرنگِ تقاضائے نگاہ
کوئی مجبور تماشائے سراب آتا ہے

ہو گیا خون ترے ہجر میں دل کا شاید
اب تصور بھی ترا نقش بر آب آتا ہے

دل کو اس طرح ٹھہر جانیکی عادت تو نہ تھی
کیوں اجل کیا مرے نامہ کا جواب آتا ہے

ملتی جلتی ہے مری عمرِ دو روزہ فانی
جی بھر آتا ہی اگر ذکرِ حباب آتا ہے

رومۃ الکبریٰ

(گذشتہ سے پیوستہ)

سینٹ پیٹرس

نیرو۔ روما کا تاجدار اُس عہد کا ہلاکو تھا تاریخ اس کے خوفناک کارناموں کی تفصیل بیان کرتی ہے جو اس قابل ہے کہ اب تمام یورپ کے دفاتر غار میں موٹے حرفوں میں لکھکر دیواروں پر آویزاں کر دیجائے ۶۴ سنہ عیسوی میں نیرو نے سارے روما کو جلاکر خاک کر دیا، اور دوسرے برس اپنے لیے ایک سنہری محل تعمیر کیا، جس کی چند اینٹیں اینک پڑی ہوئی ہیں ۲۷۰ءمیں شاہ ایرلین نے دار السلطنت کا ایک مینار تعمیر کرایا، ۳۱۲ سنہ میں قسطنطین نے اپنے جھنڈے پر صلیب کی شکل بنائی مسیح علیہ السلام کے مشہور حواری سنیٹ پیٹر کہا جاتا ہے کہ ۴۲ سنہ میں روم آئے تھے، ان کی تعلیمات کا اثر وفات کے ۲۷۰ برس بعد مترتب ہونا شروع ہوا اور قسطنطین نے اپنے عہد میں اُس عبادت گاہ کی بنیاد ڈالی آیندہ مسیحی دنیا کا سب سے بڑا کلیسا سمجھا گیا اور واقعہ یہ ہے کہ شاید آج دنیا میں کوئی مذہبی عمارت اتنی خوبصورت اور اتنی بڑی موجود نہیں۔ لیکن سینٹ پیٹرس صدیوں کی تدریجی تعمیر کا نتیجہ ہے، شروع میں ایک چھوٹا سا مقبرہ اس مقام پر بنایا گیا جہاں قدیم روایات کے مطابق سینٹ پیٹر مدفون سمجھے جاتے تھے، اُسی کے پہلو میں نیرو کے عہد جاہلیت کا ایک مندر تھا جو بعد میں منہدم کر دیا گیا اس کے بعد ۱۲۵۰ سنہ تک مسیحیت کی یہ پہلی یادگار بدستور قایم رہی لیکن وہ بہت کم زور ہو چلی تھی اور اندیشہ تھا کہ منہدم ہو جائیگی۔ اس زمانہ میں نکولاس پنجم پاپا کی مسند پر متمکن تھا اُس نے نئے نقشے تیار کرانے شروع کیے اور پوپ جولیس دوم نے اُس عظیم الشان عمارت کا سنگ بنیاد رکھا جو در حقیقت دیکھنے والے کو محو حیرت کر دیتی ہے۔ پھر بھی یہ عمارت ۱۶۲۶ سنہ تک مکمل نہ ہو سکی جب پوپ اربن ہشتم نے اس کا افتتاح کیا "مقدس سلطنت روم" کا ستارہ اقبال روشن اور بلند تھا اور اس عمارت کے در و دیوار نے عیسائیت کے بڑے بڑے مذہبی حاکموں کے جاہ و جلال کا منظر دیکھا۔

ایک بکا لا کھیل اوڑھنے والے اور اونٹ کی نکیل پکڑ کر چلنے والے پیغمبر (صلے اللہ علیہ وسلم) کے جاں نثاروں کو نام نہاد جانشینان مسیح اپنے عہد گذشتہ کے اس جاہ وجلال کے مقابلہ میں کتنی ہی حقارت سے دیکھیں، لیکن عالم مسیحیت میں روحانیت پر تو مسیح کے بعد ہی نفس پیم حاوی ہو چکا تھا، وہاں امارت اور دولت کے کرشمے مسیح کے مسند پر بکھرے ہوئے تھے۔ اسی عمارت کے وسط میں وہ مقام ہے جہاں روما کے بڑے بڑے تاجدار، پوپ کے قدم لیتے تھے اور ان کے ہاتھوں سے اپنے سر پر رکھواتے تھے، ساری عمارت کی وسعت و بلندی کا اندازہ ایک نظر میں کرنا بالکل ناممکن ہے۔ وسط کے فرش کا طول و عرض شاید اس طرح کچھ سمجھ میں آئے کہ اگر عہد جدید کا بڑے سے بڑا جہاز وہاں رکھ دیا جائے تب بھی فرش کا کچھ حصہ خالی رہجائیگا۔ سینٹ پیٹرس کی شہ نشینوں میں ۵۰ ہزار آدمیوں کے بیٹھنے کی گنجائش بتائی جاتی ہے، اور یہ تخمینہ بہت قرین قیاس ہے۔ چھت کی بلندی کا اندازہ یوں کیجیے کہ اگر وسطی گنبد کے اندر جو برآمدہ چھت سے ملا ہوا بنا ہے اُس پر کھڑے ہو جائے تو نیچے فرش پر چلنے والے انسانوں کی جسامت بکریوں سے بھی چھوٹی نظر آئے گی! عمارت کے ہر حصہ میں ایک پوپ کا مجسمہ اور ایک خوبصورت یادگار نصب ہے اور نیچے تہ خانوں میں اُن جانشنان مسیح" کی لاشوں کے بکس رکھے ہوئے ہیں! بہت سے اسقف اور راہب جو دنیا کے ہر گوشہ سے روما آتے تھے (مورخ نے اُس عہد کے متعلق کہا تھا کہ دنیا کی ہر سڑک روم کی طرف آتی ہے!) اور یہاں کی خونریزی میں اپنا خون ملا دیتے تھے، وہ سب بھی اُن ہی تہ خانوں میں سرداران مذہب کے پہلو بہ پہلو پڑے ہیں! صدر عمارت میں سنہری شامیانہ کے پاس دیوار میں ایک فاختہ کی تصویر چسپاں ہے، یہ فاختہ مسیحیت کی اصطلاح میں "مقدس فاختہ" کہی جاتی ہے، مدبرین اپنی اصطلاح میں آجکل اُس کو "امن کی فاختہ" کہتے ہیں، یہ وہی امن کی فاختہ ہے جو کبھی مسیحی دنیا میں امن قائم نہ رکھ سکی! جنھوں نے سب سے پہلے اس مقدس فاختہ کا گھونسلا سینٹ پیٹرس میں بنایا اُن کے ہاتھ بھی کہنیوں تک خون میں رنگے ہوئے تھے۔ میں جب اُس عمارت کی بے مثل صناعیوں کو دیکھتا پھرتا تھا تو میرا خیال بار بار

اُس فاختہ کی طرف جاتا تھا کاش کہ جناب پاپا اُس کا پنجرہ لیے ہوئے روم میں نہ بیٹھے ہوتے بلکہ اُس کو لیکر ایک دفعہ بلجیم اور فرانس کے اُن میدانوں میں بھی آتے جہاں انسان کی ہڈیوں کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں! مگر غریب فاختہ تو عہد قدیم میں خود اپنے گھر کے اندر امن قائم نہ رکھ سکی، اس عہد کے گناہگار اُس کے پروں کے سایہ کے نیچے کیونکر ہو سکیں! اب تو پاپا خود کبھی سال دو سال میں اس عبادتگاہ کے اندر آتے بھی ہیں تو خفیہ سرنگوں کے ذریعہ سے!

وٹیکن سینٹ پیٹرس کی سیر کرتے ہوئے ہم پاپائے روما کے ایوان کی طرف جا نکلے، اور معاً یہ معلوم ہوا کہ آج سے دو ہزار برس پہلے کوئی شہر آباد ہوا تھا اُسی میں ہم آج چل پھر رہے ہیں۔ مجھے یہ ادا بہت پسند آئی کہ پوپ نے اپنے گرد و پیش اپنے عہد جاہ و اقبال کی یاد کو ہر طرح تازہ رکھا ہے۔ وہی چھوٹی چھوٹی اینٹوں کی دیواریں، وہی پرانی قسم کے دروازے اور راستے ہیں، سڑکوں پر وہی اینٹوں کا فرش ہے، سوائے ایک چیز کے کہ عمارت کے اندر بجلی کے تار لگے ہوئے ہیں، کوئی چیز جدید نہیں، حتے کہ پوپ کی مختصر فوج کے سپاہی جو دروازہ پر پہرا دے رہے تھے۔ وہی عہد قدیم کی رنگین وردیاں پہنے ہوئے تھے، اس زمانہ کی گاڑیاں اور موٹریں جو اندر صحن میں کھڑی ہوئی تھیں وہ تو ایسی معلوم ہوتی تھیں کہ گویا کسی تصویر پر بدنما دھبے ڈال دیئے گئے ہوں، اُس سارے منظر سے یہ چیزیں جدا اور بے تعلق معلوم ہوتی تھیں پاپائے اعظم کی صورت نہ دیکھ سکا، لیکن اگر چاہتا تو دیکھنا مشکل نہ تھا اس لیے کہ جو شخص چاہے ملاقات کی درخواست کر سکتا ہے۔ خود پوپ اپنے محل سے باہر کبھی نہیں جاتے سوائے ایک پائیں باغ کے جس میں کبھی کبھی انکا ہوا دار نظر آتا ہے۔ شہر روما سے انکا کوئی تعلق نہیں اور ان کے محلہ سے سلطنت اٹلی کوئی واسطہ نہیں رکھتی۔ گویا اطالیہ کے موجودہ دارالسلطنت کے اندر ایک چھوٹی سی خود مختار ریاست ہے جس کے سیاہ سپید کا اختیار پاپا کے سوا کسی کو نہیں۔ یہ داستان بھی بہت دلچسپ ہے اور اگر موقعہ ہوتا تو میں اس زمانہ میں اُس کی کچھ تفصیل بیان کرتا، عہد جدید میں وہ "نان کوآپریشن" کی ایک بہت بڑی مثال ہے۔

پاپا نے جو کبھی ساری مقدس سلطنت روم کا مالک و مختار تھا اب اپنے آپ کو ایک محل کے اندر نظر بند کر لیا ہی اور ہر پوپ معہ اپنے تمام عہدہ داروں اور درباریوں کے سینٹ پیٹرس کی مسند پر بیٹھنے سے پہلے عہد کرتا ہی کہ وہ کبھی اور کسی حال میں غاصب شاہ اٹلی کی حکومت کو قبول نہ کریگا حتیٰ کہ اس دربار کے نزدیک سلطنت اٹلی کا کوئی وجود ہی نہیں، جو کچھ ہے پوپ ہے! شاہ اٹلی کی سلطنت کتنی ہی وسیع اور طاقتور ہو گیا کہ یہاں اُس کو کوئی جانتا ہی نہیں!

ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے!

قدیم مسیحیت کا یہ ٹوٹا ہوا مینار ابھی تک سر اُٹھائے کھڑا ہی اور اس کے گرد و پیش ایک نئی دنیا آباد ہی، بس یہ وہ نفرت کے ساتھ نظر کرتا ہی۔ جناب پاپا جنگل کے اُس مور کی طرح ہیں جو ناچا اور کسی نے اُس کو نہ دیکھا۔ سارے مراسم و مشاغل شاہانہ اسی چار دیواری کے اندر جاری ہیں اور چاہے وہ چند ہی ہوں مگر انکے دربار کے درباری وہی ڈراما کھیلتے رہتے ہیں جو کبھی اس طرح کھیلا گیا تھا کہ دنیا گونج اُٹھی تھی، گو کہ اس تھیٹر کے پردے اب بوسیدہ اور بے رنگ ہو گئے ہیں، اور ایکٹر بھی وہ نہ رہے اور جو ہیں وہ از کار رفتہ ہیں، لباس اور سامان آرائش بھی پُرانا ہو گیا، لیکن پُرانا ابلا تماشہ جاری ہی۔ پاپائے روما کی یہ وضعداری مجھے بھلی معلوم ہوئی! محل کے جو حصے دیکھے جا سکتے تھے اون کو میں نے بہت دلچسپی کے ساتھ دیکھا، لیکن وقت کم تھا اور ہزاروں آثار قدیمہ کو دیکھنا تھا جن کا دامن ساری دنیا کی تاریخ کے ساتھ وابستہ ہی!۔ البتہ ایک چیز کا اور ذکر کردوں۔ ہم نے سینٹ پیٹرس میں جو تصویریں لگی ہوئی دیکھیں ان سب کو قلمی تصور کیا، بعد کو معلوم ہوا کہ وہ سب رنگین پتھروں سے بنائی جاتی ہیں۔ اس صناعی کو موزیک کہتے ہیں اور اس کا بہت بڑا کارخانہ خود پوپ کے محل میں ہی جس کو ہم نے اچھی طرح دیکھا، درحقیقت حیرت انگیز صناعی ہی۔ معمولی الفاظ میں سمجھانا مشکل ہی کہ پتھر کے ٹکڑوں سے تصویریں اور ایسی خوبصورت تصویریں کہ من و عن قلمی معلوم ہوں، کیونکر بنائی جا سکتی ہیں۔ ہم نے دیکھا کہ صناع اس چابکدستی سے اُن تصاویر کو تیار کرتے تھے۔

کہ اٹلی کے بہترین مصور کی تصویر کو بجنسہ نقل کر لیتے تھے، ہزاروں مختلف رنگ کے پتھر کے
ٹکڑے ان کے سامنے رکھے ہوتے ہیں اور ایک چوکھٹے میں کوئی چپکانے والا مصالحہ بھرا ہوتا
ہے، صناع اُن ٹکڑوں کو اٹھاتا ہے اور اُس چوکھٹے میں چپکا دیتا ہے، رنگوں کی آمیزش اس
خوبی سے کرتا ہے کہ وہ ٹکڑے ملتے چلے جاتے ہیں اور تصویر کا صحیح نقشہ نمایاں ہوتا جاتا ہے ممکن نہیں
کہ ٹکڑے غلط لگ جاویں یا تصویر کی رنگ آمیزی ناقص ہو جائے۔

کلوزیم قدیم مسیحیت کے اس دارالسلطنت سے نکل کر ہم کلوزیم دیکھنے گئے۔ کلوزیم کیا
ہے۔ آؤ آج سے ایک ہزار ہ سو چالیس برس پہلے جو دنیا آباد تھی گھڑی بھر کے لیے
وہاں بھی چلیں، اور دیکھیں کہ شہنشاہ ٹیٹس کے دارالسلطنت میں کیا ہو رہا ہے؟ کلوزیم کی سیکڑوں
سڑھیوں پر اندر کی طرف نشست کی ایک جگہ بھی خالی نہیں وسط میں سب سے بلند شہنشاہ روما
اپنے تخت پر ریشم کے شامیانہ کے نیچے متمکن ہے، قرمزی رنگ کا ایک لباس پہنے ہوئے ہے اور دبدبہ
و طنطنہ قیصری کا یہ عالم ہے کہ سلطنت کا بڑے سے بڑا سردار بھی تخت شاہی کے قریب آنے کی جرأت
نہیں رکھتا، نیچے کی سیڑھی پر روم کی "کنواریاں" بیٹھی ہوئی ہیں جن میں سے ہر ایک سلطنت روما
کے لیے ایک ستارہ سعادت ہے، شہنشاہ کے بعد تمام سرداران سلطنت پر فضلیت ان ہی
کو حاصل ہے۔ "سن رسیدہ کنواریاں" جنھوں نے اپنی عمر میں بہت سے تماشے دیکھے ہیں خاموش
اور سنجیدہ ہیں، لیکن ان میں سے نوجوان لڑکیاں جن کو اس قوم کی توہم پرستی نے عمر بھر کے لیے
دنیا سے جدا کر دیا ہے جھکی ہوئی اس خونخوار تماشہ کو دیکھ رہی ہیں جو رومن قوم کا قومی کھیل
ہے، انکا سانس کس قدر جلد جلد آ رہا ہے، ذرا دیکھنا ان کے چہروں کی رنگت کیوں بدل رہی ہے وہ
دیکھو نیچے اکھاڑے میں اُس نوجوان کا پاؤں پھسل گیا جو ابھی ابھی شیر ببر پر تلوار کھینچ کر جھپٹا ہے،
خون کی کیچڑ اتنی ہے کہ پاؤں کا جمنا مشکل ہو گیا ہے، یہ لو، اس خونخوار بھینسے کی پیٹھ پر ایک دوشیزہ
زنجیروں سے جکڑی ہوئی ہے اور وہ بھینسا اب اُس سورما کی جانب آ رہا ہے جس کے ہاتھ میں
ایک تیغہ ہے، لو وہ اس بھینسے کے سینگ نے پہلوان کے سینہ میں شگاف کر دیا، نوجوان "کنواری"

گھبرا گھبرا کر چاروں طرف دیکھتی ہے، دل میں کہتی ہے ہائے کیا اس زنجیروں سے جکڑی ہوئی دوشیزہ کو کوئی نہ بچا سکیگا، کیا روما قوم کا کوئی سورما بھینسے کی خونخواری کا مقابلہ نہ کرسکیگا۔۔۔
۔۔۔۔۔۔۔ اُن کنواریوں کی نشست سے نیچے، روما کے معمر سردار اور منصب دار اپنی ٹھوڑیوں کو تلواروں کے دستوں پر رکھے ہوئے "تماشہ" دیکھ رہے ہیں۔ ان کے بعد نیچے کی صفوں میں دارالسلطنت کے ہزاروں شہری صف در صف بیٹھے ہوئے ہیں، اکھاڑے میں خوفناک درندے بڑے بڑے نوجوان پہلوانوں کو چیر رہے ہیں اور چبا رہے ہیں، جو سورما ابھی ابھی اپنی تلوار چمکا تا ہوا گیا تھا درندوں کے تیز پنجوں میں ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا ہے! اور ہر کھلاڑی جب اس طرح شکار ہوتا ہے تو احسنت مرحبا کی ۸۰ ہزار آوازیں، نعرے، اور چیخیں، پیہم بلند ہوتی ہیں۔ سب سے آخر میں اِس خونیں تماشے کا آخری منظر! ایک طرف سے اکھاڑے کا دروازہ کھلتا ہے اور چند دس بیس پچیس نوجوان اور سن رسیدہ عورتیں اور مرد ہلکا اور بالکل سپید لباس پہنے ہوئے داخل ہوتی ہیں، معاً دوسرا دروازہ کھلتا ہے اور دس بیس شیر، مست جنگلی بھینسے اور ریچھ نمودار ہوتے ہیں، یہ تماشہ چند لمحہ کا ہنگامہ ہے، ایک دفعہ پلک مارتی چند چیخوں کی آواز آئی اور سناٹا ہو گیا۔ اب سوائے اُن درندوں کے غرانے کے جن کے مُنہ سے گوشت کے ٹکڑے اور انسانوں کے ہاتھ پاؤں لٹکتے نظر آتے ہیں، ہر طرف سکوت ہے، درندوں کو گرم لوہے کی سلاخوں سے دروازے کی طرف ہٹایا جا رہا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ ہٹتے جاتے ہیں، دیکھو نا، یہ معلوم ہوتا ہے کہ بڑے بڑے بلوں کے مُنہ میں چھوٹے چھوٹے سفید چوہے ہیں، اور اُن سے خون کی دھاریں گر رہی ہیں۔ آخر شکار ختم ہو گیا، دونوں طرف کے دروازے بند ہو گئے اور اب اکھاڑا خالی ہے، کانوں پر ہاتھ رکھ لو، پردے نہ پھٹ جاویں، روما ۸۰ ہزار بہادر شہری اِس "تماشہ" کی داد دے رہے ہیں! شہنشاہ اپنے غلام کی جانب متوجہ ہوتا ہے اور غلام ادب کے ساتھ ایک ہاتھ سینہ پر رکھ کر مئے ارغوانی کا جام لبریز پیش کرتا ہے، بہادر شہنشاہ جام کو منہ سے لگاتا ہے اور کچھ اس طرح مست ہو کر پیتا ہے کہ شراب کے چند قطرے اُسی طرح اُس کے مُنہ سے بھی گرتے ہیں۔ جس طرح شیروں کے

منہ سے انسان کا خون بہ رہا تھا! تم پوچھتے ہو یہ سب لوگ کون تھے جنکو شہنشاہ گیتی پناہ نے درندوں کے دسترخوان پر رکھوا دیا؟ میں ایک مورخ کی زبان سے جواب دیتا ہوں،

یہ سب عیسائی تھے جو مسیح کا پیام لیکر روما میں آئے تھے! تماشہ دیکھ لیا، اب عالم خیال سے واپس آئے اور اینٹوں اور پتھروں کی اُن سر بفلک دیواروں کو دیکھیے جو روما کے اقبال اور بہادران روما کے سپاہیانہ (۱) مشاغل کی آخری یادگار رہیں! کلوزیم! اس نام سے رو نگٹے کھڑے ہوتے ہیں، لیکن فلسفی کہتا ہے کہ کلوزیم کے تماشہ دیکھنے والوں کو گالیاں نہ دو! وہ تو اُس عہد کی یادگار ہے جب انسانیت نے حیوانیت کے حدود سے ذرا ہی قدم آگے رکھا تھا، جسم کے لمبے بال اور نوکدار ناخن باقی نہ تھے مگر طبائع کے اندر بہیمیت کے بہت سے عناصر ہنوز موجود تھے، اور کچھ کم بھی وہ عناصر موجود تو اب بھی ہیں، مگر میں کہتا ہوں کہ ایسے انسانی صورت درندے تو ایشیا میں بستے تھے، یورپ کے آباد اجداد کو اس حیوانیت سے کیا نسبت، وہ تو کچھ اور ہی ہوں گے۔ جنکی اقبالمندی اور علو ہمتی کی قسم آج تک کھائی جاتی ہے!

عیسائیوں کو ناز ہے کہ انھوں نے مذہب کی خاطر کیسی کیسی سختیاں جھیلی ہیں! اور آخر ساری دنیا کو مہذب بنا دیا! لیکن آج اگر پاپائے روما کلوزیم میں بے قصور عیسائیوں کے درندوں کے سامنے ڈالے جانے کا ذکر فرمائیں تو میں عرض کروں کہ عیسائیت کے بہترین زمانہ میں اسپین احتساب غیر عیسائیوں کے لیے درندوں کی بجائے آگ سے کام لیتی تھی، اتنا ہی تو فرق ہے! اور اُن آلات عقوبت کا کیا ذکر جن کی تفصیل خود مورخین یورپ نے لکھی ہے!!

شہنشاہ فلیوس وسپاسیانو نے ۲ے۰ء میں کلوزیم کی بنیاد ڈالی، تاکہ اسکو دربار اور اہل روما کے لیے تفریح کی ایک عمارت عامہ قرار دیا جائے اور اُس زمانہ کی انسانیت کے معیار کے مطابق اس میں سپاہیانہ کھیل تماشے، اور بہادری و جرأت کے مظاہرے ہوا کریں۔ ۸۰ء میں شہنشاہ وسپاسیانو کے بیٹے ٹیٹس نے اس عمارت کا افتتاح کیا۔ تقریب افتتاح اس طرح منائی گئی کہ تقریباً ۵ ہزار جنگلی درندے اکھاڑے میں چھوڑے گئے اور ہزاروں سورما۔

(جن کو اس زمانہ کی اصطلاح گلیڈیٹر Gladiator کہتے تھے) اُن درندوں سے دست بدست مقابلہ کرنے کے لیے اندر داخل ہوئے۔ پھر جو تماشہ "اہل روما نے دیکھا وہ اندازہ تخیّل سے باہر ہے! ہزاروں درندے ہزاروں انسانوں کو پیٹتے ہوئے ہیں اِن کی تلواریں اُن کے جسم میں اور اُن کے پنجے اُن کی کھال میں پیوست ہیں گوشت کے پرزے اِدھر اُدھر اُڑ رہے ہیں اور خون کے فوارے تماشائیوں کے صف اول تک پہنچے ہیں ہزاروں انسان اور درندے اس طرح فنا ہوئے کہ لاشیں بھی پہچانی نہ جاتی تھیں! الغرض اہل روما کے تماشہ گاہ کا افتتاح یوں عمل میں آیا! عمارت ایک سو ستر گز بلند ہے اور اس کا محیط ۵۰۰ گز ہے۔ دیواروں کا زیادہ حصہ ابھی تک محفوظ ہے اور آثار قدیمہ کے ماہرین نے ایک چھوٹے سے حصہ کو اُسی طرح پھر تیار کر دیا ہے جس طرح کہ اُن کے خیال میں وہ شہنشاہ ٹیٹس اور اُس کے جانشینوں کے عہد میں تھا۔

رومی حمام

مہذب رومن شہری جب کلوزیم کے تماشوں سے سیر ہو جاتا تھا تو اپنا وقت اُن حماموں میں صرف کرتا تھا جن کے نام سے آج تک یورپ کے بہترین حمام منسوب کیے جاتے ہیں، لیکن ان حماموں کے آثار دیکھکر معلوم ہوتا ہے کہ دولت و سطوت و نفس پرستی کے اِس عہدِ جدید میں بھی حمام کی وہ عظیم الشان عمارتیں خواب و خیال سے باہر ہیں، لندن و پیرس کے جو حمام ہم نے دیکھے وہ تو روما کے قدیم حماموں کے مقابلہ میں محض کھلونا ہیں، یوں تو بہتر سے بہتر متعدد حمام موجود تھے لیکن کراکلا کا حمام عامۃ الناس کے لیے تعمیر کیا گیا تھا جس میں ۱۲ ہزار آدمی روزانہ اور اکثر بہ یک وقت غسل کرتے تھے، ناشتہ ہر شخص کو مفت ملتا تھا! سینکڑوں سنگ مرمر کے ستون متعدد بڑے بڑے حوض، گرم پانی کے نل، سنگ مرمر کے فرش کی بے مثال پچہ کاری، بیٹھنے کے لیے کرسیاں، چبوترے جن پر لیٹ کر خوشبوئیں ملوائی جاتی تھیں۔ وسیع برآمدے جہاں ناشتہ کھایا جاتا تھا، یعنی جب وہ حمام اپنی پوری آرائش کے ساتھ آباد ہوگا تو میں کہہ سکتا ہوں اس کا ہر کمرہ دیوانِ عام اور دیوانِ خاص سے وسعت اور خوبصورتی میں کسی طرح کم نہ ہوگا۔ اور کہنے کو کچھ بھی نہ تھا اہل روما کا محض حمام

تھا ! قیمتی پتھروں کے نہانے کے حوض اور "ٹب" اور طشت آج تک پاپائے روما کے عجائب خانہ میں موجود ہیں۔ اور ان کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ان قیمتی پتھروں کے اتنے بڑے ٹکڑے کہاں سے ملے کہ ایک آدمی کی پوری جسامت کے قابل غسل کرنے کا حوض ایک ہی ٹکڑے میں سالم بنا لیا گیا۔ عہد قدیم کی ان عجائبات کو دیکھیے اور حیران رہ جائیے !

قاضی عبدالغفار

لوزان کانفرنس

مغرب کے کارکنان قضا و قدر جب کبھی اقوام مشرق کی قسمتوں کا فیصلہ کرنے بیٹھتے ہیں تو ان کی ایک ہاں اور ایک نہیں پر کروڑہا انسان کے سر تن سے جدا ہو جاتے ہیں' پیاسی زمین معصوم انسان کے لہو سے سیراب ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ بندگانِ خدا جن کی قسمتوں کا فیصلہ ہونے کو ہے کبھی نظر اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتے کہ یہ شاطرانِ مغرب کن کن چالوں سے بازی جیت لینے کی کوشش کرتے ہیں، ابھی حال ہی میں مشرق قریب کے فیصلہ کے لیے جو کانفرنس لوزان میں منعقد ہوئی تھی' ہم میں سے کتنے ایسے ہیں جو اس کی اصل حقیقت و واقعات سے واقف ہیں۔ مضمون ذیل لندن کے ایک معتدل رسالہ نائنٹینتھ سنچری (مارچ ۱۹۲۳ء) کا ترجمہ ہے جو قارئین "جامعہ" کے لیے بتمامہ درج کیا جاتا ہے۔

(سعید)

اکتوبر ۱۹۱۸ء کے صلحنامہ میں جو بنیادی مسائل تھے اُن میں سے ایک آبنائے کی آزادی اور دوسرے حقوق اقوام کے تحفظ کا مسئلہ تھا۔ جو اناطولیہ اور تھریس کے غیر ترکی صوبوں میں تا وقتیکہ (برشرط دفعہ ۷) یورپ میں اتحادیوں کا مفاد خطرہ میں نہ ہو یا آرمینی ولایتوں میں بد نظمی نہ پیدا ہو حاصل کیا جانے کو تھا۔ اس موقع پر ترکوں نے اس بری طرح شکست کھائی تھی اور اس قدر کمزور اور پست ہمت ہو گئے تھے کہ ان سے تقریباً ہر قسم کے شرائط کا منوانا بہت آسان تھا۔ لیکن پیرس میں دول متحدہ کی حرص و آز نے کسی ایسے صلحنامہ کو عمل میں نہ آنے دیا۔

بجائے اس کے کہ اتحادی شرائط صلح کے پابند رہتے" انھوں نے قسطنطنیہ، اناطولیہ اور تھریس کے متعدد اضلاع پر قبضہ کرنا شروع کر دیا جو مجوزہ حدود سے باہر تھا حالانکہ کسی حیلہ جوئی سے بھی جو انھوں نے دفعہ ۷ میں رکھی تھیں وہ ایسا کرنے کے مجاز نہ تھے۔

روس کے یکایک انقلاب ہو جانے کی وجہ سے یہ معاہدۂ جنگ عمل میں آیا جس کی رو سے یہ طے پایا کہ قسطنطنیہ، روس کو دیا جائے مشرقی اناطولیہ کا ایک حصہ خالی کر دیا جائے

اور اپریل ۱۹۱۷ء کا عہد نامہ سنیٹ مارین بھی ختم ہو گیا جس کی رو سے سمرنا اور ضلع ادالیہ اٹلی کو دیا جانے والا تھا، اور اس وجہ سے قسطنطنیہ اور خطہ ابنائے کا مسئلہ ہنوز زیر تجویز ہی رہا۔ اس وقت عام رجحان یہ تھا کہ دار الخلافہ عثمانیہ کسی یورپی طاقت کو نہ دیا جائے اور اگرچہ مسٹر لائڈ جارج اس حد تک آ گئے تھے کہ قسطنطنیہ اور ایشیائے کوچک ترکوں کو واپس دیدیا جائے، انگلستان اور فرانس دونوں معاہدۂ جنگ سے نجات پا جانے پر شاداں تھے اور ترکی کو مال مفت کی طرح باہمی مفاد کے لیے دول یورپ میں تقسیم کیا جا رہا تھا۔

اختتام جنگ کے قریب یونان کی غیر جانبداری تسلیم کر کے اس میں ایک نئے عنصر کا اضافہ کر لیا گیا اور اس کو مقدونیہ میں فوجی نقل و حرکت کی اجازت دیدی گئی جو ایک حد تک مفید ثابت ہوئی۔ اتنی بات ایم دینیز لاس کے لیے کافی تھی کہ وہ مجلس عالیہ (سپریم کونسل) کے سامنے اپنے ناقابل قبول مطالبات پیش کریں یعنی یہ کہ قسطنطنیہ، پورا تھریس، جنوبی البانیہ، داڈیکنیز بندر سمرنا اور اناطولیہ کا کچھ حصہ یونان کو دیا جائے اسے درحقیقت صرف سمرنا اور تھریس کے ملنے کی توقع تھی لیکن وہ وہی مشرقی چال چلا۔ بگرشس گیرتا یہ تپ راضی شود۔ انگلستان اور فرانس دونوں اس سے خوش تھے کہ ایشیائے کوچک میں اٹلی کا قائم مقام اب یونان ہو گیا ہے لیکن اٹلی نے اس سے اتفاق نہ کیا اور ترکی کے تمام سول اور فوجی ملازمین نے خواہ برطانوی ہوں یا غیر برطانوی اس سے اختلاف کیا کہ ایشیا کا کوئی حصہ یونان کو دیا جائے جس کی وجہ سے اندیشہ ہی کہ نہ صرف دولت عثمانیہ میں بلکہ تمام اقوام اسلامی میں خطرناک جذبات مشتعل ہو جائیں گے۔ صرف اٹلی کا اختلاف پیرس میں یونان کے مطالبات کو رد کرنے کے لیے کافی تھا۔ لیکن ۱۹۱۹ء میں تمام دول کے نمایندگان نے باوجود اپنے اپنے مقامی تجربہ کاروں کی اختلاف رائے کے سمرنا یونان کو دیدیئے جانے کا تصفیہ کر دیا اور مئی میں یونانی فوجوں نے برطانوی بیڑے کی زیر سرکردگی جس میں فرانس کا کوئی حصہ نہ تھا، سمرنا پر قبضہ کر لیا اور جلد ہی اندر کی جانب پھیلنا شروع ہو گئے۔

اس یونانی انڈے کا ترکی آشیانے میں رکھا جانا ان مظالم اور قتل و خونریزی، کثیر مال و اسباب کی بربادی اور ترکی میں ایک نئی قومی روح کے پیدا کرنے کا اصلی سبب ہو گیا۔ یونانیوں کے ایشیائے کوچک میں رکھے جانے کے مجنونانہ فیصلہ کی تمام تر ذمہ داری مسٹر ونیزلوس اور مسٹر لائڈ جارج پر ہے۔ جس کی تائید ایم کلیمنشو نے بھی بادل ناخواستہ کر دی تھی۔

امریکہ کی طرح ترک بھی دول عظمی میں سے کسی ایک کے یا اٹلی کے (حالانکہ اس کے متعلق شبہ ہے) مطیع ہو کر ختم ہو گئے ہوتے لیکن یہ قیاس کرنا کہ ترک کبھی ان لوگوں کے مظالم اور بدنظمیوں کو جو صدیوں تک ان کے غلام رہ چکے ہیں برداشت کریں گے ترکی جذبات کی تحقیر اور ان سے عدم واقفیت ثابت کرنا ہے۔ یونانیوں کا رویہ سمرنا میں جو رہا وہ اب اظہر من الشمس ہے گو دول نے بین الاقوامی اتحادی کمیشن کی رپورٹ کو چھپانے کی ہمیشہ کوشش کی لیکن اس کے شائع ہونے سے یہ ظاہر ہو جائے گا کہ سمرنا میں ترکوں کا یونانی مظالم کی جی توڑ کر مزاحمت کرنی (جو بالآخر کامیاب ہوئی) معقول وجوہ پر مبنی تھی۔ کوئی اور شے انہیں یورپ کے مقابل میں نفرت اور ہمت کے جذبات سے اس سے زیادہ سرشار نہ کر سکتی تھی۔ لیکن اگرچہ وہ قسطنطنیہ اور تھریس کے قبضہ کو معاہدہ کے خلاف سمجھتے تھے لیکن ان کا تمام تر غیظ و غضب یونانیوں پر اترا آیا۔

ان جذبات نفرت و حقارت کے ساتھ قوم پرستوں کی جماعت مصطفےٰ کمال کے علم کے نیچے آ گئی اور یہ تجویز پاس کی کہ "یا تو ہم مکمل آزادی حاصل کریں گے یا اسی کوشش میں مر مٹیں گے" یہ ظاہر ہے کہ وہ مخلوط ملی حکومت (کولیشن گورنمنٹ) جو ترکی کے مٹانے پر تلی ہوئی تھی اسی نے اسکی ترقی و عروج کے تخم پاشی بھی کی۔ اس موقع پر حکومت ائتلاف نے یہ کچھ نہ دیکھا کہ آئندہ کیا ہو گا اور آنکھیں بند کیے ہوئے ترکوں کو مردہ سمجھتے رہے۔ اپریل سنہ ۱۹۲۰ء میں مجلس عالیہ نے ایک عہدنامہ کے دفعات مرتب کیا جو بعد میں عہدنامہ   کے نام سے موسوم ہوا جس کی رو سے یہ قرار پایا کہ ترک سمرنا اور اناطولی یونان کو دیدیں اور دوسری تقسیم کے لیے بھی راضی ہو جائیں اس مرتبہ بھی برطانوی اور فرانسیسی فوجی مشیروں نے ان تجاویز کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور

لائڈ جارج نے ان تمام ہدایات کو پس پشت ڈال کر ترکی کو نقشے سے مٹا دینے اور ان پر خود ان کے قدیم محکوم قوم سے جو کبھی آپ اپنے اوپر بھی بہتر حکومت کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔ حکومت کرانے کی پالیسی اختیار کی۔

معلوم ہوتا ہی کہ بالشویکی عنصر بالکل نظر انداز کر دیا گیا حالانکہ اس کی بمشکل امید کی جا سکتی ہی کہ سویٹ کبھی ایسے موقع کو ہاتھ سے جانے دیں گے۔ اُنھوں نے اس موقع سے فائدہ اُٹھایا اور ترکوں سے جو اس وقت از حد ضرورتمند تھے اُنھوں ہر طرح کی امداد کے فیاضانہ وعدے کیے۔ اگرچہ بالشویزم اصول اسلام کے بالکل منافی ہی اور اگرچہ روس ہمیشہ سے ترکی کا جانی دشمن رہا ہی پھر بھی مصطفےٰ کمال نے سویٹ کے ان وعدوں سے انکار نہ کیا اور سامان جنگ کی اعانت منظور کی لیکن روسی فوج یا بالشو یکی پروپگنڈا قبول کرنے سے قطعی انکار کر دیا یہ نامبارک معاہدہ جسے اتحادیوں کی حرکتوں سے مجبور ہو کر ترکوں نے کیا مارچ ۱۹۲۱ء میں بمقام ماسکو عمل میں آیا اور اگرچہ سلطنت برطانیہ کے لیے یہ معاہدہ خطرات سے پُر ہے ہم نے اسی کو بے کار کرنے کے لیے کبھی کوئی کوشش نہ کی۔ ہم نے یہ بالکل نہیں سمجھا ہی کہ ترکی بیداری دنیائی اسلام کی بیداری نہیں بلکہ صرف قومی ہی۔ یہ بذات خود ہمارے لیے کوئی خطرہ نہیں بلکہ ترکوں نے اگر صلح جنبانی میں ذرا بھی کوتاہی کی تو دول ایتلاف میں ان کا روس سے تصادم ہونا زیادہ اغلب ہی۔

اس موقع پر بالشویکوں کے میدان میں اُتر آنے کا اثر ۱۹۲۱ء میں یہ ظاہر ہوا کہ اسلام نے تمام عیسائی حکومتوں کے خلاف بغاوت کر دی۔ یہ کلام بلاشبہ بالشویکوں اور کسی قدر جرمنوں کا تھا نہ کہ ترکوں کا جنھیں یونانی پیشقدمی کے روکنے سے ہی بہت کم فرصت ملی تھی۔

اگرچہ اتحادیوں نے یہ دیکھ کر کہ ایشیا میں واقعات کی رفتار ان کے حسب خواہش نہیں ہی اس جنگ میں اپنی غیر جانبداری کا اعلان کیا، فرانسیسیوں نے جنھیں سا یلیشیا میں بہت سے مصائب کا سامنا کرنا پڑتا تھا، ترکی سے ایم فریکلن بویلان کے ذریعہ ایک جداگانہ معاہدہ کر لیا لیکن اس

سے حالات میں کچھ زیادہ تبدیلی نہیں ہوئی بجز اس کے کہ ترکی کو اپنی ایک تھوڑی سی فوج سے شمال میں استعمال کرنے کا موقع ہاتھ آ گیا۔ اور ۱۹۲۲ء میں باوجود غیر جانبداری کے انگلستان کی یونان نوازی نے ان کی مزید حوصلہ افزائی کی۔ اس وقت تک خود یونانیوں کو اپنی ناکامی کا احساس ہو گیا تھا اور فروری میں اس بدنصیب ایم گونریس نے ایک خط اس مضمون کا لندن لکھا کہ مادی امداد فوراً نہ بھیجی گئی تو یونانی فوج فوراً خالی کر دے گی، وزیر یونان انگلستان کو امداد کا ذمہ دار اور مزید براں اپنا اتحادی سمجھتا تھا۔ بہر حال اس خط نے وزارت انگلستان پر اتنا اثر بھی تو نہیں کیا کہ مسٹر لائڈ جارج اور ان کے رفقا اس کو پڑھنے کے بعد یاد رکھتے۔

بالآخر امداد کی طرف سے مایوس ہو کر یونانیوں نے اتحادیوں کو اکسانے اور جوش دلانے کا طریقہ اختیار کیا اور وہ یہ کہ ایشیائے کوچک میں تمام مسلمانوں کو پس پشت ڈال کر یونانی حکومت آیونینہ کے بنانے اور پھر قسطنطنیہ پر حملے کرنے کے ارادہ کا اعلان کر دیا۔ یہ کسی طرح ممکن نہ تھا اور یونانی افواج کی شکست اور ترکی افواج کی بابعالی کی طرف پیشقدمی کے بعد ہی چناق کا واقعہ اور معاہدہ مدنیہ پیش آیا جو لوزان کانفرنس کی تمہید تھی۔ یہ واقعات ناظرین کے دماغ میں ابھی تازہ ہیں اس لیے یہاں ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

کانفرنس بعض عجیب و غریب حالات میں منعقد ہوئی اگرچہ دول وسطی کے ساتھ ترکی نے بھی شکست کھائی لیکن قوم پرستوں نے جنگ ہمیشہ جاری رکھی۔ اور اگرچہ اس جنگ عظیم میں اتحادیوں نے شکست کھائی لیکن خود بھی دول باتیلافت کے ایک ممبر دار اتحادی کو شکست فاش دی۔ صلح کی کانفرنسوں میں ایک فاتح ہوا کرتا ہے اور دوسرا مفتوح، لیکن لوزان کی مفتوح جماعت فاتح کی حیثیت میں تھی۔ اور پہلی جماعت فاتح کے شریک نے بری طرح شکست کھائی تھی۔ حامل ترک کبھی اس حیثیت میں نہ آئے تھے کہ وہ بالکل شکست خوردہ ہیں اور فاتحین جو شرائط چاہیں ان سے منوالیں۔ معاہدہ سیورے کی ناکامی کے بعد سے دول نے حالات کی اسقدر تبدیلی تو تسلیم کر لی تھی کہ کانفرنس مصطفےٰ کمال کے ساتھ بحیثیت ان کی درمیانی صلح کن شخص کے منعقد ہو نہ کہ

دول خود فاتح بنکر رہیں۔ باوجود اس کے ترکوں کے ساتھ اس طرح سلوک کیا گیا جس طرح مسرف بیٹے کے ساتھ کیا جاتا ہے تاکہ وہ نہایت عجز وحلم کے ساتھ اظہار پشیمانی کرے ترکوں کی اسکیم یہ تھی کہ ان کے معاہدۂ قومی کی تعمیل کی جائے جس کی رو سے انھیں اپنے حدود کے اندر مکمل خود اختیاری آبادیوں کی آزادی اور غیر ملکی مفاد کا ضروری تحفظ حاصل ہو۔ اتحادیوں کے پروگرام میں بھی انھیں حقوق کے حفاظت کرنی تھی اور اگرچہ اس کا اعلان نہیں کیا گیا لیکن وہ ترکی خود مختاری کو حتی الامکان ملکی وسیاسی دونوں حیثیتوں سے محدود کر دینا چاہتے تھے۔ اس غرض کے لیے انھیں قوم پرستوں کی مادی قوت کا لحاظ رکھنا پڑا جن کے ساتھ بالشویک روس کی غیر محدود اعانت اور جرمنی کی اخلاقی حمایت بھی جو یقیناً لاسین میں اپنا کام کر رہی تھی، شامل تھیں۔ بین الاقوامی قوانین اور اخلاقی اصول کی بنا پر قلیل التعداد آبادی اور حقوق خود اختیاری کی حیثیت سے دول کو ترکی کے یونان پر فتحیابی اور غلبہ بہ لحاظ تعداد کے مطالبات تسلیم کرنے ہی پڑے۔ ان کا پروگرام بالکل عام تھا جیسے انگلستان، فرانس اور اٹلی ہر ایک مختلف نقطہ نظر سے متفق تھے۔ جہاں تک دول ادنیٰ کا تعلق ہے (جن کے مفاد دول عظمیٰ سے کہیں زیادہ متعلق تھے) انھیں کچھ کہنا نہ تھا اور انھوں نے مجبوراً معاملہ کو اپنے بڑے بھائیوں پر چھوڑ دیا تھا کہ وہ آپ ہی نپٹ لیں۔ بدنصیب یونان کی حالت بد سے بدتر تھی دیگر اقوام کی مداخلت کی وجہ سے تباہی سے بال بال بچا تھا جس کی نمائندگی ایم ونیز لاس بے قاعدہ طور پر کر رہا تھا جس نے اپنے کو یونان کی انقلاب پسند حکومت کی طرف سے بلکہ یونانی قوم کے نمائندہ ہونے کا اعلان کیا تھا۔ اسکی تصدیق کی کیا حقیقت تھی؟ اور کہاں سے اس کو حاصل ہوئی؟ اس کا کچھ پتہ نہیں اور آیا حکومت اینتھنز یا یونانی افواج نے اس کے دستخط کو تسلیم منظور بھی کیا ہو گا؟ یہ بھی مشتبہ تھا۔ ان کے علاوہ دوران کانفرنس میں چند سابق وزرائے یونان اس جرم میں کہ انھوں نے ایم ونیز لاس اور دول کی جارحانہ کارروائی کی تعمیل کیوں کی سزایاب ہوئے یہ امر خود ایم ونیز لاس اور برطانیہ جو اس کی ذمہ داری میں شریک تھا دونوں کے لیے نہایت پریشان کن تھا یا ستائی ملقان

بھی کچھ مطمئن نہ تھیں اور کبھی کبھی دبی زبان سے کچھ بول دیا کرتی تھیں۔ بلغاریہ، یونان یا اور کوئی ریاست بھی تھریس ترکی کو دیئے جانے پر خوش نہ تھی اگرچہ سب کی سب اپنے علاوہ کسی اور کو دیدیئے جانے پر ترکی کو دیا جانا مرجح سمجھتی تھیں[1]۔

روسیوں کے متعلق یہ خیال تھا کہ مسئلہ آبنائے میں ان کی صرف آواز ہی آواز ہے حالانکہ انکا مطالبہ ترکوں سے کہیں زیادہ تھا اور انھیں ہمیشہ شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا کہ وہ کانفرنس کو توڑنے آئے ہیں۔

خاص خاص بین الاقوامی مسائل زیر بحث یہ تھے، آبنایوں کی آزادی، غیر ملکی باشندوں اور ان کے ذاتی، مالی اور معاشرتی مفاد کی حفاظت اور قلیل التعداد آبادی کے حقوق اور جان کا تحفظ آزادی آبنائے کے متعلق زمانۂ امن میں کوئی بڑی دشواری نہ تھی جو ہمیشہ ایسے زمانہ میں اس کو حاصل رہا کرتی تھی البتہ بعض حصوں میں فوجیں نہ رکھنے اور دوسرے فروعی سوالات پر بحث تھی۔ لیکن ترک کم از کم اتنا تسلیم کرتے تھے کہ صلح کے زمانہ میں خواہ کچھ بھی شرائط ہوں لیکن جنگ چھڑتے ہی کوئی بھی حکومت ہوتی اگر اس سے ممکن ہوتا، آبنایوں کو فوراً بند کردیتی جیسا کہ انگلستان نے جنگ عظیم کے زمانہ میں چینل کو بند کر دیا تھا۔ اس لحاظ سے قسطنطنیہ میں ہونے کی بنا پر ترکی بھی راستہ فوراً بند کر دینے کی مجاز تھی اور کانفرنس کا اس کے متعلق اسقدر شور وغل بالکل نمائشی تھا غیر ملکی حقوق ومفاد پر جانبین سے سخت مباحثہ رہا اور اسی مسئلہ پر

---

[1] یہ پورے طور پر مشتہر کر دیا گیا ہے کہ ترکی نے اپنی عیسائی رعایا کو نہایت بیرحمانہ طریقہ پر ستایا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ترکی حکومت ایک حقیقی نمونہ نہ تھی لیکن بعض لحاظ سے دیگر مشرقی یورپی سلطنتوں سے کسی طرح بری بھی نہ تھی۔ یونانی جو ایشیائے کوچک میں ترکوں کے مظالم سے اپنی اور دوسروں کے تحفظ کا اسقدر ڈھنڈورا پیٹتے ہیں، سمرنا میں صدیوں سے اسقدر خوشحال اور متمول ہیں کہ وہ اپنے کو یونان سے زیادہ بہتر حالت میں پاتے ہیں جہاں اچھی زندگی بسر کرنی دشوار ہے۔ اگر یہ سچ ہے کہ ترکوں نے ان پر مظالم کئے ہیں تو وہ خود بھی وہاں کیوں جمے رہے اور دوسرے یونانیوں کو کیوں بلاتے رہے ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ اب جبکہ ترکی حکومت مٹ رہی ہے انہیں یہ محسوس ہو رہا ہے کہ ترکی خواہ کیسی ہی بری کیوں نہ رہی ہو، ان کے ہمسایہ عیسائی اور یہودیوں سے لاکھ درجہ اچھی تھی۔

بالآخر کانفرنس کا خاتمہ بھی ہوا۔ اس قسم کے کسی تحفظ سے شہنشاہیت مقصود ہوتا تا اور اگر ترکی شہنشاہیت و انگریزی مصری شہنشاہیت کے معنی میں نہیں تسلیم کرلی جاتی تو دول یا ترکوں کے مطالبات منظور کرلیتے یا جنگ ہوتی۔

قلیل التعداد آبادی کے مسئلہ تحفظ میں ممکن ہے مختلف حکومتوں کے مختلف سیاسی مفاد شامل ہوں لیکن یہ معاملہ ترکوں کے گزشتہ طریقہ حکومت کی بنا پر خاصۃً عام انسانیت سے تعلق رکھتا ہے جہاں تک ایشیای کوچک میں یونانیوں اور آرمینیوں کا تعلق ہے، یہ مسئلہ قتل عام اور جلاوطنی نے اس کو صاف کر دیا ہے لیکن ان کے یا قسطنطنیہ اور تھریس کے دیگر اقوام کے متعلق خواہ صفحہ کاغذ پر کچھ بھی وعدے لے لیے جائیں کہ حقیقتاً یہ تمام تر ترکوں کی نیک نیتی پر مبنی ہے بدقسمتی سے ایسے دوسرے معاہدوں کی بھی کم و بیش یہی حالت ہے جس کی صورت یہ ہے کہ کوئی اور حکومت جو مناسب سمجھے نیکہ ان معاہدوں کی پابندی کرائے۔

ہمیں بسمارک کا وہ قول یاد ہے۔ اور ۱۹۱۴ء کے ناگوار تجربوں کے بعد بھی جو حکومت اس قسم کی قربانی اور مظالم کے لیے تیار ہے، بخوبی دوبارہ غور کرلے۔

مجلس اقوام کے آئندہ کارروائیوں پر بہت کچھ امید و اعتماد کیا جا رہا ہے لیکن اس لیگ نے ابھی بمشکل اتنا وزن اور اختیار اپنے میں پیدا کیا ہے جس سے یہ بھروسہ یا امید قائم کی جاسکے کہ اس کی کارروائیاں اراکین مجلس یا دیگر دول پر کوئی اثر بھی ڈال سکیں گی۔

ان بین الاقوامی مسائل کے علاوہ دول عظمیٰ اور دول ادنیٰ کے بہت سے قومی سوالات بھی پیدا ہوگئے تھے۔ ان میں سے ہر حکومت اپنے ذاتی مفاد کے لیے کوشاں اور دوسروں کی حمایت کی اس بنا پر متوقع تھی کہ بوقت ضرورت وہ اس کی مدد کرے گی۔

اس کی ایک بہتر مثال موصل کی تھی جس میں انگلستان کے سوا کسی دوسری طاقت کا کوئی مفاد براہِ راست نہ تھا لیکن تمام دول چاہتی تھیں کہ اس پر کوئی تفریق نہ ہو۔ تاکہ کانفرنس اور خود ان کے مفاد کا بے وقت خاتمہ نہ ہوجائے

لاسین کے مباحث میں دول عظمیٰ کے تمام نمائندے نہایت اعلیٰ جذبات سے کام لے رہے تھے۔ لیکن ان کی تہ میں اکثر مادیت کی بدنما صورت پنہاں ہوتی تھی۔ ترکوں جیسے سادہ دل اور کم تعلیم یافتہ لوگوں کے معاملہ میں نہایت اعلیٰ اخلاقی اور ذہنی افضلیت ظاہر کرکے پریشان کرنا بیکار تھا۔

دول عظمیٰ کے نمائندگان کے لیے یہ ایک بہت بڑا نقصان تھا کہ وہ ان مقامات کے حالات و واقعات کی اصل حقیقت سے جن سے ان کو کام پڑا واقف نہ تھے۔ جہاں تک معلوم ہوسکا ہے اگر کوئی برطانوی نمائندہ جو ترکوں، یونانیوں اور ریاستہائے بلقان کے متعلق حقیقتاً کچھ علم رکھتا رہا ہو۔ تو وہ ایک سر ایڈم بلاک کی ذات تھی اور اس نے خود میرے سامنے اسکا اعتراف کیا کہ موجودہ ترکوں کو آج کوئی نہیں سمجھ سکتا ہے۔ وہ سلطان عبدالحمید کے زمانہ کے بھولے بھالے ترک نہیں ہیں اور نہ انجمن اتحاد و ترقی کے خود غرض چالاک نوجوان ترک ہیں وہ عثمانی ترک بھی نہیں ہیں بلکہ ایک نئی نسل کے پرجوش قوم پرست ہیں جو یورپ کے اس خیال کی وجہ سے کہ ترکی بحیثیت طاقت نیست و نابود کر دیجائے سرگرم رہتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ لارڈ کرزن کو مشرق اور مشرقی اقوام کے متعلق بہت کچھ تجربہ حاصل ہے۔ لیکن ان کا تجربہ ترکی سے بھی دور مشرقی لوگوں کے متعلق ہے۔ اور خود ان کی (لارڈ کرزن) قدامت پسندی جذبات و طبائع میں کسی تغیر و انقلاب کے تسلیم کرنے میں مانع ہے۔

مشرق قریبہ میں تغیر حالات سے دول کی عدم واقفیت ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ گذشتہ چند سالوں کے اندر غلطیوں پر غلطیاں سرزد ہوئیں اور اتنے مصائب وقوع میں آئے۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ لارڈ کرزن کو مخلوطی حکومت (کولیشن گورنمنٹ) میں اسوقت وہی اعزاز حاصل تھا جو آج ہے لیکن یہ امید نہیں کی جاسکتی کہ وہ یکبارگی ایک نیا باب کھول دینگے۔ اور اپنے قدیم مقلدانہ رویہ کو بدل دینگے۔ درحقیقت یہ دیکھ کر شبہ ہوتا ہے کہ لارڈ کرزن جیسے عالی دماغ شخص مسٹر لائڈ جارج کی پالیسی کی اس طرح اندھی تقلید کرے غالباً ان کی صحت اچھی نہ تھی جس کی وجہ سے

وہ اس پالیسی کی مزاحمت کرنے کی بجائے اتباع کرتے رہے - پھر بھی ترکی، مصر، عراق اور فلسطین میں بالآخر ایک نیا باب کھولنا ہی پڑے گا۔

پیرس، کیئٹر، اور جنیوا میں مسٹر لائڈ جارج مشرقی سیاسیات کے بن دیکھے میدان میں قدم رکھتے ہوئے تمام مشوروں سے آنکھیں بند کیے کے خوشی کے مارے اچھلتے پھرتے تھے اور ان کے دائیں بائیں وزیر خارجیہ تھے جو انھیں انکی حرکتوں سے باز نہ رکھ سکتے تھے۔

لاسین میں لارڈ کرزن کا رویہ ترکوں کے ساتھ ایک ہیڈ ماسٹر کی طرح تھا اور بعض اوقات نیک دل اور طفلانہ - لیکن بہرصورت ایک مسلمہ لیڈر کا سا برتاؤ ضرور تھا - ان کا گھر کو رخصت ہونا جبکہ چوبیس گھنٹہ کے قیام میں وہ دستخط شدہ صلحنامہ کو جیب میں رکھ کر لیجاتے، ایک نمایاں خصوصیت رکھتا ہے - موصل کے معاملہ میں انگلستان کی بھی کچھ پیش نہ گئی - اور چونکہ یہ مسئلہ ان کی زیر غور سمجھا جاتا ہے، لہذا فی الحال اس میں پڑنا مناسب نہیں - لیکن یہ صاف ظاہر ہے کہ ترکی کے کسی مطالبہ پر بحث تک کرنے سے بھی لارڈ کرزن کا انکار کر دینا حقیقت میں بالفاظ دیگر کہنا تھا کہ انگلستان بجائے اس کے کہ ایک انچ بھی پیچھے ہٹے جنگ پر آمادہ ہے - یہ امر مشتبہ ہے کہ آیا کوئی برطانوی شہری موصل کے لیے جنگ کرنے پر تیار رہے تاکہ اس کو امیر حجاز سے لیکر جسے برطانیہ نے عراق پر لگا رکھا ہے، کسی بدوی سردار کے حوالہ کر دیا جائے۔ علاوہ اس کے مستند ذرائع سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاہ فیصل ترکوں کا موصل پر قابض رہنا زیادہ پسند کرتے ہیں بجائے اس کے کہ وہ خود اس معاملہ میں اپنے طاقتور ہمسایوں سے برسرپیکار رہیں - یہ دیکھ کر لارڈ کرزن اپنے حیثیت پر دوبارہ غور کر رہے ہیں اپنی نہیں بلکہ انگلستان کی حیثیت پر - وہ اس کی توقع نہ کر سکتے تھے کہ فرانس یا اٹلی موصل کے لیے ان کے ساتھ جنگ میں شریک ہوں گے۔

اسی لیے بجائے صاف انکار کرنے کے انھوں نے یہ مسئلہ مجلس اقوام کے حوالہ کیے جانے کی تجویز کی ہے - ترکوں نے جو لیگ کے ممبر نہیں ہیں اس فیصلہ پر اعتراض کیا۔ لارڈ کرزن کے اس تجویز کی غرض یہ بھی کہ انکار صاف کے جو نتائج ظہور پذیر ہوں، انکی

ذمہ داری ان کے بجائے لیگ کے شانوں پر آئے۔ یہ اگرچہ ایک اچھی سیاسی چال تھی لیکن برطانیہ عظمیٰ جیسی سلطنت کے شایان شان نہیں جبکہ اسکی غرض اس قدر صاف ظاہر ہو چکی تھی۔ اس چال سے اتنی کامیابی تو ضرور ہوئی کہ تمام کارروائی ایک سال کے لیے رک گئی اور اس وقت تک امید ہے کہ اس مسئلہ کی اہمیت بھی جاتی رہیگی۔

اس مضمون کے لکھنے کے وقت تک یہ یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ آیا کانفرنس پھر دوبارہ ہوگی یا نہیں، اس لیے کانفرنس کی کامیابیوں اور ناکامیوں پر زیادہ گفتگو کرنی بے سود ہے۔

یہ ایک بڑی ناانصافی ہوگی اگر کانفرنس کے اس ناکامی کا کوئی ایک واحد سبب قرار دیا جائے، یا برطانیہ کے کارگزاریوں پر اس تنقید و تبصرہ کے بعد جو گزشتہ صفحات میں کیا گیا، برطانوی نمایندگان کے تمام رویہ کو برا سمجھا جائے۔ لارڈ کرزن کو ایک مختلف العناصر جماعت کے رہنمائی کرنی پڑی اور ترکوں کے اکثر غیر معقول اور احمقانہ حرکتوں سے وہ غصہ و اشتعال کی انتہائی حد کو پہنچ جاتے تھے۔ کسی نہ کسی کو تو تمام رہبری اپنے ہاتھ میں لینی ضرور تھی اور لارڈ کرزن کی سرکردگی متفقہ طور پر منظور ہوئی اور بعد میں پسندیدگی اور تعریف کا بھی اظہار کیا گیا۔ کوئی دوسرا شخص اس کی بجائے اس سے بہتر کسی حالت میں نہیں ہو سکتا تھا اور اگر ان سے اتفاقیہ کچھ غلطیاں سرزد ہوئیں تو ہر بڑے شخص کی طرح، اس کا سبب یہ تھا کہ اسمیں اچھے اوصاف کے ساتھ کچھ کمزوریاں بھی تھیں۔

کوئی سمجھدار شخص جو کانفرنس کے انعقاد اور اس کے عارضی شکست کے اسباب کا متلاشی ہو، یہ سوال کیئے بغیر نہیں رہسکتا کہ "کیا ہماری خارجیہ پالیسی میں تبدیلی کی فوری ضرورت نہیں ہے؟" سب سے بڑے واقعات جن کی وجہ سے کانفرنس منعقد کی گئی دو تھے۔ (۱) یونانیوں کی شکست (۲) واقعہ چناق۔ اس موقع پر مخلوطی حکومت (کولیشن گورنمنٹ) نے ترکی سے جنگ کرنے پر آمادگی ظاہر کی بجائے اس کے درہ دانیال سے قدم اٹھالیں اس کی سب سے بڑی وجہ یہ پیش کی جاتی ہے کہ برطانوی پرسٹیج (رعب و وقار) اٹھ جاتا۔ مگر ہم نے دیکھا کہ فرانس اور اٹلی نے ایسا کرنے سے اپنا کوئی وقار نہیں کھویا اور اس کے بتانے کی کوئی ضرورت

نہیں کہ اُس وقت برطانوی پرسٹیج پر کیا اثر پڑتا جبکہ ترک کمک کا انتظار کیے بغیر فوراً قلعہ پر حملہ کرکر انھیں برباد کر دیتے جیسا کہ اکثر فوجی ماہرین کے خیال کے بموجب اغلب تھا۔

رعب و وقار سے بھی زیادہ ضروری سوال یہ تھا کہ آیا اتنے سے کام کے لیے جنگ کرنا مناسب بھی تھا ؟ کیا ہم نے اس پر کبھی غور کیا ہے کہ اس جنگ میں جبکہ اتحادیوں میں سے کسی کی ہمدردی بھی اس کے ساتھ نہ ہوتی اکیلے برطانیہ کی کیا حالت ہوتی ؟ - انگلستان کو ایشیائی کوچک میں فوجی پیشقدمی کرنی ہوتی اور ممکن تھا کہ اُسے ترکی بالشویکی افواج کے تعاقب میں سائبیریا کے دشوار گزار اور اجنبی ملک میں دوڑنا پڑتا - ساتھ ہی اس کو بحر روم کے سواحل کی نگرانی بھی قسطنطنیہ سے لیکر افریقہ میں سلم تک کرنی پڑتی - اور عراق، ٹرانسجاردینیہ، فلسطین اور مصر کے حکمرانوں کی بھی حمایت یا مخالفت کرنی ہوتی - اس بے چینی اور خلفشار کی وجہ سے یہ امید نہ تھی کہ بالشویکی اور ترکی پروپگینڈا کامیاب ہونے سے رہتا - انگلستان کی حالت اس وقت جنگ عظیم کے زمانہ سے بھی زیادہ دشوار ہو جاتی - اور اس مہم میں جان و مال کی جو عظیم الشان قربانی کرنی پڑتی اس کے خیال سے دل لرزا جاتا ہے - آخر یہ سب کس لیے ؟ صرف اس واسطے کہ ایک غلطی کا اعتراف کرنا نہیں چاہتے تھے اور ایک ایسی مہلک پالیسی پر اڑے رہتے بجائے اس کے کہ ترکی کے ساتھ ایک سمجھوتا کرلیں - موجودہ خارجیہ پالیسی کی ہر جنبش پر بالشویزم اور اشتراکیت کے خوفناک گمات میں لگے ہوئے ہیں جو انگلستان کو دنیا میں اپنا سب سے بڑا جانی دشمن سمجھتے ہیں - کیا یہ کوئی اچھا کام ہوگا کہ ترکی کو روس اور جرمنی کے آغوش میں ڈالدیں ؟ ترکوں کو روس سے کوئی محبت نہیں بلکہ برعکس اسکے نہیں ہر وقت خوف لگا رہتا ہے - لیکن ہم نے اُنھیں متعدد بار مجبور کیا کہ وہ سوویٹ سے امداد لیں اور اتحاد قایم کریں - یہ کس کے لیے ؟ یقیناً اپنے لیے نہیں - ترک اگر یونان یا بلغانی میں سے

سلہ یردن جسے انگریزی میں جارڈن کہتے ہیں، فلسطین میں ایک دریا ہے - اسکے مشرقی ساحل کا علاقہ ٹرانسجارڈنیہ کہلاتا ہے - (مترجم)

کچھ حصہ دبالینا چاہتے ہیں تو اِن کو اس سے باز رکھنے میں انگلستان کا کیا مفاد شامل ہے جس سے وہ مفت کی جنگ اپنے سر مول لے؟ اس کی حمایت میں جو دلیل پیش کیجاتی ہے وہ یہ ہے کہ تاوقتیکہ مکمل تحفظ نہ حاصل کر لیا جائے، ممکن ہے کہ دول کو جلدی پھر دوبارہ بلقان جیسی آتش زدگی کا مقابلہ کرنا پڑے۔ فرض کر لو (حالانکہ یہ بہت دشوار ہے) کہ اس قسم کے تحفظ سے آیندہ مشرقیہ قریبہ میں کوئی جنگ نہو گی پھر بھی ہمارے دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا یہ فرض خاص انگلستان ہی کا ہے کہ وہ اس پر مصر رہے اور اس کے عوض ترکی تمام دنیای اسلام کو اپنا دشمن بنالے اور اپنے کو ہندوستان، ایشیا اور شمالی افریقیہ کے ممالک میں بالشویکی اور جرمن پروپگنڈا کے خطرہ میں ڈالے اور قسطنطنیہ سے لیکر خلیج فارس اور خرطوم تک ایک طوفان عظیم میں مبتلا رہے۔

یہ زمانہ عملی سیاسیات کا ہے اور اس عہد میں انگلستان اور فرانس جن کی زیر حکومت مسلمانوں کی کثیر تعداد بستی ہے۔ اگر کوئی بات قابل عمل ہے تو وہ یہ کہ ایشیا اور افریقیہ کے ساتھ باہمی دوستانہ تعلقات کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی اس حکومت سے بھی صلح رکھیں جو ان کا مستقر خلافت ہے۔ اس سے فوراً ابنایوں کی آزادی بھی حاصل ہو جائے گی، اور روس و جرمنی کی ان پیہم کوششوں کو بھی شکست ہو گی جو وہ غیر متفق دول مغرب کے خلاف اپنے اور ترکی سے مرکب ایک جدید رکاوٹ پیدا کر کے کرنا چاہتے ہیں۔

اگر ہم چھوٹے چھوٹے اختلافات کو مٹا دیں اور فوائد و نقاصات اور قربانی و منافع کا نسبتہً مقابلہ کر کے حالات آیندہ کا وسیع النظری کے ساتھ اندازہ کریں تو کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ انگلستان کا فرانس اور ترکی سے متفق ہونا ناممکن ہے۔

ہمارے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اپنی پالیسی کو نہایت دیانتدارانہ، پائدار اور درست رکھیں۔ ہم اصول خود اختیاری کے اسقدر حامی بنتے ہیں لیکن فلسطین میں مسلمانوں اور عیسائیوں کی کثیر تعداد آبادی پر یہودی حکومت قایم کرنا چاہتے ہیں۔ اسی طرح عراق اور ٹرانسجارڈینیہ میں ہم نے برائے نام چھوٹے چھوٹے بادشاہ منتخب کیے ہیں جن پر وہاں کے باشندے ترکوں کے قدیم

حکومت ہی کو ترجیح دیں گے یہی حال ارض پاک کا بھی ہے جہاں نئے آقا سے پرانے مالک ہی بہتر تھے۔ کوئی شخص یا کوئی قوم کسی ایسی غیر ملکی حکومت کو صبر وسکون سے نہیں برداشت کر سکتی جو انہیں ہر حیثیت سے بنظر حقارت دیکھتی ہو یہ برطانیہ عظمیٰ ہے۔ جو حکومت کثیر التعداد قوم" کی اسقدر حامی ہونیکی باوجود اس گناہ کے سب سے بڑی مرتکب ہوئی ہے۔

ہم نے فرانسیسی ہمدردی کو بھی اپنے سے علیحدہ کر دیا ہے اور علاقہ رہر میں اس کی دشواریاں زیادہ ہماری وجہ سے پیدا ہو رہی ہیں۔ بجائے اس کے کہ اسکی اخلاقی حمایت وامداد کرتے جس کی اسے توقع تھی، ہم نے پند ونصائح کے سوا اور کچھ نہیں کیا۔ یہ سب جانتے ہیں کہ ۱۹۱۴ء میں اگر انگلستان نے پہلے ہی یہ اعلان کر دیا ہوتا کہ وہ فرانس کی طرف سے لڑے گا تو یہ جنگ کبھی نہ ہوتی اسی طریقہ سے اسکا بھی قطعی یقین تھا کہ اگر ہم نے اصولاً رہر کے معاملہ میں فرانس کی حمایت کا اعلان کر دیا ہوتا تو جرمنوں کی طرف سے بہت کم مزاحمت ہوتی۔ مصر میں ہم امن وصلح قایم کرنے میں قطعاً ناکام رہے، فلسطین تقریباً بغاوت ہی کی حالت میں ہے، عراق سے بھی بعد از خرابی بسیار واپسی پر غور کیا جا رہا ہے۔ ہماری خارجیہ پالیسی چار سال تک سخت ابتلا آزمائش میں رہی اور پہلے سے کچھ زیادہ بہتر نہ رہی بلکہ تقریباً ناکام رہی۔

میں یہاں پر وہی ذکر کرتا ہوں جس کا مجھے علم ہے۔ گزشتہ صدی کے آخر میں جو جنگ ترکوں اور یونانیوں کے درمیان ہوئی تھی اس موقع پر بھی ہم نے قسطنطنیہ کے ساتھ تقریباً وہی غیر دوستانہ رویہ اختیار کیا جو آج ہمارا ہے۔

اپنے قدیم دوستانہ رویہ کے ترک کر دینے اور اسلام کو اپنا دشمن بنا دینے سے جو خطرہ ہمارے درپیش ہے، اس کا اظہار اس خط سے بخوبی ہوتا تھا جو "تماشائی" (اسپکٹیٹر) کے نام سے اسٹینڈرڈ میں شائع ہوا تھا۔ لارڈ سالسبری وزیر خارجیہ ایسے نہ تھے کہ تنبیہ پر دھیان نہ دیتے چنانچہ انھوں نے اڈیٹر کو یہ لکھا کہ اس خط سے انگلستان کی پالیسی آیندہ بدل جائیگی، یہ وہ الفاظ تھے جن کی فوراً تعمیل کی گئی اور سر پی کری کو فوراً واپس بلا لیا گیا اور باب عالی کے

ساتھ بہتر سلوک ہونے لگا۔ کیا تاریخ پھر اپنے آپ کو دہرائے گی؟ ہمارا حال یہ ہے کہ گڑ کھاتے ہیں اور گلگلے سے پرہیز۔ کیا برطانوی سپاہی، جہاز راں، اور محصول دینے والے نہیں سمجھتے کہ وہ کہاں لیجائے جا رہے ہیں؟ قبل اس کے کہ موقع ہاتھ سے نکل جائے بہتر ہے وہ خود اپنے دل سے پوچھیں۔

سعید انصاری متعلم جامعہ

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی — یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا — جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے

(اقبال)

مصر میں تعلیم

(بسلسلۂ اشاعت فروری)

اپنی نشأت جدیدہ میں حکومت اپنے مددگاروں، بہترین مشیروں اور امانت دار کام کرنے والوں سے خالی تھی۔ ساتھ ہی پیہم مخالف واقعات، متواتر شورشیں اور مسلسل لڑائیاں کرنا پڑیں ان وجوہ سے اسلوب تعلیم جس معیار پر ہونا چاہیے تھا۔ نہ ہو سکا۔ کیونکہ اس وقت صرف یہ مقصد پیش نظر تھا کہ جلد سے جلد وطن عزیز کے نونہال تعلیم و تربیت سے آراستہ ہو جائیں اور حکومت اُن سے اپنے امور میں مدد لے سکے۔ اور بڑے بڑے علوم کی تکمیل کرانے والا کوئی نہ تھا۔ غیر وطنی و اجنبی لوگوں کی اگر خدمات حاصل کی جاتی تھیں تو وہ زیادہ مفید و کار آمد نہ ثابت ہوتے تھے۔ لہٰذا اُنھیں اہل وطن ہی میں سے جو جب مل جاتا تھا اُسے لینا پڑتا تھا۔ مگر جب حکومت مصر نے محسوس کیا کہ اُس کو ایسے اُستاد درکار ہیں جو ریاضیات، معقولات، اصول تربیت و ترتیب مدارس، طریقۂ تعلیم دقت علمی میں کامل و ماہر ہوں تو اس نے طلبہ کی جماعت یورپ بھیجنے کا تہیہ کیا۔ اس وجہ سے کہ آج یورپ ہی اِن علوم کا مرکز بنا ہوا ہے اور تمام قدیم و نایاب علمی کتابیں اس کی مروجہ زبانوں میں منتقل ہو گئی ہیں۔ اس کے علاوہ خود مشاہیر یورپ کی تصانیف بھی ان میں شامل کر لی گئی ہیں۔ اس طرح تعلیم کو یورپ نے بالکل اپنے ہاتھوں میں محصور کر لیا ہے۔ غرض سب سے پہلی کیپ ماہ شعبان ۱۲۴۱ھ میں یورپ بھیجی گئی۔ اس نے آٹھ سال نو ماہ یورپ میں قیام کیا یہ طلبہ مختلف ممالک میں تقسیم اور ہر فن کے لیے چند مخصوص ہو گئے۔ گوہر مقصود حاصل کر کے وطن کے مایۂ ناز فرزندوں کی یہ جماعت جمادی الاول ۱۲۵۰ھ میں اپنے مقدس ملک میں واپس آ گئی۔ انھیں میں علامۂ فاضل مرحوم رفاعہ بک، مظہر پاشا، پاشا بھی تھے اس جماعت کی تعداد طلبہ (۱۳۷) تھی۔ ان میں مشائخ امرا، عام رعایا اور معززین کے بچے تھے، ترک، عرب، اور

کچھ رومی وارمنی بچے بھی تھے - جو ملازمین حکومت کی اولاد تھی ۱۲۵۳ھ میں پھر تیرہ (۱۳) طالب علم
یورپ گئے۔ ان میں سے بعض آٹھ سال کچھ گیارہ سال وہاں مقیم رہے - اس کے بعد ۱۲۵۵ھ-۵۶
۵۷-۵۸-۵۹ میں اور چند لائق طلبہ گئے جن کی تعداد (۳۷) نفر تھی - یہ سب (۱۷۷) طلبا، یورپ سے
فارغ التحصیل ہو کر آئے - جن کی تعلیم پر محمد علی پاشا نے (۱۲۳۱۷۴) پونڈ مصری صرف کیے ان طلبہ نے
مختلف مدتوں تک یورپ میں قیام کیا - ان کی مدتِ قیام ہی کے لحاظ سے مصارف و وظائف
بھی مختلف ہوئے - چنانچہ پہلی کیمپ میں ۵۱۰ پونڈ فی طالب علم صرف ہوا - اور حکومت کے خزانہ
سے ادا کیا گیا - دوسری کیمپوں میں بھی مختلف تعداد تھی - اور وظائف و مصارف بھی مختلف ہوئے -
مثلاً جو لوگ گیارہ سال یورپ رہے - اُن پر حکومت مصر نے (۹۷۹) پونڈ صرف کیے - محمد افندی
اسمٰعیل اکتیس ۳۱ سال یورپ میں رہے - اون کی تعلیم پر (۶۴۳۵) پونڈ صرف ہوا - حسن افندی دمیاطی
۱۹ سال رہے - اُنھوں نے ۲۱۰۷ پونڈ وظیفہ پایا - محمد افندی شباسی تیرہ سال رہے - ان کو ۱۲۳۲
پونڈ ملا - مصطفیٰ افندی سیکی نے ۱۹ سال قیام کیا - اُنھوں نے ۲۱۰۷ وظیفہ لیا - ابراہیم افندی نبراوی
۱۳ سال رہے - ان کو ۹۴۹ پونڈ دیا گیا - محمد افندی علی البقلی اور حسین افندی رشیدی نے تیرہ سال
قیام کیا اُن میں سے ہر ایک کو ۳۶۱ پونڈ - غرض اس طرح سے مدت قیام یورپ کے اختلاف کے
لحاظ سے طلبہ پر مصارف بھی ہر ایک کے مختلف ہوئے - اور ۱۲۶۰ھ میں ایک خاص منتخب جماعت
یورپ کو بھیجی گئی - جن میں حسین بک اور عبدالحلیم پاشا، پاشائے مرحوم کے صاحبزادے قابل ذکر
ہیں یہ بیشتر طلبا، تھے جن میں علامہ علی پاشا مبارک بھی ہیں جو مصر کے مشہور و نامور وزیر ہوئے -
اور جن کا علم و فضل محتاج بیان نہیں اس جماعت کے سرگروہ ا ن بک تھے - اس گروہ نے
پیرس کو اپنا تعلیمی مرکز بنایا - اور اسپر (۹۴۱۱۵) پونڈ مصری صرف ہوئے - پھر اور ملک کے
نوجوان بھیجے گئے جنکی تعداد (۲۹۰) ہوتی ہے - ان میں بڑے بڑے ترک و عرب سردارزادے
تھے - اور ان سب کی تعلیم پر کل (۲۷۳۳۶۰) پونڈ مصارف آئے - مرحوم عباس پاشا اُن کے
عہد حکومت میں ۴۸ طلبہ یورپ گئے - جن پر ۸۲۹۶۳ پونڈ صرف ہوئے پھر خدیو معظم اسمٰعیل پاشا

کے زمانہ میں ۵۰ طلبہ روانہ ہوئے جن پر ۱۳۷۸۶۶ مصری پونڈ خرچ ہوئے۔ مرحوم توفیق پاشا کے دور میں موجیل بک کی سرگردی میں ایک جماعت بھیجی گئی مگر افسوس یہ نہ معلوم ہو سکا کہ اس پر کیا صرف ہوا۔

تکمیل فوائد و اتمام مضمون کے خیال سے اس موقعہ پر مکاتب کی تاریخ افتتاح بھی لکھ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

۱ مدرسۃ البیادہ (پیادہ فوج) ماہ ذالحجہ سنہ ۱۲۴۰ھ میں بمقام قصر عینی۔ (مگر یہ مدرسہ پھر سنہ ۱۲۵۲ھ میں کسی خاص وجہ سے بند کر دیا گیا۔

۲ مدرسہ حربیہ بمقام قلعہ سنہ ۱۲۱۴ھ میں

۳ مدرسہ شوال سنہ ۱۲۴۴ھ میں

۴ مدرسہ الاجزائیہ (دواسازی کا مدرسہ) بمقام قلعہ جمادی الثانیہ سنہ ۱۲۴۵ھ میں

۵ مدرسہ السواری (فوجی رسالہ کا مدرسہ) حافظ افندی اسمٰعیل کی نگرانی ماہ ذیقعدہ سنہ ۱۲۴۶ میں بمقام جیزہ۔

۶ مدرسۃ الطب بیطاری (ویٹرینری علاج مواشی) بمقام ا سنہ ۱۲۴۷ھ میں

۷ مدرسۃ التوبحہ (توپ خانۂ فوجی) بمقام بطرہ زیر نگرانی خورشید افندی سنہ ۱۲۴۷ھ میں جو سنہ ۱۲۵۶ھ میں موسیو بورلڈکن نگرانی میں دیدیا گیا،

۸ مدرسۃ البحریہ (جہاز راں) ماہ ربیع الآخر سنہ ۱۲۴۷ھ

۹ مکتب پیادہ (پیادہ فوج) بمقام خانکہ۔ جمادی الاول سنہ ۱۲۴۸ھ میں

۱۰ مکتب شریف (ملک مصر کا حصۂ زیریں) سنہ ۱۲۴۹ھ میں

۱۱ مکتب مہمات الحربیہ (سامان جنگ کا مدرسہ سنہ ۱۲۴۹ھ میں۔ پھر یہ سنہ ۱۲۵۱ھ میں بند ہوگیا،

۱۲ مکتب پیادہ مقام ابی زعبل میں سنہ ۱۲۵۰ھ

۱۳ مکتب پیادہ بمقام دمیاط صفر سنہ ۱۲۵۰ھ میں

۱۴ - مدرستہ فن تعمیر (انجینیرنگ) بمقام بولانہ ۱۲۵۰ھ میں زیر نگرانی موسیو حالیکان (سلیکن؟)
یہ مدرسہ ماہ رجب ۱۲۵۴ھ میں امیر بیک کے سپرد کیا گیا پھر ۱۲۶۶ھ میں علامہ علی پاشا مبارک
کھولا ہوا جبکہ وہ یورپ سے فارغ التحصیل ہوکر اپنے وطن واپس آئے ہیں -
۱۵ - مدرستہ تجہیزیہ (ہائی اسکول) یہ ماہ رجب ۱۲۵۲ھ میں مدرستہ البیادہ سے الگ کیا گیا
پہلے دونوں ایک تھے -
۱۶ - مدرسہ طب و دایہ گری (ماہ ذیقعدہ ۱۲۵۲ھ میں
۱۷ - مدرسہ الئی سبہ (حساب دفاتر) بمقام سیدہ زینب ماہ ذیقعدہ ۱۲۵۲ھ میں
۱۸ - مدرستہ الالسن (زبانیں سکھانے کا) بمقام ازبلیہ - ماہ ربیع الاول ۱۲۵۲ھ میں
۱۹ - مدرستہ علاج مویشی بمقام مصر ماہ ذیقعدہ ۱۲۵۲ھ میں
۲۰ - مدرستہ العملیات (تشریح زخم وغیرہ) ماہ محرم ۱۲۵۵ھ میں
۲۱ - مدرستہ المفروزہ (فوجی دستہ کا) ذیقعدہ ۱۲۶۵ھ میں بمقام مصر
۲۲ - مدرستہ " " ماہ صفر ۱۲۶۷ھ " بمقام اسکندریہ
۲۳ - مدرستہ زراعت و محاسبۂ قبطیہ مقام عباسیہ ان دونوں کی تاریخ افتتاح افسوس کہ معلوم ہو سکی
یہاں تک پہنچکر نگاہ بصیرت و غور ٹھہر جاتی ہے - اور ان مساعی جمیلہ کو حیرت انگیزی کے ساتھ
دیکھتی ہے - اُس دور میں جو معارف ضروریہ سے بالکل خالی اور حوادث و صعوبات میں گھرا ہوا تھا - روپیہ
کی قلت اور کارآمد آدمیوں کے قحط میں مبتلا تھا، ایک مرد دانا سمجھ سکتا ہے کہ محمد علی پاشا کا یہ اہم
ترین کارنامہ ایک عالی ہمت، دورا ندیش نتیجہ شناس ہی کا کارنامہ ہوسکتا ہے - مرحوم ہی نے
مصریوں کو تعلیم یافتہ و مہذب آدمی بنایا - اور کاروبار حکومت میں درک حاصل کرنیکے مواقع دیئے
ایسی استعداد و قوت پیدا کی کہ اپنی قابلیت و حقوق دونوں کے لحاظ سے وہ اس قابل
ہوسکے کہ حکومت کے انتظامی اور ذمہ دار عہدوں کو سنبھال لیا - اور غیر متمدن ملک میں جب
تمدن و شائستگی کی بنیاد پڑتی ہے اور ملک جہالت و وحشت میں مبتلا ہوتا ہے اس وقت اس کو

سنبھال لینا آسان کام نہیں ہے۔ اور محمد علی پاشا ہی کا کام تھا اُن کی وفات کے بعد اُن کے فرزند رشید بطل نامور مرحوم ابراہیم پاشا کے ہاتھ میں حکومت مصر کی عناں آئی۔ اُن کا عہد دولت اگر جلد ختم نہ ہو جاتا تو یقیناً اُن کے کمال علم دوستی و معارف پروری کی بدولت ملک اُس دولتِ لازوال سے مالا مال ہو جاتا۔ لیکن افسوس تمناؤں اور آرزوؤں کے خلاف موت نے بہت عجلت کی۔ مرحوم ابراہیم پاشا کے بعد اُن کے جانشین عباس پاشا الاول ۲۷ صفر سنہ ۱۲۶۴ھ کو سریر آرائے مصر ہوئے۔ آپ نے بعض مدارس میں کمی کی بعض میں اضافہ چنانچہ آپ کے عہد میں مدارس کی تعداد اور اُن کے مصارف کا اندازہ حسب ذیل نقشے سے ہوگا یہ سنہ ۱۲۶۵ھ کا ماہانہ نقشہ ہے۔

	ماہانہ	تعداد	معلم	ملازم
مدرسہ المبتدیات	۷۰۷۰	۲۰۹	.	.
مدرسہ طب و دایہ گری	۳۱۷۵۰	۵۴ ۲ جنین ۳ لڑکیاں تھیں	.	.
مدرسۂ اسواری بمقام جیزہ	۲۵۰۲۳	۲۴۵	.	.
طلبہ پیرس روانہ کئے گئے	۲۳۱۳۵	۷۲	.	.
مدرسۂ توپچیہ بمقام طبرہ	۱۳۰۹۷	۸۸۶	.	.
مدرسۂ اللسن و محاسبہ	۴۷۵۴۹	۳۲۰	.	.
مدرسۂ فن تعمیر (انجینئرنگ)	۲۵۷۱۳	۱۳۲	.	.
مدرسۂ المفروزہ فوجی ستو کا	۱۹۸۵۹	۱۶۹۶		
ملازمین و مشاہرات	۱۴۹۴۹۷	۳۲۲	.	.
میزان مصارف	۴۳۰۱۹۳	۳۳۰۸		

یہ تعداد پاشائے موصوف کے آغاز دورِ حکومت کی ہے۔ میر مدارس کی تعداد میں مزید اضافہ ہوا اور طلبہ کی تعداد میں بھی۔ پھر ۶ شوال ۱۲۷۰ھ کو مرحوم عباس پاشا اول کے بعد مرحوم سعید پاشا والی مصر ہوئے۔ اُنہوں نے سررشتہ تعلیم کی جانب مطلق توجہ نہ کی اور طلبہ کا یورپ بھیجا جانا بھی بالکل بند کر دیا۔ تمام مدارس بند کر دیئے۔ مگر کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ اُنہوں نے ایسا کیوں کیا۔ حالانکہ خود سعید پاشا نے علوم و معارف کی آغوش میں پرورش پائی تھی۔ اُس فضا میں پھولے پھلے تھے اور بجائے خود ذوق آشنائے علوم تھے۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ تعلیم یافتہ گروہ کی کثرت سے اُن کو کوئی خطرہ تھا۔ کیونکہ وہ خود نہایت بہادر و جری تھے۔ اور سب سے پہلے فرمانروا ہیں جنھوں نے حریت شخصی کی طرح ڈالی لیکن تعلیم عام کی بجائے فوجی تعلیمات کی طرف زیادہ صرف ہمت فرمایا اور بحید التفات سے کام لیا خود بنفسِ نفیس اس کی سرپرستی کی۔ اور قوانین یورپ کو پیش نظر رکھ کر بہت سے طریقوں کا اضافہ فرمایا۔ اس سے فوجی صیغہ حسن انتظام کی حیثیت سے بہت ترقی کر گیا معلوم ہوتا ہے کہ ان کو سلطان عبد المجید کی جانب سے خطرہ تھا۔ لہذا صیغہ فوج، آلات و اسلحہ جنگ کی بہم رسانی و تیاری پر زیادہ توجہ مبذول رکھی جسقدر شغف و انہماک فوجی صیغہ سے تھا۔

اسی قدر اگر سررشتہ تعلیم کی جانب ہوجاتا تو ایک متنفس کو بھی وہ جاہل نہ رہنے دے۔ تاہم اُنکے عہد میں کسی مقرب خاص کی تحریک و سفارش پر مدرسہ طب دوبارہ قائم کیا گیا۔ اور علامہ رفاعہ بک کی سوڈان سے واپسی پر قلعہ میں اُن کے لیے ایک مدرسہ کھول دیا۔ جس میں ۶۵ طلبہ داخل ہوئے۔ جس کا ماہانہ صرف ۲۳۸ پونڈ ۳ قرش تھا۔ مگر کوئی خاص مقصد پیش نظر نہ تھا۔ مدرسہ رفاعہ بک میں فوجی تعلیم کے لیے بھی چند معلمین رکھے گئے۔ باقی مدارس کے مکانات کارخانوں وغیرہ کے کام میں لائے گئے اور تمام آلات و سامان تعلیم فروخت کر دیے گئے۔ مصر میں اس حد پر پہنچ کر تعلیم رُکی ہوئی تھی کہ حضرت خدیو اسمٰعیل پاشا کا دور مبارک آیا وہ ۲۷ رجب ۱۲۷۹ھ میں والی مصر ہوئے۔ اُنہوں نے تمام مدارس اور تعلیمات کے شعبے کھول دیئے۔ اور ایک خاص محکمہ اس کا الگ جاری کیا۔ اپنی پوری توجہ تعلیمات پر صرف فرمائی۔ بہت سے طلبہ کو

ب ریب بھیجنے پر تیار کیا۔ فوجی تعلیم کا شعبہ ملکی (سول) تعلیم سے جدا کر دیا۔ اور اس کے تمام شعبوں کا ایک خاص جدید محکمہ سے الحاق فرمایا۔ پھر مکاتب اہلیہ (پبلک اسکول) کی طرف توجہ فرمائی۔ تمام ملک کے مدارس و مکاتب کے لیے ایک قانون بنایا۔ شہروں اور گاؤں میں تعلیم کی نشر و اشاعت کے لیے پوری کوشش سے کام لیا۔ اور تعلیم کی تین قسمیں قرار دیں۔

۱۔ اول ابتدائی تعلیم۔ شہروں اور دیہات کے مدارس میں، جو صرف معمولی نوشت و خواند اور حفظ قرآن شریف، علم توحید کا ایک رسالہ اور حساب کے چاروں ابتدائی قواعد تک محدود تھی۔

۲۔ قسم دوم مدارس عامہ، مرکزی شہروں میں، ان طلبہ کو نحو عربی، حساب، ہندسہ، جغرافیہ تاریخ اور کچھ علم الطبیعات، پڑھنا ہوتے تھے۔ مثلاً حوادث قضائیہ اور کچھ فوائد کیمیاویہ، نباتات اور بدن کی درستی و اصلاح سے متعلق۔ تاکہ طلبہ میں، مدارس عالیہ میں داخل ہونے کی استعداد پیدا ہو جائے۔

۳۔ قسم سوم۔ مدارس امیریہ تھے۔ ان میں اُن تمام علوم اولیہ کی تعلیم دی جاتی تھی جس سے طلبہ میں مدارس خصوصیہ میں داخلہ کی صلاحیت پیدا ہو جاتی تھی۔ اور ان مدارس خصوصیہ کے مصارف خود بارگاہ خدیویہ سے ہوئے تھے۔ اب سب ابتدائی اور تجہیزی (پرائمری اور ہائی) مدارس ان کا تمام بار مصارف حکومت کے ذمہ اور اس فیس کی آمدنی پر تھا جو طلب کے متولیوں سے وصول ہوتی تھیں۔ اس کی مقدار بیس سے سو قرش تک اُن کی حیثیت و مقدرت کے لحاظ سے ہوا کرتی تھی۔ اور دوسری مکاتب پر اقطاع جنلک کی آمدنی صرف کی جاتی تھی۔ یہ ملک مصر کا وہ شیبین حصہ تھا جسے خدیو معظم نے مکاتب اہلیہ کو عطا فرمایا تھا۔ اور اُن اوقاف خیریہ کی آمدنی، جو دیوان اوقاف سے متعلق تھے۔

یا بعض اہالی ملک کے نگرانی میں تھے۔ اس کے علاوہ تلامذہ کے ماں باپ سے کچھ رقم فیس وصول ہوتی رہتی تھی جسکی مقدار پانچ (۵) قرش سے پندرہ قرش تک تھی۔ اور ان کی حیثیت کے لحاظ سے لی جاتی تھی۔ یتیم بچے بھی بلا استثنا حکومت کے ہر ایک مدرسہ اور مکتب میں تعلیم حاصل کرتے تھے۔ آلات و سامانِ تعلیم عام طور پر یتیم طالب علم کو مدرسے سے مفت دیئے جاتے تھے۔ اس طریقے سے تعلیم تمام شہروں اور گاؤں میں عام ہو گئی۔ مدارس و مکاتب بھی اس تعلیم سے ہزاروں کی تعداد میں

ابنائے ملک نے فائدہ حاصل کیا۔ خدیو معظم اسمٰعیل پاشا کو اس تعمیم معارف پر آمادہ کرنے کا سہرا علامۂ فاضل، وزیر خلیل علی پاشا مبارک کے سر ہے۔ جو ابو المعارف کہے جا سکتے ہیں۔ وہی مدارس کی ترتیب و نظام میں لانے اور صحیح اصول پر فن تعلیم کو وضع کرنے والے ہیں اس سے قبل محض قیاسی اجتہادی اصول پر تھے، یہ نیک دل، علم پرور وزیر جب روز یورپ سے واپس آئے اُن کا ایک دن بھی ایسا نہیں گزرا جو ترقی و تعلیم کے مسئلہ سے خالی گزرا ہو۔ اور اُنھوں نے بہت سے مدارس و مکاتب بلا اجازت حکومت بھی کھول دیئے تھے۔ پھر جب موقع مل جاتا تھا منظوری لیکر مستقل کر دیتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ علی مبارک پاشا کی مساعی جمیلہ اور ان کی شاندار تعلیمی کارناموں کو گننے کے لیے ایک مستقل تصنیف درکار ہے۔

نجوی صدیقی

قتل جہاں کے واسطے تازہ پھر اک بہانہ کر

ازافاضات مولانا شاد عظیم آبادی

چشم سیہ میں سرمہ دے زلفِ رسا میں شانہ کر / قتل جہاں کے واسطے تازہ پھر اک بہانہ کر

نالہ ہوا ہے منفعل شہرتِ عام سے عبث / کس نے کہا کہ یوں بلند شورشِ عامیانہ کر

اہل ہوس بھی ہو گئے آ کے حریفِ میکشاں / پیرِ مغاں الٹ دے خُم، بند شرابخانہ کر

جس پہ ہو آپ محو تو نقش وہ کھینچ ہر طرف / ہاتھ میں کلکِ فکر لے، گھر کو نگار خانہ کر

ششتگیٔ زباں عبث دل میں بھرے ہیں خار وخس / چھوڑ ابھی پر دنِ در، فکرِ درونِ خانہ کر

باغ جہاں ہے پر خطر، بلبلِ زار سے کہو / شاخ بلند و استوار دیکھ کے آشیانہ کر

دیکھ کلام شاد کا، شعر کا ماحصل سمجھ / جاگ کے کر شبیں بسر، فکر کو عارفانہ کر

مسئلہ اشتراکیت

تنقیدی نقطۂ نظر سے

اشتراکیت کی تحریک موجودہ سوسائٹی کے نظام سرمایہ داری کے خلاف دراصل صدائے احتجاج کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس تحریک کی بنیاد ہی انفرادیت کے خلاف ہے جیسا کہ اس کے لغوی معنی سے عیاں ہے۔ اس کا تمامتر مقصد سرمایہ اور محنت (جو پیدائش دولت کے دو اہم اجزاء لاینفک ہیں) کی باہمی کشاکش کو رفع کرنا اور ان کے باہمی تعلقات کو (جن کا اثر صرف انھیں تک محدود نہیں رہتا بلکہ بحیثیت مجموعی سوسائٹی پر پڑتا ہے) خوشگوار بنانا ہے۔ اس تحریک کے حامیوں کے نزدیک پیدائش اور تقسیم دولت کا ایسا انتظام ہونا چاہیے کہ سوسائٹی کے سب ممبر اس کے ذریعہ سے بہرہ اندوز ہوسکیں۔ اس تحریک کا یورپ کی سرزمین میں اُس وقت آغاز ہوا جب وہاں کی فضا ہر قسم کی برائیوں اور آلودگیوں سے مکدر ہورہی تھی چنانچہ اشتراکیین نے اقتصادی ناانصافیوں کے ہی خلاف اپنی آواز نہیں بلند کی بلکہ اخلاقی و سیاسی اصلاح کے بھی وہی لوگ علمبردار ہوئے۔

علم طبعیات کے اس کلیہ میں مطلقاً شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ عمل و ردِعمل میں ایک خاص مناسبت ہوتی ہے جس طرح ساری دنیا میں کلیہ عمل پیرا نظر آئے گا اسی طرح انسان کی تمدنی و عمرانی حیثیت میں بھی اس کی کارفرمائی سے انکار نہیں۔ انقلاب فرانس دراصل تمام یورپ کا انقلاب تھا لیکن فرانس کی سرزمین اپنی خصوصیتوں کے لحاظ سے اس کے لیے نہایت موزوں ثابت ہوئی یہاں مطلق العنان بادشاہ صرف ملکی و قومی معاملات تک اپنی دخل اندازی کو محدود نہیں کرتے تھے بلکہ خانگی معاملات تک میں شاہی قوانین اپنی تمام دہشت و جبروت کے ساتھ عمل پیرا نظر آتے تھے اسی کا نتیجہ تھا کہ انقلاب کے بعد جب جمہوریا سوسائٹی کا "درمیانی طبقہ" برسر اقتدار ہوا تو ان قوانین کو سب سے پیشتر مٹایا گیا جو شخصی آزادی میں ہارج یا مانع تھے۔ درمیانی طبقے سے وہ لوگ مراد ہیں جو اکثر اپنے کاروبار میں مصروف تھے رؤسا اور نوابوں کے زمانہ میں ان پر طرح

طرح کے قیود عائد تھے انقلاب نے گویا ان نوابوں کے طریق حکومت کو ہمیشہ کے لیے دنیا سے معدوم کر دیا۔ اس کی جانشینی موجودہ آزاد خیال، حریت پسند طبقہ نے نہایت بے باکانہ طریقہ سے اپنے سر لی ان کے خیالات آزادی نہ صرف میدان سیاست تک پہنچ گئے بلکہ مذہب بھی انکی دستبرد سے نہ بچ سکا۔ چنانچہ انھیں لوگوں نے رومن کیتھلک کے رسوم و توہمات کے خلاف سخت جہاد شروع کیا غرضکہ جب تقریباً تمام یورپ نے لبرل طبقہ کی سرکردگی قبول کر لی تو زیادہ سے زیادہ مفاد کے حصول میں موانع باقی نہ رہے۔ نظام سوسائٹی کے ذمہ دار یہی تھے۔ کسی مطلق العنان کی دراز دستیوں کا خوف باقی نہ رہا کیونکہ اب تو دستوریت کی ابتدا ہو چکی تھی، مذہب کے احکام کی ان مادیت پرستوں کے دماغوں میں کچھ وقعت باقی نہ رہی چنانچہ اس زمانہ میں جتنے بڑے بڑے فلسفی اور علم اقتصادیات کے ماہرین پیدا ہوئے وہ بھی ماحول کے واقعات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے ہر طرف لیسز فیئر (یعنی ہر قسم کی اقتصادی آزادی) کے نظریہ کا غلغلہ بلند تھا، گورنمنٹ تو اپنی تھی ہی شخصی آزادی کا بُری طرح استعمال کیا گیا۔ بادی النظر میں یہ آزادی جمہوریت کا سنگ بنیاد معلوم ہوتی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ یورپ کی موجودہ سقیم حالت اسی اصول کی عدم توجہی کی رہین منت ہے۔

جب یہ "طبقہ درمیانی" اپنے تفویض کردہ فرائض سے متجاوز ہونے لگا تو فطرت کے قانون نے اپنی دائمی سنجیدگی اور استغنا کے ساتھ اسکو بھی سزا دینی چاہی چنانچہ تحریک اشتراکیت کے معرض وجود میں آنے کی علت العلل یہی ہے۔ جیسا ہر تحریک کا خاصہ ہے اس میں بھی پہلے ارباب تخئیل پیدا ہوئے جن پر مذہبی و اخلاقی رنگ غالب تھا اس کے بعد وہ جماعت آئی جو فلسفہ اور مادیت میں ڈوبی ہوئی تھی ان لوگوں نے ہیئت اجتماعیہ کو بھی علم الحیات پر خیال کیا کہ جس طرح جسم انسانی مختلف مدارج ارتقا طے کرتا ہے بعینہ ہیئت اجتماعیہ ان قوانین سے اثر پذیر ہوتی ہے۔ انھوں نے یہ نظریہ قائم کیا کہ جس طرح موجودہ سوسائٹی کے "طبقہ وسطی" نے "طبقہ اعلیٰ" پر غلبہ حاصل کیا ہے اسی طرح "طبقہ ادنیٰ" مستقبل قریب میں تمام دنیا میں برسر اقتدار ہو جائیگا۔ یہ جماعت بھی اپنے

دعووں میں حدسے متجاوز ہو گئی۔ ہم اپنے مضمون میں بھی بتلانا چاہتے ہیں کہ اکثر اشتراکیین بھی درمیانی راستہ کی طرف مائل نظر آتے ہیں جو یقیناً اسلام کا مسلک ہے۔ چونکہ اس تحریک کو یورپ کی متحدہ طاقتوں سے مقابلہ کرنا پڑا اس لیے ان اصولوں کو بھی جو فی نفسہ اچھے اور پسندیدہ ہیں نہایت بُری شکل میں پیش کیا گیا ہے۔

سب سے پہلا الزام اشتراکیت کے خلاف یہ ہے کہ "ملکیت ذاتی" کے حقوق یہ نظام تسلیم نہیں کرتا۔ یہ خیال غلط فہمی یا (تجاہل عارفانہ) پر مبنی ہے۔ اشتراکیین کا تو یہ دعویٰ ہے کہ موجودہ نظام سوسائٹی میں "ملکیت ذاتی" تو خال خال ہی نظر آتی ہے۔ اس زمانہ میں محنت اور اس کے ثمرہ میں کوئی مناسبت ہی نہیں۔ جو لوگ زیادہ محنت کرتے ہیں وہی محروم محض ہیں۔ اگر دنیا کے کسی ملک کے اعداد و شمار کا مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت اچھی طرح ظاہر ہو جائے کہ دنیا میں زیادہ تعداد انھیں فاقہ مستوں کی ہے جو "ملکیت ذاتی" سے بالکل عاری ہیں۔ نہ دنیا کے ممالک میں سے کہیں کے مزدوروں کا منتہائے نظر "ملکیت ذاتی" ہوتا ہے۔ مزدوری سے صرف پیٹ بھرنا مقصد ہوتا ہے اور جو بچ رہا تو وہ اس منحوس ساعت کے لیے پس انداز کر لیا جاتا ہے جب بیماری یا بیکاری سے دوچار ہونا پڑے۔ اس پس انداز سے سطح زندگی کو بلند کرنا - یا مزید آسائش بہم پہنچانا مقصود نہیں ہوتا ملکیت ذاتی سے ایک خاص جماعت بہرہ اندوز ہوتی ہے اور سوسائٹی کے عامۃ الناس کو اس سے زیادہ فائدہ نہیں حاصل ہوتا۔ اب وہ زمانہ بھی نہیں جب ایک معمولی مزدور بھی یہ امید کر سکتا کہ ایک روز وہ بڑا سرمایہ دار ہو جائیگا۔ اب تو زمانہ کا رجحان یہ ہے کہ ایک سرمایہ دار کے لیے تو اپنی مرفہ الحالی میں اضافہ کرنے کا موقع حاصل ہے لیکن وہ شخص جس کی حالت خراب ہے اس خستگی و خواری کو دور کرنے کے لیے مواقع موجودہ طریق تمدن نہیں بہم پہنچا سکتا۔ نظام اشتراکی ملکیت ذاتی کے اصول کے خلاف ہے بلکہ موجودہ طریق تمدن کے خلاف ہے جس کی بدولت عوام غربت و افلاس میں مبتلا رہتے ہیں۔ چنانچہ انھیں اسباب کی بنا پر اشتراکیین نے "مساوات مواقع" کا اصول قایم کیا ہے۔ ایک بچہ جو معمولی گھرانے میں پیدا ہوتا ہے اعلیٰ تعلیم اور عمدہ ترتیب

حاصل کر لیتا ہے اور اس کے غریب پڑوسی کا فرزند باوجود زیادہ ذکی اور ذہین ہونے کے ان مواقع سے محروم رہتا ہے یقیناً یہ بالکل درست ہے کہ خود کائنات فطرت میں کسی چیز کو مساوات حاصل نہیں۔ انگریزی کی ایک مثل ہے کہ "فطرت اعادہ کو ناپسند کرتی ہے"۔ دو درخت جنکو نشو ونما کے تقریباً مساوی مواقع حاصل ہو جاتے ہیں جب بھی بالکل ایک سے نہیں ہوتے۔ ممکن ہے کہ جب ایک درخت میں کونپل نکلنا شروع ہوئی ہو تو اس نے مشرقی ہوا کے جھونکے کا اتنا اثر قبول کیا ہو کہ اس کی تمام آیندہ شاخوں کے نکلنے کا رجحان مغرب کی طرف ہو گیا کیا یہ فطرت کی عدم مساوات نہیں؟ خیر ہم اس مافوق الطبعی بحث کو چھوڑتے ہیں۔ سوسائٹی میں مساوات مواقع سے مشابہت کلی مراد نہیں بلکہ ملک کی ذمہ دار جماعت یعنی گورنمنٹ کی طرف سے اس کا اہتمام ہونا چاہیے کہ ایک دہقان کے فرزند کو بھی ایسے حالات بہم پہنچائے کہ وہ بھی اپنے ہر قسم کے پوشیدہ جوہر دکھلا سکے کیا یہ ممکن نہیں کہ وہ دہقان زادہ جو اپنی تمام عمر ہل بیل کے اہتمام میں گذار دیتا ہے اور جس کی سیاست کا دائرہ اپنے گھر کی چار دیواری یا اپنے گاؤں تک محدود رہتا ہے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے مواقع اس کو بہم پہنچ جانے پر نیوٹن یا بو علی سینا کی طرح سائنس کے کلیات ونظریات قائم کرتا؟

چنانچہ تفریق مراتب تو بیشک معدوم نہیں ہو سکتی اور نہ اشتراکیین یہ چاہتے ہیں۔ ان کا مقصد صرف یہ ہے کہ حکومت بحیثیت نمایندہ عوام ہونے کے اس کی ذمہ دار ہے کہ ہر متنفس کو اعلیٰ سے اعلیٰ قابلیت حاصل کرنیکا پورا پورا موقعہ دیا جائے۔

یہ کہنا کہ جب اشتراکیین ملکیت ذاتی کو یکقلم مٹا دینگے تو تجارت اور عام صنعت وحرفت کا بازار بالکل سرد پڑ جائیگا حقیقت سے اسی قدر دور ہے جیسا کہ پہلا خیال۔ اس قسم کی افواہ کی ترویج صرف مخالفین اپنے پروپگنڈے کی غرض سے کرتے ہیں۔ ایچ۔ جی۔ ویلس صاحب مشہور مورخ انگلستان جو ۱۹۲۰ء میں روس صرف اس لیے تشریف لے گئے تھے کہ وہاں کی سیاسی ومعاشی حالت کا مطالعہ کریں اپنی کتاب میں اس مکالمہ کو لکھتے ہیں جو ان کے اور لینین صدر

جمہوریہ اشتراکی کے درمیان اسی اثنا میں ہوا تھا۔ ویلس صاحب لکھتے ہیں کہ میرا خیال تھا کہ میں لینن میں وہ باتیں پاؤنگا جو کڑ قسم کے مارکس کے متبع میں ہونی چاہئیں۔ لیکن ملاقات کے بعد میرا یہ خیال محض غلط ثابت ہوا۔ ایک امریکن سفیر بھی میرے ساتھ ملاقات کے لئے گیا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ لینن سے کچھ خاص باتیں کرنا چاہتا ہے چنانچہ وہ وہاں سے میری واپسی کا منتظر تھا لیکن اثنائے گفتگو میں لینن نے امریکن کی طرف دیکھ کر مجکو مخاطب کیا کہ ہم امریکہ سے خلیہ تجارتی معاہدہ کر رہے ہیں اور ہم لوگ اہل امریکہ کو سائبیریا میں ۵ سال کے لیئے ٹھیکہ دینے کو تیار ہیں تاکہ یہ لوگ وہاں کاشت عمیق کریں اور ساتھ ہی کارخانے قائم کریں۔ اس معاہدہ میں ہم یہ شرط بھی رکھیں گے کہ امریکہ برطانیہ عظمیٰ اور جاپان کی غاصبانہ پالیسی کی مدافعت میں ہماری مدد و معاون ہو"۔ یہ روس کی جمہوریت اشتراکی کے صدر کے الفاظ ہیں ان سے ان تمام بیانات کی یکسر تردید ہو جاتی ہے جو اشتراکیین کے خلاف پیش کیے جاتے ہیں کہ اشتراکی ترقی کے معنی یہ ہیں کہ تجارتی و صنعتی ترقی بالکل مسدود ہو جائے۔

سرمایہ داری اشتراکیین کے نزدیک

اشتراکیین کا موجودہ نظام تمدن پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ انسانی توہین جیسی اس زمانہ میں ہوئی ہے ویسی کبھی نہیں ہوئی۔ سرمایہ داروں کے نزدیک "محنت" بھی تجارتی بیع و شری کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کے نزدیک وہ بھی دیگر اشیا بازاری کی طرح بے روح و بلا ارادہ چیز ہے۔ ایام سابقہ کی رسم بردہ فروشی کے ذکر سے یورپ کے تہذیب و تمدن پر رعشہ طاری ہو جاتا ہے لیکن فی الواقع آجکل کی نام نہاد آزادی سے اس زمانہ کی غلامی بہتر تھی۔ اس زمانہ میں "محنت" (یعنی پیدائش دولت کا ایک اہم عنصر) ایک غیر جاندار چیز سے تعبیر کی جاتی ہے۔ ایک سرمایہ اصل و اپنی مشین کی مرمت کرانا اور اپنی آمدنی سے مطالبات فرسودگی کو علحدہ کرنا ضروری خیال کرتا ہے لیکن اس کو اس بدنصیب انسان کے پس ماندگان کا مطلقاً خیال نہیں ہوتا جو اس کے کارخانے میں کسی مشین کے غیر معمولی صدمہ سے جانبر نہ ہو سکا۔ اگرچہ آجکل

تعلیم اشتراکیت کی نشر و اشاعت کی وجہ سے یورپ کے تمام ممالک کے مزدوروں میں اپنے حقوق کا احساس پیدا ہوگیا ہے اور ہر جگہ احزاب العمال نے اس قسم کے قوانین پاس کرائے ہیں جن کی وجہ سے بہ نسبت پیشتر کے اب مزدوروں کو رعایت حاصل ہوگئی ہے لیکن یہ ہرگز نہیں کہا جاسکتا کہ اب مزدوروں کی حالت میں کوئی خرابی باقی نہیں رہی یا یہ کہ وہ اب بالکل مرفہ الحال ہیں۔ زندگی کا بیمہ یا فیکٹری ایکٹ کے ذریعہ سے یقیناً اب بہ نسبت پیشتر کے مزدوروں نے اصلاحات کرلی ہیں جنکی وجہ سے سرمایہ داروں اور مزدوروں کے حقوق کا مطالبہ کیا جاسکتا ہے۔

تجارت اور جنگ

جنگ کوئی نئی چیز نہیں کہ اسی زمانہ کے لیے مختص ہو۔ لڑائیاں ایام سابقہ میں بھی ہوا کرتی تھیں لیکن آج کل کی لڑائیوں کی بنیاد سرمایہ داری ہے۔ موجودہ تہذیب تجارتی تہذیب ہے۔ اس تہذیب و تمدن کی کہانی کے فوراً بعد موجودہ زمانہ کی مہیب اور عافیت سوز جنگوں کی داستان سرائی بھی ناگزیر ہے۔ اسوقت تک یہ کہانی بہمہ وجوہ مکمل نہیں ہوتی جبتک یہ خونیں منظر بھی نظروں کے سامنے سے نہ گزر جائے۔

اس زمانہ میں متمدن ممالک کے نزدیک یہ دو اہم سیاسی مسائل درپیش ہیں کہ کس طرح اپنے ملکی مصنوعات کے لیے بازار حاصل کیے جائیں اور جس قدر منافع حاصل ہوں ان کو کس جگہ سرمایہ کی شکل میں لگایا جائے ؟ یہ دونوں مسئلے بالکل لازم و ملزوم ہیں پہلے سیاسی چالوں سے مکمل مصنوعات کے لیے بازار حاصل کیے جاتے ہیں اور اس کلیہ کا ثبوت بھی دیدیا جاتا ہے کہ کس طرح سیاسی غلامی اور اقتصادی غلامی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

چونکہ یہ معاشی قانون ہے کہ کسی ملک میں سرمایہ کی زیادتی کی وجہ سے قیمت اشیا بڑھ جاتی ہے اس لیے وہ منافع جو غیر ممالک کے بازاروں حاصل کیا جاتا ہے اپنے ملک کے کسی کاروبار میں نہیں لگایا جاتا بلکہ ان غیر متمدن ممالک میں لگایا جاتا ہے جہاں بمقابلہ اپنے ملک کے سرمایہ کی کمی ہے۔ اور شرح سود زیادہ حاصل کیا جاتا ہے۔ اور ساتھ ہی وہاں اپنا سیاسی اقتدار قایم کرنیکی کوشش کی جاتی ہے۔ ان غیر متمدن ممالک میں احتیاطاً اپنے سرمایہ کی حفاظت کی خاطر فوجیں

اور بحری قوت ہر وقت تیار رکھنی پڑتی ہے۔ اس قسم کے واقعات کی مثال مصر اور مراکش کی گذشتہ تاریخ سے خوب واضح ہو جاتی ہے اور انگریزوں اور فرانسیسیوں کے ان دونوں اسلامی ممالک پر قبضہ و تسلط کی تاریخ سے یہ تمام اصول "سرمایہ داری" بخوبی روشن ہو جاتے ہیں۔

پریس ان تمام حرکات کو مستحسن بنانے کے لیے انکو عوام کے سامنے اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ وہ فوراً مسحور ہو جائیں۔ کبھی ان کے جذبات سے اپیل کی جاتی ہے، کبھی مادر وطن کی آہ وزاری ان کے گوش گذار کی جاتی ہے اور ہر طرح سے کوشش کی جاتی ہے کہ اپنی شخصی اغراض کو ملکی و قومی مفاد کی مدافعت کا جامہ پہنایا جائے اگر ترکوں کے خلاف انگلستان جنگ کرنے کا ارادہ کریگا تو یقین جانیے اقتصادی یا سیاسی مفاد پریس کے ذریعہ سے عوام کے سامنے نہیں پیش کیا جائے گا کیونکہ ایسا کرنے سے تو خود اپنی قلعی کھلتی ہے یعنی اگر تھریس کے علاقہ میں ریل کی انگریزی کمپنی قایم کرنے کا ذکر کیا جائے تو ظاہر ہے کہ انگلستان کے مزدوروں کے لیے کوئی خاص اور قابل ذکر فائدہ نہیں۔ اس قسم کا بہت کم ذکر کیا جائیگا۔ ہاں سب سے زیادہ زور اس مسئلہ پر دیا جائیگا کہ گیلی پولی میں انگریز "شہیدوں" کی قبروں کی محافظت انگریز قوم کا مذہبی اور اخلاقی فرض ہے چنانچہ انھیں "شہیدوں" کے نام سے عوام کے جذبات کو ابھارا جائیگا اور ان کو برسر پیکار ہونے کی ترغیب دیجائیگی۔ پروپگنڈا انیسویں صدی عیسوی کی ایجاد ہے۔ اور اس کے ذریعہ سے یہی طریق "سرمایہ داری" نے بہت ترقی کی ہے۔ علامہ اقبال نے مزدوروں کی حالت کا اپنی نظم خضر راہ میں یوں نقشہ کھینچا ہے۔

مکر کی چالوں سے بازی لیگیا سرمایہ دار   انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

بیکاری آج کل مسئلہ بیکاری بھی اپنی اہمیت کے لحاظ سے کچھ کم قابل ذکر نہیں۔ اور موجود تہذیب و تمدن کی اس سے بڑھکر اور کوئی خرابی قیاس میں نہیں آتی کہ ایک شخص جو ایمانداری کے ساتھ اپنی اور اپنے خاندان کی پرورش کرنا چاہتا ہے لیکن صرف اقتصادی مجبو کی وجہ سے جن پر اس غریب کو کوئی اختیار نہیں وہ اپنے خاندان کو ذلت وخواری کی زندگی

نہیں بچا سکتا۔ مسئلہ بیکاری کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ جب موجودہ "سرمایہ داری" کا دور شروع ہوا اور بڑے بڑے کارخانے قائم ہوئے تو وہ کاشتکار لوگ جو گاؤں میں زمینداروں کے ظلم سے تنگ آئے تھے شہروں کی طرف بھاگ چلے۔ پہلے پہل تو ان سب کی کھپت ہوگئی لیکن جب بخار و برق کی ایجاد ہوئی تو مزدوروں کی ضرورت کم ہوگئی۔ اب ایک بڑی سے بڑی مشین کے لیے بھی ایک شخص نگرانی کے لیے کافی تھا جو صرف اس کی کارروائی کو سمجھ گیا ہو۔ اس طرح مزدوروں کی بڑی جماعت جو برسرکار تھی مطلقاً بیکار ہوگئی۔ اسی زمانہ میں یورپین اقوام کو جو امریکہ ایشیا اور افریقہ میں تفوق حاصل ہوا تو ملکی مصنوعات کے لیے بازار بھی سیاسی اثر کی وجہ سے بہم پہونچ گئے۔ باوجود آپس کے تجارتی مقابلہ کے کارخانوں کی تعداد اس قدر بڑھ گئی اور ملکی مصنوعات نے اسقدر ترقی کی کہ توازن رسد و طلب قائم نہ رہ سکا۔ اس کا قدرتاً نتیجہ یہ ہوا کہ کساد بازاری کے وقت اکثر کارخانوں کو بند کرنا پڑا۔ ایک تو نئی نئی مشینوں کے استعمال سے "محنت کی" کم ضرورت باقی رہی تھی اس قسم کے تجارتی حالات نے بیکار مزدوروں کی تعداد میں بہت اضافہ کردیا۔ اب تو آہستہ آہستہ یہ نوبت پہنچ گئی ہے کہ ایک برسرکار مزدور کو اپنی بیکاری کے روز کا ویسا ہی یقین ہوتا ہے جس طرح دن کے بعد رات کا۔ اس کو مرگ ناگہانی کی طرح اس منحوس ساعت کا انتظار کرنا پڑتا ہے جبکہ وہ محنت و مزدوری سے اپنے خاندان کی پرورش کرنا چاہے گا لیکن اسکو اپنی محنت کی قیمت گرانے کے بعد بھی مزدوری نہیں ملے گی۔ اس قسم کے مناظر یورپ کے تمام صنعتی شہروں کے قرب و جوار میں ایک انسان سال کے بارہوں مہینہ دیکھ سکتا ہے۔ بقول ایک انگریز مصنف کے کہ دنیا کے سب سے مالدار شہر کے گرد و نواح میں ہمیشہ مزدوروں کی ایسی فوج نظر آئے گی جنکی سردی کے موسم میں پوشاک ہی ناکافی نہ ہوگی بلکہ اگر آپ ان کے گھر میں جاکر ایک نمک کی ڈلی بھی تلاش کرنا چاہئے تو بمشکل دستیاب ہوگی۔ یہ ہیں موجودہ تمدن کی برکات جس کے مناقب کی مدح سرائی سے ابتک ہماری زبانیں نہیں تھکیں۔ یہ اس جگہ کی حالت ہے جہاں جمہوریت اور دستوریت کے غلغلے نہایت آہنگی کے ساتھ بلند کیے جاتے ہیں۔ اقبال نے مزدوروں کو مخاطب ہوکر دوسری جگہ

بھی خوب کہا ہے سے دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب - تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری!
ہم نے اشتراکئین کے خلاف موجودہ سرمایہ داروں کے الزامات اور موجودہ تمدن کے خلاف اشتراکیت کے اعتراضات پر کافی بحث کرلی - ہم نے یہ بھی دیکھ لیا کہ دونوں فریق اپنے دعوے میں کس قدر حد سے متجاوز ہیں -

صحیح راستہ ان دونوں کے بین بین ہے - اس سے انکار نہیں کہ موجودہ تمدن میں خرابیاں ہیں لیکن ان کو درست کرنے کا طریقہ بھی ابتک غلط استعمال کیا گیا ہے -

اشتراکیت اور اسلام

ہمارے نزدیک اگر موجودہ کشمکش کو دور کرنے کا کوئی واحد ذریعہ ہے تو وہ تمام عالم کا اصول اسلام کی طرف رجوع کرنا ہے - دنیا کے کسی مذہب نے معاملات زندگی اور معاشرت کے ایسے اصول نہیں مرتب کیے جن پر بجا طور پر مسلمانوں کو ناز و فخر ہے - اسلام نے نہ صرف مسیح کی طرح اخلاقی تعلیم پر اکتفا کی بلکہ مدنی زندگی کے وہ تمام اصول بھی وضع کیے جن پر اگر آج عمل ہونے لگے - تو ہمارا عقیدہ ہے کہ یورپ کی موجودہ کشمکش مطلقاً باقی نہ رہے اسلام نے اپنے پیرووں کے لیے روحانی مساوات کے دوش بدوش مادی مساوات پر بھی زور دیا یعنی ہر مسلمان پر زکوٰۃ اسی طرح فرض کی گئی جس طرح اور احکام کی ادائگی -

زکوٰۃ

زکوٰۃ دراصل ایک مقررہ ٹیکس ہے جو راس المال پر لیا جاتا ہے - عموماً اس مال کا چالیسواں حصہ زکوٰۃ دیجاتی ہے جو تمام مصارف نکالنے کے بعد بچتا ہے - جیسا کہ اوپر ہم کہہ چکے ہیں - عام مرفع الحالی کا اندازہ صرف تناسب آمدنی کے ذریعے ہو سکتا ہے - آمدنی متناسب کرنے کی کیا دنیا کے کسی مدبر نے اس سے بہتر ترکیب بتلائی ہے ؟ یقیناً اس کا جواب نفی میں ہے اگر دنیا تمدنی تاریخ کا عہد زرین دیکھنا چاہتی ہے تو اسلام کی تاریخ کے علاوہ کوئی تاریخ اپنے آپ کو پیش کرنے کی جرأت نہیں کر سکتی - تناسب آمدنی کی مثال کیا اس واقعہ سے بہتر کہیں دنیا میں مل سکتی ہے جب لوگ اس کے متلاشی رہتے تھے کہ کوئی صدقہ قبول کرنے والا ملے ؟

آج تک جو بڑے بڑے معاشئین پیدا ہوئے تقریباً سب انفرادیت کے علمبردار تھے - چنانچہ

انھوں نے "اصل" پر معمولی سا ٹیکس لگانے کی بھی سخت مخالفت کی۔ ان سب نے سب سے بڑی یہ وجہ بیان کی کہ اصل پر اگر ٹیکس لگایا جائیگا تو وہ "اصل" بازار سے فرار ہو جائیگا۔ بعضوں نے لفظ [illegible] استعمال کیا ہے یعنی "اصل" شرمیلا ہو جائیگا اور تجارت وصنعت کے میدان میں نہ آئے گا۔ اور اس طرح عام قومی تجارت کو سخت گزند پہنچیگا۔ ہم دریافت کرتے ہیں کہ کیا مسلمانوں نے باوجود اس اصل پر ٹیکس قائم ہو جانے کے تجارت وصنعت میں ترقی نہیں کی تھی۔ کیا اس زمانے میں عربوں اور مصریوں کی تجارت تمام دنیا میں پھیلی ہوئی نہ تھی ؟

جیسا کہ ہم ابھی کہہ چکے ہیں دنیا اپنے تلخ تجربوں کے بعد میانہ روی یعنی (مسلک اسلام) کی طرف رجوع کر رہی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ واقعات کی منطق کے سامنے کسی فلسفی کی منطق نہیں چلتی گذشتہ سال سوئٹزرلینڈ کی پارلیمنٹ میں یہ تجویز پیش کی گئی کہ "اصل" پر بھی ٹیکس لگانا چاہیے۔ چنانچہ ممبران اشتراکی نے تقریباً اکثریت اپنے ہم نوا بنالی لیکن چونکہ معاملہ نہایت اہم تھا عوام سے استصواب رائے کیا گیا (جیسا کہ وہاں کا ملکی دستور ہے) اسی زمانہ میں سوئٹزرلینڈ کے سکہ کی قیمت تمام بڑے بڑے بازاروں میں گر گئی۔ یورپ کے تمام ممالک کے اور خصوصاً انگلستان کے سرمایہ داروں نے جنکا "اصل" سوئٹزرلینڈ میں لگا ہوا تھا اپنی اپنی گورنمنٹوں سے خفیہ طور پر سوئٹزرلینڈ کا معاملہ خاطر خواہ طے کرانے کی درخواستیں کیں۔ اسوقت تمام یورپ میں سراسیمگی اور بدحواسی کا عالم تھا کیونکہ اس معاملہ کے بعد سب ممالک سوئٹزرلینڈ کی ضرور پیروی کرتے۔

خود انگلستان کے اراکین حزب العمال نے یہ تجویز منظور کی کہ "اصل" پر بھی ٹیکس لگنا چاہیے چنانچہ ان لوگوں نے اس اصل پر جو ایام جنگ میں سامان حرب وغیرہ تیار کرنے میں حاصل کیا گیا ہے ایک خاص ٹیکس" لگانے میں کچھ کامیابی حاصل کرلی۔ کیونکہ ایام جنگ میں جو آمدنی حاصل کی گئی۔ اس کی ملکیت کی تمام قوم حقدار ہے اور خاص شخص یا کمپنی کو اپنی ملکیت کہنا بے انصافی ہوگی۔ اس لیے ایک [illegible] ماورائے آمدنی کے ٹیکس کے جو اس اصل سے حاصل کی گئی ہو مقرر کیا گیا۔ غرضکہ ہر طرف سچائی کی طرف اقدام ہو رہا ہے اور یہ امید کرنا بیجا نہ ہوگا کہ تمام اقوام عالم

اصول اسلام کو قبول کرنے پر آمادہ ہو جاوینگے۔

حرمت ربا جس طرح مسئلہ زکوٰۃ کی اہمیت کو عام طور پر نظر انداز کر دیا جاتا ہے اس سے
زیادہ حرمت ربوٰ کے متعلق تعلیم یافتہ لوگوں میں غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں بعضوں
نے تو یہ فیصلہ ہی کر دیا ہے کہ مسلمانوں کے ادبار و افلاس کے اسباب میں سے ایک حرمت ربا
اور زکوٰۃ دینا بھی ہے۔ کیونکہ دولت و سرمایہ کے بڑھانے کا اتنا موقع نہیں دیا جاتا ہے جتنا اس میں سے ساقط
نکل جاتا ہے۔ حرمت ربوٰ کے ذریعہ اسلام نے صرف دائن و مدیون یعنی سوسائٹی کے دو ممبروں
کے ناگوار تعلقات قایم کرنے کا موقعہ ہی نہیں دیا بلکہ ہمیشہ کے لیے سرمایہ داروں کی غاصبانہ
چیرہ دستیوں کو مٹا دیا۔ موجودہ نظام تمدن جو تمامتر خود غرضی پر مبنی ہے درست کرنے کے لیے اسلام
نے اپنے احکام کے ذریعہ صحیح راستہ بتلا دیا۔ یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ خود غرضی تو فطرتاً جذبات
انسانی کی محرک ہے اور جس طرح کہ فلسفی مل نے کہا ہے۔ کہ اگر کوئی شخص اپنی پندار میں نہایت نیک کام
کرتا ہے وہ بھی دراصل خود غرضی پر مبنی ہوتا ہے" اگر کوئی شخص کسی پر رحم کرتا ہے تو اس میں بھی خود غرضی
کا شائبہ ضرور ہے کیونکہ کسی دوسرے کو مصیبت میں دیکھ کر انسان خود دل گرفتہ اور آزردہ خاطر ہوتا ہے
اس لیے وہ اُس پر رحم کرتا ہے یعنی جذبات عالیہ بھی تمامتر خود غرضی پر مبنی ہیں۔ لیکن ہم کو اس فلسفیانہ بحث
سے سروکار نہیں۔ ہر معقول انسان کے نزدیک دقیقاً فلسفی بھی جن میں داخل ہے) خود غرضانہ
حرکات اسی حد تک جائز ہیں جب تک کہ اس شخص خود غرض سے اجتماعی مفاد کو نقصان کا اندیشہ نہو۔
غرضکہ اگر اقوام یورپ اپنی موجودہ معاشی پیچیدگیوں کو رفع کرنا چاہتی ہیں تو اس کے علاوہ
اور کوئی چارہ کار ان کے پاس نہیں کہ وہ بھی اسلامی اصول پر عمل پیرا ہوں۔ چنانچہ ان اصول
پر ایک حد تک جمہوریہ روس میں حکومت کی طرف سے عمل ہو رہا ہے لیکن یہ لوگ کبھی کبھی
حد سے تجاوز کر جاتے ہیں مثلاً قانون میراث کو انھوں نے یکسر اڑا دیا ہے تاہم امید ہے کہ عنقریب
جب مدنی زندگی اور ہیئت اجتماعیہ کے معاملات زندگی کا ان لوگوں کو تجربہ ہوگا تو آہستہ آہستہ
صحیح راستہ پر آجائینگے۔

یوسف حسین نگار

شذرات

عالم اسلامی کا موجودہ اضطراب حیات ملی کی کشمکش تمام دنیا کے مسلمانوں کی توجہ کی محتاج تھی اسی لیے دور و نزدیک متعدد تحریکیں جداگانہ ناموں اور مختلف صورتوں میں جلوہ گر ہوئیں۔ جنگ بلقان و جنگ یورپ کے بعد ترکی، عرب، و ترکستان و دیگر اقطاع عالم کے مسلمانوں نے اس قدر ضرور محسوس کر لیا کہ ملت اسلامی کی بقا جمعیت و شیرازہ بندی سے ہی ممکن ہے اور ایسے وقت میں جبکہ تمام عالم اپنی ہوسناکیوں اور حرص و آز کا آماجگاہ اسلامی ممالک کو بنائے ہوئے ہے اس مسئلہ کی اہمیت اور فوری ضرورت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ لیکن گزشتہ عالمگیر جنگ کے انتشار و اضطرار میں کسی عملی کام کی گنجائش درکنار اس طرف پوری توجہ کا بھی موقع نہ تھا لیکن اب وہ وقت گزر چکا ہے اور ہر ملک اپنی استطاعت اور ہر فرد اپنی بصیرت کے موافق اس مقصد عظیم کی طرف متوجہ ہو گیا ہے۔

اسی سلسلہ میں مولانا ابو الکلام آزاد کی نگرانی میں "الجامعہ" کا اجرا ایک مبارک فال ہے اور مسلمانان ہند کی سیاسی اہمیت کا لحاظ کرتے ہوئے "الجامعہ" کو آج سے پہلے جاری ہو جانا چاہیے تھا مولانا نے اس رسالہ کو عربی زبان میں شائع کیا ہے جو بلاشبہ تمام ممالک اسلامی کی زبان ہے اور چونکہ ایک حصہ زبان فارسی کا بھی رکھا گیا ہے اس لیے تمام اسلامی ممالک میں اس رسالہ کا پڑھا اور سمجھا جانا یقینی ہے۔

"الجامعہ" کے مقاصد میں مندرجہ ذیل امور کا بھی ذکر کیا گیا ہے:۔

(۱) تمام ممالک اسلامیہ و شرقیہ اور بالخصوص ہندوستان و ممالک اسلام و عرب میں باہمی تعلقات پیدا کرنا اور ایک دوسرے ملک کے واقعات و حالات پر روشنی ڈالنا۔

(۲) اس وقت کہ تمام دنیا انقلابات و تغیرات کی آماجگاہ بنی ہوئی ہے اور ہر ملک میں جدید اصلاحات و گزشتہ نقائص کے دور کرنے کی فکر کی جا رہی ہے اس امر کی کوشش کرنا کہ ان

تمام مساعی کو باہم گر ایک رشتہ میں منسلک کر دیا جائے اور اس میں یکجہتی پیدا کی جائے۔

گزشتہ عالمگیر جنگ اپنے عظیم الشان نتائج ہلاکت وتباہی کے اعتبار سے آپ اپنی نظیر ہے کتنی ہی سلطنتیں صفحۂ ہستی سے محو ہو گئیں، تاجدار بے خانماں، ممالک معدوم، اور اقوام مثل حرفِ باطل کی طرح مٹ گئے۔ اتلاف جان و نقصان مال کا اندازہ لگانا تو غالباً آج بھی ناممکن ہے لیکن سب سے بڑھ کر جو انقلاب ہوا ہے وہ خیالات و روایات کی تبدیلی ہے جس نے آج ملکوں کے نام، قوموں کی حیثیت، سلطنتوں کے نظام، اور دنیا کی اکثر مسلمہ اصولوں کو اس طرح بدل دیا گویا اُن کا وجود ہی نہ تھا اور اگر تھا بھی تو مٹ جانے ہی کے لیے!

ان حالات کا لازمی نتیجہ تھا کہ بعض طاقتور سلطنتیں اور سرمایہ دار قومیں آج بالکل مفلوک الحال ہیں اور عام فلاکت ونکبت تو تقریباً یورپ کے ہر ملک پر چھائی ہوئی ہے لیکن قوموں کی تاریخ میں یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ اس عام بربادی و مالی مشکلات کا اگر سب سے کم کسی سلطنت پر اثر پڑا ہے تو وہ سلطنت ترکی ہے!

اگرچہ سلطنت ترکی کے پاس مال و متاع نہ تھا، اُس کے ذخائر و سائل و دولت زمین میں دفن تھے اُس کے یہاں مالیات کے نبض شناس اور صنعت و حرفت کے ماہر نہ تھے لیکن آج اُس کا سکہ دنیا کے بازار میں تقریباً وہی قیمت رکھتا ہے جو جنگ سے قبل تھی اور زمانہ جنگ کے طویل اندوہناک عرصہ میں اُس نے صرف ۱۶ کرور پونڈ کا کاغذی سکہ اپنی سلطنت میں جاری کیا تھا، جو ایسے ملک کے لیے جس کے خزائن دولت بیشمار ہوں اور عام پیداوار کی فراوانی ضرب المثل ہو کچھ بھی حقیقت نہیں رکھتی

اگرچہ دنیا عرصہ سے امن و امان کی محتاج ہے لیکن گزشتہ چند سال کی خونریزی نے عام اضطراب و بےچینی پیدا کر دی ہے جس کا لازمی نتیجہ امن و عافیت کی طلب، اور سکون و راحت کی تلاش ہے۔ لیکن عرصہ تک زمانہ کی رفتار اس قسم کی ہر کوشش کو مظلوم کی آواز کی طرح باقی

رہی اور اپنی ہولناک سفاکیوں کے لیئے نت نئے طرز ستم ایجاد کرتی رہی۔ مگر ایسا وقت بھی آتا ہی جب "درنہ ستانی بہ ستم می رسد" کا دست غضب ان ظالمانہ کوششوں کا انسداد کرنے کے لیے بڑھتا ہی اور دنیا محو حیرت رہ جاتی ہی کہ جرمنی و آسٹریا جو جنگ جدال، قتل و غارت، اور ہلاکت و بربادی کے مرادف سمجھے جاتے تھے آج جنگ کے خیال سے بھی بعید دور ہیں کہ جرمنی میں باوجود ہزارہا اختلافات باہمی و مناقشات اندرونی کے اس ایک امر میں سب متفق ہیں کہ آیندہ خواہ کچھ ہی ہو لیکن جنگ نہ ہو؟ چنانچہ فرانس کے خلاف مکمل ستیاگرہ اس کی روشن مثال ہی۔ آسٹریا اپنے حلیفوں سے ایک منزل اور آگے ہی اور اگر تازہ اطلاعات صحیح ہیں تو اس نے اپنے ملک سے فوجی قوت کو بالکل ختم کر کے ایک ایسی مثال قائم کی ہی جس کی نظیر آج تمام عالم میں کہیں نہیں مل سکتی۔ سال رواں کے بجٹ میں جس قدر رقم فوجی اخراجات کے لیے رکھی گئی تھی وہ سب نامنظور کر دی گئی اور اُس کی بجائے کسی قدر پولیس میں اضافہ کر دیا گیا ہی اور یہ کوشش ہی کہ اندرونی انتظامات بالکل پولیس ہی کے ہاتھ میں ہوں اور چونکہ اس وقت جنگ کا تصور بھی نہیں لہذا فوج کی مطلق ضرورت نہیں۔

مختلف حصص ملک میں بعض اندوہگیں واقعات اور بالخصوص صوبہ پنجاب کے تازہ فسادات قومی تحریک اور ہندو مسلم اتحاد کے لیے موت کا حکم رکھتے ہیں۔ موجودہ حالات میں ہر شخص یہ سوال کرنے پر مجبور ہو جاتا ہی کہ کیا واقعی وہ ہندو مسلم اتحاد ایک فرضی و مصنوعی چیز تھی جو محض سیاسی مصلحتوں اور ملکی ضروریات کے لیے ایک وقت خاص کے لیے وضع کی گئی تھی یا درحقیقت وہ ایک ایسی ضرورت ہی جس کا وجود ہمیشہ اور ہر حال میں ضروری ہی؟ اس بحث کے مختلف پہلوؤں اور اُن کی تشریح و توضیح اور رد و قدح کے لیے اخبارات کے صفحات ہی زیادہ موزوں ہیں لیکن ہم اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے کہ ہندوستان کی مختلف قوموں میں اتحاد باہمی اور مقاصد سیاسی میں یکجہتی ملک کی فلاح کے لیے لازمی اور

ضروری ہی، صرف اس قدر عرض کریں گے کہ اگر اکابرین قوم اختلافات باہمی پر پردہ ڈالنے کے بجائے اُن کو وضاحت سے بیان کرکے جرأت ودلیری کے ساتھ اتحاد عمل کے صحیح معنے سمجھانے کی کوشش کرتے اور لفظ "اتحاد" کو الف لیلہ کا "سیسم" یا اسم اعظم ہوجانے سے بچاتے تو غالباً یہ صورت نہ پیدا ہوتی۔ لیکن اس سے بھی زیادہ غفلت اخبارات کی طرف سے کی گئی جن کی نامناسب قابل اعتراض تحریروں نے باہمی منافرت وجماعتی اختلافات ومذہبی جذبات کو اس طرح برانگیختہ کردیا کہ اب صورت اصلاح نظر نہیں آتی۔

عرصہ سے ملک میں باا ثر وقابل وقعت اخبارات کی کمی ہی اور گزشتہ دو سال کے انقلاب انگیز زمانہ میں اگر "ینگ انڈیا" کی رہنمائی معاون نہ ہوتی تو غالباً یہ یا اسی قسم کا کوئی دوسرا فتنہ اُٹھ کھڑا ہوتا۔ آج جبکہ مصیبت کا وقت نظر آرہا ہی ایک باوقعت وبا اثر اخبار کی ضرورت اور زیادہ محسوس ہوتی ہی اور غالباً محض انگریزی اخبارات کو موجودہ ضروریات کے لیے کافی خیال کرلینا صحیح نہیں ہی۔

جناب شیخ الجامعہ، جامعہ ملیہ کو حضرت عبدالعزیز جاویش کا ایک مکتوب بزبان عربی موصول ہوا ہی جس سے ظاہر ہوتا ہی کہ حکومت ملیہ انگورہ نے ایک محکمہ بنام "امور شرعیہ واوقاف وکالتی تدقیقات وتالیفات اسلامیہ ہئت علیہ سی" قائم کیا ہی جس کے روح رواں علامہ موصوف ہیں۔ اوران کی خواہش ہی کہ یہ ادارہ دنیائے اسلام کے علوم وفنون ومساعی علمیۂ ادبیہ کا مرکز قرار پائے۔ چنانچہ اکثر اسلامی مدارس کو اُنھوں نے اتحاد عمل کی دعوت دی ہی۔ امید ہی کہ اشاعت آیندہ میں ہم اصل تحریر مع ترجمہ شائع کرسکیں گے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جامعہ

جلد ۲ | ربیع الاول سنہ ۱۳۴۲ھ مطابق اکتوبر سنہ ۱۹۲۳ء | نمبر ۴

قسطنطنیہ کا تعلق اسلام کے ساتھ

از جناب مولانا محمد اسلم صاحب جیراجپوری پروفیسر جامعہ ملیہ اسلامیہ

قسطنطنیہ کا شمار اگرچہ مقدس مقامات میں نہیں ہے لیکن اسلام میں اس کی اہمیت نہایت عظیم الشان ہے۔ اس کا تاریخی تعلق اسلام کے ساتھ خود عہد نبوت سے شروع ہو جاتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس وقت دعوتِ اسلام کے خطوط شاہانِ عالم کے نام بھیجے اُس وقت حارث بن عمیر ازدی کے ہاتھ ایک خط ملک شام کے [illegible] بادشاہ شرجیل بن عمرو کے نام بھی بھیجا۔ جو قیصر کا ماتحت تھا اور اُس کے اثر سے عیسائی ہو گیا تھا۔

غسانی نے حضرت حارث کو قتل کر ڈالا۔ آنحضرت صلعم نے اُن کے قصاص کے لیے جمادی الاولیٰ سنہ ۸ھ میں تین ہزار فوج بھیجی جس کا امیر اپنے عزیز صحابی حضرت زید بن حارثہ کو مقرر کیا۔ اور فرمایا کہ اگر

وہ شہید ہو جائیں تو جعفر بن ابی طالب اور جو وہ بھی شہادت پا جائیں تو عبداللہ بن رواحہ امیر ہوں۔

غسانی نے خبر پا کر مقابلہ کے لیے ایک لاکھ فوج جمع کی۔ ہرقل بھی اس زمانہ میں ملک شام میں آیا ہوا تھا۔ اس نے بھی امداد کے لیے اپنے بعض امراء کو فوجیں دے کر بھیجا۔

مقام موتہ میں جنگ ہوئی۔ حضرت زید شہید ہو گئے۔ اس کے بعد جعفر بن ابی طالب نے سو سے زیادہ زخم کھا کر چوب رخ کی طرف سے شہادت پائی۔ پھر عبداللہ بن رواحہ نے جام شہادت نوش کیا۔ آخر میں خالد بن ولید نے علم سنبھالا۔ اور اس بہادری کے ساتھ لڑے کہ اس روز ان کے ہاتھ میں آٹھ تلواریں ٹوٹیں۔ دشمنوں کے نرغہ سے اپنی جماعت کو نہایت خوبی سے باہر نکال لائے صرف بارہ مسلمان شہید ہوئے تھے۔ مزید مقابلہ کی کوئی صورت نہیں تھی۔ اس لیے مدینہ واپس چلے آئے۔

اب غسانی قیصر کی مدد سے مسلمانوں پر حملہ کرنے کی تیاریاں کرنے لگا۔ مدینہ میں اکثر اس کی طرف سے متوحش خبریں پہونچا کرتی تھیں یہاں تک کہ کبھی کبھی راتوں کو اس کے حملہ کی افواہ اُڑ جاتی تھی اور لوگ مضطرب اور پریشان ہو جاتے تھے۔

آنحضرتؐ نے اسی وجہ سے دوبارہ سنہ ۱۱ھ میں ۹ ہزار فوج غسانیوں کے خطرہ کو مٹانے کے لیے تیار کی۔ لیکن یہ لشکر حضورؐ کی علالت کی وجہ سے رک گیا۔ وفات نبویؐ کے بعد حضرت ابو بکرؓ نے اس کو بھیجا۔

سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھ لیا تھا کہ مسلمانوں کے لیے غسانی خطرہ کوئی چیز نہیں ہے۔ جو کچھ اضطراب ہے وہ رومیوں کی وجہ سے ہی اس لیے امت اسلامیہ کا رخ خطرہ کے اصل مرکز کو مٹانے کی طرف پھیرا۔ اور فرمایا کہ

اَوَّلُ جَیْشٍ مِنْ اُمَّتِیْ یَغْزُوْ مَدِیْنَۃَ قَیْصَرَ مَغْفُوْرٌ لَّھُمْ — میری امت کی پہلی فوج جو قیصر کے شہر پر حملہ آور ہو اس کو اللہ نے بخش دیا ہے۔

یہ روایت صحیح بخاری اور حدیث کی دیگر کتب میں موجود ہے۔
حضور کو اس امر کا علم دیا گیا تھا کہ پہلے حملہ آور فوج فتح نہیں کر سکے گی۔ اسی لئے صرف حملہ ہی پر مغفرت کا وعدہ فرمایا اور فتح کی شرط نہیں لگائی۔ اس کے بعد دوسری حدیث میں فتح کی بھی بشارت دی اور فرمایا کہ
لتفتحن القسطنطینۃ ولنعم الجیش تلک الجیش تم یقیناً قسطنطنیہ فتح کرلوگے یہ فاتح فوج بھی اچھی ہوگی
ولنعم الامیر امیرہا۔ اور اس کا امیر بھی اچھا ہوگا۔
اس حدیث کو امام حاکم نیز امام احمد بن حنبل نے مسند میں۔ اور ابن عبدالبر نے استیعاب میں حضرت بشر غنوی سے روایت کیا ہے۔
صدر اول میں ملک شام فتح ہوگیا غسانی بادشاہ اسلام لایا اور اس کا خطرہ جاتا رہا۔ لیکن جنگی مشغولیتوں کی وجہ سے قسطنطنیہ پر حملہ کا موقع نہ مل سکا۔
جب زمام خلافت امیر معاویہ کے ہاتھ میں آئی تو انہوں نے اس کی تیاری کی۔ اور ۴۹ھ میں عظیم الشان لشکر فراہم کرکے بری اور بحری دونوں راستوں سے قسطنطنیہ کی طرف روانہ کیا۔ سفیان بن عوف کو سپہ سالار عام اور اپنے بیٹے یزید کو ایک خاص حصہ کا امیر بنایا۔
مدینہ میں اس وقت جو صحابہ کرام موجود تھے ان میں سے اکثر مغفرت موعودہ کو حاصل کرنے کے لئے اس لشکر میں جا کر شریک ہوئے۔ مثلاً حضرت ابو ایوب انصاری میزبان رسول اللہؐ۔ عبادہ بن صامت۔ ابوالدرداء۔ عبداللہ بن عمر۔ عبداللہ بن زبیر۔ عبداللہ بن عباس وغیرہ رضی اللہ عنہم۔
لیکن قسطنطنیہ کی فصیل قدرتی طور پر نہایت مضبوط تھی۔ اور رسد کے لئے راستے کھلے ہوئے تھے۔ اس وجہ سے محاصرہ زیادہ کارگر نہ ہوا۔ علاوہ بریں عرب کے لیے وہاں کی سردی بھی سخت تھی۔ اور اس موسم میں وہ جزائر میں آکر رہتے تھے۔ ان سب پر مزید یہ کہ دشمنوں نے نفط سے بہت سی کشتیاں بھی جلا دیں۔ ان وجوہات سے نقصان اٹھا کر واپس چلے آئے

بہت سے مسلمان شہید ہوئے۔ حضرت ابوایوب انصاری نے بھی وہیں وفات پائی اور قسطنطنیہ کی فصیل کے متصل دفن کیے گئے۔

دوسرا حملہ پھر بنی امیہ ہی کے عہد میں ۹۸ھ میں ہوا۔ اور سلیمان بن عبدالملک نے فتح موعودہ کی امید پر اپنے بھائی مسلمہ کو ایک فوج گراں دیکر بھیجا۔ وہ ایک سال تک محاصرہ کیے ہوئے پڑا رہا۔ اور کچھ نہ کرسکا۔ اس لیے حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنے عہد میں اس کو واپس بلا لیا۔

تیسرا حملہ پھر ہشام بن عبدالملک کے عہد میں ۱۲۱ھ میں ہوا۔ لیکن اس دفعہ بھی کامیابی نہیں ہوئی۔

خلفاء عباسیہ میں سے صرف مہدی نے فتح قسطنطنیہ کی کوشش کی۔ اور ۱۶۵ھ میں اپنے بیٹے ہارون الرشید کو ایک لاکھ فوج دیکر بھیجا۔ وہ باسفورس کے ساحل تک پہونچا۔ ملکہ ایرینی نے جو وہاں اپنے کمسن بیٹے قسطنطین سادس کی طرف سے حکمراں تھی خوشامد کرکے ہارون کو ۹۰ ہزار دینار سالانہ جزیہ پر راضی کرلیا۔ اس وجہ سے وہ صلح کرکے واپس چلا آیا۔

سلجوقیوں میں سے ملک شاہ بھی حدود قسطنطنیہ تک پہونچا تھا۔ وہاں کے امرا نے ہزار دینار سالانہ جزیہ پر صلح کرلی۔

آل عثمان نے جب ایشیائے کوچک میں اپنی سلطنت قائم کرلی تو یورپین بادشاہوں کے ساتھ ان کی مسلسل جنگ قائم ہوگئی۔ جس کے لیے یہ بھی کچھ کمزور نہ تھے۔ رفتہ رفتہ انھوں نے پورا بلقان فتح کرلیا۔ صرف قسطنطنیہ رہ گیا تھا جس کی فتح ان کی نظر میں نہایت اہمیت رکھتی تھی۔ اس لیے کوشش شروع کی۔

بایزید ایلدرم پہلا عثمانی سلطان تھا جس نے اس کا محاصرہ کیا۔ پھر مراد ثانی نے دو لاکھ فوج کے ساتھ اس کی فتح کی کوشش کی مگر اسے روم کی اندرونی شورشوں کی وجہ سے اس کو محاصرہ اُٹھا کر واپس آنا پڑا۔

اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا سلطان محمد ۸۵۵ھ میں تخت نشین ہوا۔ جس کی قسمت میں یہ سعادت روزِ ازل میں لکھی گئی تھی۔ تخت نشین ہونے کے ساتھ ہی اس نوزدہ سالہ نوجوان سلطان سے رومیوں نے غداری کی اور جنگ چھیڑ دی۔ سلطان ان کی دست درازیوں سے تنگ آ گیا تھا۔ کیونکہ ان کے پاس قسطنطنیہ ایک ایسا سنگین حصار تھا جس کی بدولت وہ ہر قسم کے خطرات سے پناہ میں تھے۔

سلطان محمد نے وہ حدیث بھی سُنی تھی جس میں اس کے فاتح کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تعریف فرمائی ہے۔ نیز اس کا باپ اس کے لیے وصیت بھی کر گیا تھا۔ علاوہ بریں رومیوں کے بدعہدی سے اس کے انتقام کا جوش بھڑک اٹھا تھا۔ ان وجوہات سے اس کے دل میں اس شہر کے فتح کرنے کا عزم راسخ پیدا ہو گیا۔

اس فکر میں وہ اس قدر مضطرب رہتا تھا کہ ایک بار شب کو اُسے نیند نہیں آئی۔ آدھی رات کو جب زیادہ بے قراری بڑھی تو وزیر خلیل پاشا کو طلب کیا وہ اس بے وقت کی طلبی سے گھبرایا ہوا پہونچا۔ سلطان نے کہا کہ تم دیکھتے ہو کہ رنج و غم سے میری کیا حالت ہے۔ کروٹیں بدلتا ہوں اور کسی پہلو نیند نہیں آتی۔ میں تم سے صرف ایک درخواست کرتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ "قسطنطنیہ مجھکو دے دو"۔

دانشمند وزیر نے اس طلب صادق کو دیکھ کر سمجھ لیا کہ اب اس شہر کے فتح ہونے کا قطعی وقت آ گیا ہے۔ اس نے سلطان کو تسلی دلائی اور واپس گیا۔

اسی درمیان میں ایک مستجاب الدعوات بزرگ شیخ آقا شمس الدین کو کشف کے ذریعہ سے معلوم ہوا کہ اس سال فلاں تاریخ اور فلاں وقت میں مسلمان قسطنطنیہ میں داخل ہو جائیں گے۔ اس نے وزیر سے کہا۔ وزیر نے یہ بشارت سلطان کو سنائی۔

سلطان ہر قسم کا ساز و سامان درست کر کے جمادی الاول ۸۵۷ھ کے آغاز میں ادرنہ سے ساٹھ ہزار سوار اور تیس ہزار پیادہ فوج کے ساتھ روانہ ہوا۔ شیخ آقا شمس الدین اور آقا بیگ کو بھی کہ ممتاز بزرگانِ دین میں سے تھے اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دی۔ تاکہ ان کی دعاؤں

کی مدد سے کامیابی حاصل کرے۔ یہ دونوں حضرات بخوشی درضعیت صف مجاہدین میں شامل ہو گئے سلطانی فوج کے ساتھ رضاکاروں اور تماشائیوں کی تعداد بھی دو لاکھ سے کم نہ تھی۔

تین طرف سے محاصرہ کر کے جنگ شروع کی۔ قسطنطنیہ کے گرد جو خندق تھی اُس میں خلیج کے دہانہ سے پانی آتا تھا۔ اس دہانہ پر مضبوط زنجیر رومیوں نے لگا دی تھی تاکہ اسلامی جہاز اور کشتیاں نہ آسکیں نیز حفاظت کے لیے جنگی جہاز بھی رکھ چھوڑے تھے۔ مسلمانوں کے لیے فصیل تک پہونچنے کی کوئی سبیل نہ تھی۔ اس لیے انھوں نے خندق کو پاٹنا شروع کیا۔ لیکن جو یہ دن کو پاٹتے تھے رومی رات کو اس کو صاف کر دیتے تھے۔

سلطان نے اب وہ تدبیر سوچی جو آج تک دنیا میں کسی سے نہیں ہو سکی۔ یعنی اس نے خندق سے سمندر تک دس میل لکڑی کے تختے بچھا دیئے اور ان پر موم اور چربی ڈلوا کر سمندر سے ۸۰ کشتیاں راتوں رات غلطہ کے بالائی حصہ سے لا کر خندق میں ڈلوا دیں۔ یہ کشتیاں سپاہیوں اور سامان جنگ سے لدی ہوئی تھیں۔ صبح کو رومیوں نے شہر پناہ سے ان پر آتش فشانی شروع کی۔ اور یہ کوشش کی کہ نفط سے ان کو جلا دیں۔ لیکن مسلمان ہوشیار تھے۔

آخر وہ وقت آ گیا جو آقا شمس الدین نے مقرر کیا تھا۔ لیکن اس وقت تک شہر فتح نہیں ہوا وزیر دوڑا ہوا آقائے موصوف کے پاس آیا۔ دیکھا کہ وہ سجدہ میں پڑے ہوئے دعا کر رہے ہیں۔ تھوڑی دیر میں سر اُٹھایا۔ اور کہا کہ فتح مبارک۔ اُس وقت فصیل ٹوٹ چکی تھی اور مسلمان شہر میں داخل ہو رہے تھے۔ وزیر نے آقا کی مبارکباد سلطان کو پہونچائی۔ وہ فوراً سجدۂ شکر میں گر پڑا۔ اس کے بعد کہا کہ میں نے اس فتح پر یہ سجدۂ شکر نہیں کیا ہے۔ بلکہ اس بات پر کہ اللہ تعالےٰ نے میرے زمانہ میں ایسے بزرگوں کو باقی رکھا ہے۔

پورے ۵۱ دن کے محاصرہ کے بعد اسلام کی ساڑھے آٹھ سو سال کی امید سلطان محمد کے ہاتوں سے برآئی۔ ۲۰ جمادی الثانی یوم چہارشنبہ ۸۵۷ھ مطابق ۱۴۵۳ء میں وہ قسطنطنیہ میں داخل ہوا۔ اُسی روز سے اس کا نام فاتح رکھا گیا۔

تمام عالم اسلامی میں اس فتح پر خوشی کے نعرے بلند ہوئے کیونکہ اس سے آنحضرتؐ کی وہ بشارت جو اُمت کو دے گئے تھے پوری اُتری۔

فتح کے بعد حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے مزار شریف پر عالیشان جامع مسجد تعمیر فرمائی۔ پہلا جمعہ جب اس میں پڑھا گیا تو آقا شمس الدین نے سلطان کی کمر سے تیغ باندھی۔ اُس وقت سے اب تک یہ دستور چلا آتا ہے کہ آل عثمان میں سے جو سلطان تخت نشین ہوتا ہے اُس کی تاجپوشی اور شمشیر بندی کی رسم اسی مقدس مسجد میں ادا کی جاتی ہے۔

حدیثوں میں ایک دوسری فتح قسطنطنیہ کا بھی ذکر ہے جو قیامت سے پہلے ہوگی۔ صحیح مسلم شریف میں متعدد روایتیں ہیں جن کا خلاصہ مضمون یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت قائم ہونے سے پہلے بنی اسحاق میں سے ستر ہزار آدمی قسطنطنیہ پر یلغار کریں گے۔ اور اس کو بلا نیزہ اور بلا شمشیر بغیر اسلحہ کی تکبیر اور تہلیل کے نعروں سے فتح کریں گے۔

اس روایت میں بنی اسحاق سے غالباً اشارہ اس امر کی طرف ہے کہ وہ غیر اہل عرب ہونگے۔ یعنی بنی اسماعیل میں سے نہ ہوں گے۔ تکبیر و تہلیل سے عیاں ہے کہ وہ مسلمان ہوں گے۔

ظاہر ہے کہ اس روایت سے پہلی فتح جو سلطان محمد فاتح نے حاصل کی نہیں مراد لی جاسکتی۔ کیونکہ وہ بزور اسلحہ شدید معرکوں کے بعد ہوئی تھی۔ اغلب یہ ہے کہ اس روایت میں اس فتح کی پیشین گوئی ہے جو اس وقت غازی مصطفےٰ کمال نے اس شہر پر حاصل کی ہے۔ اور جس کو دیکھنے کی سعادت ہم لوگوں کو حاصل ہوئی ہے۔ کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ ۱۶ مارچ ۱۹۲۰ء سے یہ دارالخلافہ مسلمانوں کے ہاتوں سے نکل کر بالکل اتحادیوں کے قبضہ میں چلا گیا تھا۔ گو وہاں خلیفہ اور اس کا وزیر داماد فرید پاشا برقرار تھے لیکن صرف نام کے تھے۔ ان کے پوست میں اتحادی نواب حکومت کرتے تھے۔ چنانچہ ۱۱ اپریل ۱۹۲۰ء کو وزیر مذکور نے شیخ الاسلام دری زادہ عبداللہ افندی سے فتویٰ لیکر ان حامیان دین و وطن کو جو سرزمین اناطول میں جمع ہوگئے تھے باغی قرار دیا۔ اور اتحادیوں کے قرضہ سے مصطفےٰ پاشا کردی کی ماتحتی میں اُن کے مٹانے کے لیے

فوج بھیجی۔ پھر ۲۰ رمئی سنہ ۱۹۲۰ء کو مصطفیٰ کمال پاشا۔ فواد پاشا۔ قرہ واصف بک۔ مصطفیٰ فوزی پاشا ڈاکٹر عدنان بک۔ رؤف پاشا وغیرہ پر غائبانہ موت کا فتویٰ صادر کیا گیا۔ اور ان کے ہر قسم کے فوجی امتیازات اور شہری حقوق ضبط کرنے کا اعلان کر دیا گیا۔

لیکن بتائید الہٰی ان راسخ العقیدت مجاہدوں اور غازیوں نے یونانیوں کو شکست دیکر اس شہر کو بلا اسلحہ کے محض اپنے شیرانہ نعرہائے تکبیر و تہلیل سے پھر فتح کر لیا۔ اب ان کی جانباز فوجیں وہاں داخل ہو رہی ہیں۔ ۲۵ رنومبر کو خود غازی مصطفیٰ کمال کا داخلہ بھی انشاء اللہ نہایت دھوم کے ساتھ ہوگا۔

اس کے بعد احادیث ہم کو کچھ اور بھی آگے لے چلتی ہیں۔ ابوداؤد شریف میں ہے کہ بیت المقدس کی آبادی مدینہ کی ویرانی ہے۔ اور مدینہ کی ویرانی ابتدائے جنگ ہے۔ اس کے بعد فتح قسطنطنیہ ہے۔ پھر ساتھ ہی خروج دجال ہے۔

ترمذی اور ابوداؤد دونوں نے یہ روایت لکھی ہے کہ فتح قسطنطنیہ اور خروج دجال میں صرف سات مہینہ کا فصل ہے۔

پیشین گوئیوں کے الفاظ میں چونکہ ابہام ہوتا ہے اس لیے آئندہ واقعات کے متعلق ہماری تفسیر ابھی قبل از وقت ہے۔ انشاء اللہ جب موقع آئے گا تو لکھیں گے۔

اس مضمون میں صرف یہ دکھانا تھا کہ قسطنطنیہ کا تاریخی تعلق اسلام کے ساتھ عہد نبوت سے ہے اور قیامت تک رہے گا۔ انشاء اللہ

شیر شاہ
اور
اُس کا نظام حکومت

تاریخ میں فرید ابن حسن کا نام مدتوں یادگار رہے گا۔ ایک معمولی جاگیردار کے رتبہ سے ترقی کرکے وہ اپنے زمانہ کا سب سے بڑا بادشاہ ہوا۔ اس نے وہ شہرت حاصل کی کہ اب تک اس کا نام تاریخ ہند کے مطالعہ کرنے والوں کے لیے ایک خاص لطف رکھتا ہے، اوائل عہد جوانی میں اس نے مصمم ارادہ کرلیا تھا بلکہ لوگوں سے کہا بھی کرتا کہ وہ اُس افغانی سلطنت میں جان ڈال کر رہے گا جسے بابر کی تلوار نے پانی پت (۱۵۲۶) کی لڑائی کے بعد بالکل نیست و نابود کر دیا تھا۔ ابراہیم لودی کی شکست سے افغانوں کے دلوں میں ایسا خوف بیٹھ گیا تھا کہ مدتوں مغل فاتحوں کے ظلم و ستم کی داستان دہراتے ہی رہے، ذی رائے اور با عزت افغان سردار کہا کرتے تھے کہ مغلوں کا ہندوستان سے نکلنا محال ہے اور فرید کے امید افزا خیالات کی ہنسی اُڑاتے تھوڑے ہی عرصہ میں نوجوان افغان نے اپنے قول کو عمل سے بدل کر دکھلا دیا اور ہمایوں کو ہندوستان سے نکال کر چھوڑا۔

اپنی زندگی کے اس بڑے مقصد کو حاصل کرنے کے بعد وہ دل و جان سے اس ابتری کے دور کرنے میں لگ گیا جو لودی سلطنت کی بربادی کے بعد ہندوستان میں ہر سمت نظر آتی تھی۔ وہ صرف ایک بڑا فوجی قائد ہی نہ تھا بلکہ اس کے ذہن میں چند اسکیمیں بھی تھیں جن کے عمل میں لانے کی کوشش وہ اس وقت سے کر رہا تھا جبکہ وہ خواص پور اور ٹانڈہ میں اپنے والد کی جاگیر کے انتظام میں مصروف تھا۔ وہ ایک قابل منتظم کی حیثیت سے مشہور ہو چکا تھا اور حکومت دہلی کے زمانہ میں تو اس کا انتظام اس قدر پسندیدہ رہا کہ اس کا سب سے بڑا دشمن ابوالفضل بھی کوئی عیب نہ نکال سکا۔ بدقسمتی سے اس کے اس شعبۂ زندگی کے متعلق معلومات کا ذخیرہ

موجود ہی کہ کوئی لاعلمی کے پردہ کو ہمارے سامنے سے نہ اُٹھاسکا۔ یہ معلوم ہوتا ہی کہ دربار مغلیہ کے تاریخ نویسوں نے اس کی خوبیوں پر پردہ ڈالنے کی پوری کوشش کی ہی اور ان سب کو بڑی خوشی کے ساتھ اپنے آقاؤں سے منسوب کردیا ہی، پھر بھی یہ ممکن ہی کہ ساری معلومات کو اکٹھا کرنے کے بعد اس کی حکومت کا ایک خاکہ نظروں کے سامنے آسکے۔

بادشاہت | بخلاف اپنے بہت سے ہمعصروں کے شیر شاہ نے کبھی اُن رسوم کی کورانہ تقلید نہ کی جنھیں افغان اپنے کوہستانی وطن سے ان میدانوں میں لائے تھے بلکہ اس نے ہمیشہ عملی صورت اختیار کرنے کی کوشش کی۔ اس نے اپنی تیزی فہم کی بدولت یہ معلوم کرلیا کہ بہلول لودی کی قائم کردہ سلطنت ایک بڑی سرداری سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی اور اس کی بقا کا دار و مدار سرداران قبائل کی خوش عقیدگی پر ہی جن میں سے بعض ۵۰ ہزار سے ۵۰ ہزار سواروں تک کے سردار تھے اور شاہان لودی کی عظمت کو حسد کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ سلاطین لودی کی تاریخ نے یہ ثابت کردیا تھا کہ باوجود ان تمام فوائد کے جو ایک خون ہونے اور اتحاد مقاصد کی بنا پر حاصل ہوسکتے ہیں بہت ممکن تھا کہ ان اُصولوں پر قائم کردہ سلطنت متلون مزاج سرداروں کے تلون طبع کا شکار ہوجائے اور یہ صورت اُس وقت پیش آتی تھی جب مرکزی طاقت اپنی افضلیت محسوس کرانا چاہتی یا بالکل کمزور ہوجاتی۔ اس لیے اس نے سلطنت کی بنیاد زیادہ مستحکم کرنے کا ارادہ کرلیا اور وہ یوں کہ پھر انھیں اُصولوں کی پابندی کی جائے جنھیں ان سے قبل تاتاری بادشاہوں نے فارس سے حاصل کیا تھا۔ بحیثیت ایک عملی انسان ہونے کے وہ اس کام کی دشواریوں سے باخبر تھا مگر اپنے حیرت انگیز استقلال کی بدولت جس سے وہ ہمیشہ کام لیتا رہا اپنے مقاصد کے حاصل کرنے میں کامیاب رہا۔ اپنی فراست، تدبر، خوش بیانی، اور کامیابی کی وجہ سے اس نے بااثر افغان سرداروں کی نظروں میں عزت حاصل کرلی۔ اُنھوں نے خوشی کے ساتھ اُسے بالاتفاق اپنا بادشاہ منتخب کرلیا۔

بخلاف بہلول لودی کے وہ تخت پر بھی بیٹھا اور ان تمام مناصب مراتب کا خیال بھی رکھا

آداب سلطنت جن کے مقتضی تھے، اس نے قادر شاہ حاکم مالوہ کو سزا دینے میں بہت پیش بینی سے کام لیا جس نے اپنی برتری کا اظہار یوں کیا تھا کہ بجواب فرمان جو خط شیر شاہ کو لکھا اس پر اپنی مُہر سرے پر لگا دی تھی۔ شیر شاہ نے ایسا رویہ اختیار کیا کہ سلطنت کے بڑے بڑے امرا بھی اس سے ڈرتے تھے۔ وہ کسی مجرم کو سزا دینے میں پس و پیش نہ کرتا تھا خواہ اس کا رتبہ کتنا ہی بڑا ہو خواص خاں، اپنے سب سے زیادہ معتبر اور وفادار وزیر کو بھی اس کی تقصیروں پر سب کے سامنے بُرا بھلا کہنے سے باز نہ آیا شجاعت خاں ایک دوسرے بڑے امیر کی جاگیریں کم کر دیں اور ایسی تنبیہ کی کہ وہ گھبرا اُٹھا اور سب سے بڑے سردار ہیبت خاں نیازی نے تو اپنے قبیلہ کے بہت سے لوگوں کو قتل کر ڈالنا اُس کے ناراض کرنے سے زیادہ مناسب سمجھا عباس خاں نے بہت سچ کہا ہے کہ :-

"شیر شاہ کا رعب افغانوں کے دلوں پر ہمیشہ چھایا رہتا تھا خواہ وہ حاضر ہو یا غائب اور کوئی اسکی مخالفت میں سانس بھی نہ کھینچ سکتا تھا" یہ وہی افغان تھے جو اپنی سرکشی اور تلون طبع کے لیے سارے جہان میں مشہور تھے۔

لیکن باوجود اس خوف و دہشت کے کوئی اُس سے نفرت نہ کرتا تھا۔ کوئی ایسا صحیح واقعہ نظر نہیں آتا جس سے ثابت ہو کہ کسی امیر نے بھی اس کے احکام کی تعمیل بجبر و اکراہ کی ہو چہ جائیکہ کوئی اس کی مخالفت میں کھڑا ہوتا، امرا اُسے افغانوں کا نجات دہندہ خیال کرتے تھے اور اس لیے اُس کے ہر حکم کی خوشی سے تعمیل کرنے کو تیار رہتے تھے۔ یہاں تک کہ اس کی وفات کے بعد سوا اعظم ہمایوں کے اور کسی نے اُس کے لڑکوں سے غداری کا خیال بھی نہ کیا اور خواص خاں شجاعت خاں کی مثالیں تو مجسم وفاداری ہیں۔ اگر وہ کچھ دنوں اور زندہ رہتا تو بلا شک ایک زمانہ تک کے لیے اُن واقعات کا سدِ باب کر جاتا جنھوں نے نہ صرف لودی سلطنت بلکہ سوری حکومت کو بھی برباد کر دیا۔

احساس فرائض منصبی | شیر شاہ بلا شک و شبہ ایک جفاکش بادشاہ تھا۔ وہ دن رات مصروف رہتا تھا کوئی بات خواہ بڑی ہو یا چھوٹی اس کی تیز نگاہوں سے بچی نہ تھی۔ صبح تین بجے اُٹھتا غسل کرتا

اور نماز پڑھتا پھر مختلف افسروں کی عرضداشتیں سنتا اور اس کے بعد مختلف محکموں کے صدر اپنے معاملات پیش کرتے تھے جن پر فارسی میں احکام صادر کرتا جو باقاعدہ لکھ لیے جاتے تھے۔ اس وقت تک سورج افق پر ظاہر ہو جاتا تھا اور وہ وضو کر کے نماز با جماعت ادا کرتا۔ اس کے بعد وہ امرا اور فوج کے سلام لیتا اور بعضوں سے ملاقات بھی کرتا یہاں تک کہ ایک گھنٹہ گزر جاتا اور نماز کا وقت آجاتا۔ نماز ادا کرنے کے بعد وہ سرداروں اور سپاہیوں کی ضروریات کے متعلق دریافت کرتا اور گھوڑوں کے انتظام کا معائنہ کرتا۔ اب فیصلہ مقدمات کا وقت آتا۔ یہ ایسا کام تھا جس سے شیر شاہ کبھی گھبراتا نہ تھا۔ اس کے بعد خزانوں کا معائنہ کرتا جو باہر سے برابر دارالسلطنت میں آتا رہتا تھا۔ پھر امیروں یا ان کے نائبوں کی رپورٹیں۔ زمینداروں کی عرضیاں اور دوسرے فرمانرواؤں کے پیغام سنتا اور سب کا مناسب جواب دیتا۔ اس طرح دن کا ابتدائی حصہ گزرتا۔ اب وہ اپنے دربار کے علما اور فضلا کے ساتھ کھانا کھانے کے لیے اٹھتا کھانا کھا کر پھر کام شروع کر دیتا اور برابر دو پہر تک کام کرتا رہتا جبکہ تھوڑی دیر آرام کرنے کے لیے اٹھ جاتا۔ قریب دو بجے وہ جماعت کے ساتھ نماز ادا کرتا اور پھر کام میں لگ جاتا۔ اسی طرح وہ تمام دن اور رات کا زیادہ حصہ ان مشغلوں میں گزارتا۔ اس اعتبار سے وہ اورنگ زیب جیسے نفس کش آدمی کا ہم پلہ کہا جاسکتا ہے شیر شاہ کے انتظاموں میں کسی خاص اختراع کا دعویٰ نہیں کیا جاسکتا۔ وہ ایک بڑا موجد نہ تھا لیکن اس نے اپنے زمانہ کے سارے آئین و قوانین نئے سرے سے مرتب کیے۔

عدل اسلامی قوانین میں انصاف پر بہت زور دیا گیا ہے۔ ابن بطوطہ جس نے محمد بن تغلق کے زمانہ میں ہندوستان کا سفر کیا لکھتا ہے کہ بعض اوقات بادشاہ بھی قاضی کی عدالت میں ایک معمولی مجرم کی طرح کھڑا نظر آتا تھا۔ شیر شاہ ان معاملات میں خاص طور پر سخت تھا وہ اپنے ایک فرمان میں انصاف کی تعریف یوں کرتا ہے "صرف ظلم سے باز رہنے کو انصاف نہیں کہتے۔ بلکہ ہر شخص کے ساتھ مناسب سلوک کا نام عدل ہے۔" یہ ماننا پڑے گا کہ آمد و رفت کی دشواریاں

---

۵ نہ معلوم یہ کس وقت کی نماز تھی غالباً فجر کی خرابی کی گئی ہے۔ (احراری)

انصرام اور عمل میں تاخیر کا باعث ہوتی تھیں لیکن یہ کمی بادشاہ اور اُس کے جاسوسوں کے خوف اور ڈاک کے سلسلہ سے بہت کچھ پوری ہو جاتی تھی۔ یہ دشواریاں تار ریل اور ڈاکخانہ کے جاری ہونے سے قبل ہر ملک میں پیش آتی تھیں۔ کوئی شخص بلا لحاظ منصب مرتبہ جرم یا قانون شکنی کی سزا سے بچ نہ سکتا تھا۔ باقاعدہ عدالتیں ہوتی تھیں جو دار العدل کے نام سے مشہور تھیں۔ ان میں قاضی اور میر عدل مقدمات سُننے اور انصاف کرنے کی خاطر اجلاس کیا کرتے تھے۔

شرعی قضیے قرآن اور حدیث کے احکام کے مطابق فیصل کیے جاتے اور مقدمات جو قانون رائجہ کے تحت میں آتے مقامی رواجوں کے مطابق طے ہوتے تھے۔ ہندوؤں کے لیے کوئی علیحدہ انتظام معلوم نہیں ہوتا۔ غالباً یہ لوگ زیادہ تر پنچایتوں کی طرف رجوع کرتے تھے جو اسلامی عہد میں اس قدر ناکارہ نہ ہو چکی تھیں جیسی کہ اب ہیں۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ شاہی عدالت سے محروم رکھے جاتے تھے بلکہ جب چاہتے اس میں مرافعہ کر سکتے تھے ایسے مقدمات کے فیصلہ میں فریقین کی سوسائٹی کے رسم و رواج کا خیال کیا جاتا تھا۔

تعزیری قانون عام اور سخت تھا افغانوں کا قانون قصاص جاری تھا۔ سزائے قید۔ تازیانہ۔ قطع اعضا۔ جرمانہ اور دار عموماً مروج تھیں۔ اس میں شک نہیں کہ سزا دینے کے لیے کچھ معمولی قوانین موجود تھے مگر عبرت دلانا اصل الاصول تھا اور اس لیے بعض اوقات چوری اور رشوت ستانی کی سزا بھی موت ہوتی تھی۔ شیر شاہ نے افسران جیل کو یہ حکم دے رکھا تھا کہ کسی قیدی کو اُس وقت تک سخت سزا نہ دی جائے جب تک کہ پند و نصائح کے سارے طریقے ناکام نہ ثابت ہو لیں۔

شیر شاہ کی سلطنت ۴۷ صوبوں میں منقسم تھی اور ہر صوبہ میں بہت سے پرگنے ہوتے تھے کم و بیش گیارہ ہزار تین سو (۱۱۳۰۰) پرگنے براہ راست بیت المال کے ماتحت تھے۔ ہر پرگنہ میں ایک شق دار، ایک امین، دو محرر (ایک ان میں سے فارسی میں اور دوسرا ہندی میں حساب رکھتا تھا) ایک منصف اور ایک خزانچی ہوتا تھا علاوہ ان عمال سرکاری کے ایک چودھری

اور ایک چودھری بحیثیت نمائندہ رعایا ہوتے تھے اور حکومت انھیں مانتی تھی۔ ان کے اوپر ایک 'افسر شق دار' اور 'افسر منصف' ہوتا تھا جن کی عملداری پورے صوبہ (سرکار) پر ہوتی تھی۔ ان کے علاوہ ہر سرکار کے لیے ایک 'امیر' ہوتا تھا جس کے اختیارات موجودہ زمانہ کے گورنر کے برابر ہوتے تھے۔

یہ متذکرہ بالا عمال اُن علاقوں میں ہوتے تھے جو بیت المال کے تحت میں تھے۔ زمینداروں یا جاگردار امیروں، جاگیرداروں اور متولیان وقف کو عام طور پر اپنی عملداریوں میں انتظام کی اجازت تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ جائداد موقوفہ ایک مجلس کے زیر اختیار ہوتی تھی جو مقامی باشندوں کی بنائی جاتی۔ مزید براں سرکاری عمال کا فرض تھا کہ وہ ان کی نگرانی کرتے رہیں اور رعایا پر ظلم نہ ہونے دیں۔ محرر پرگنہ کا فرض تھا کہ وہ رقبہ آراضی کا جو ہر کاشتکار کے پاس ہو اور مقدار لگان کا جو اسے حق ملکیت و کاشت کے عوض دینی ہو صحیح صحیح اندراج کرے علاوہ اس کے انھیں حکام بالادست کو نقض امن اور بارش وغیرہ کے متعلق معلومات بہم پہونچانی پڑتی تھیں مقامی حکام قیام امن کے بھی ذمہ دار ہوتے اور اگر کوئی جرم ان کے علاقہ میں بلا تفتیش رہ جاتا تو وہ مستوجب معزولی سمجھے جاتے۔

محاصل و مالیات: یہ بیان کیا جاتا ہے کہ شیر شاہ سب سے پہلا مسلمان بادشاہ تھا جس نے آراضی کی صحیح پیمائش کرائی عباس خاں کہتا ہے کہ شیر شاہ کے زمانہ سے پہلے پیمائش کا رواج نہ تھا بلکہ ایک قانون گو ہوتا تھا جس سے پرگنہ کے ماضی حال و مستقبل کے حالات دریافت کیے جاتے تھے۔ یہ یقین نہیں کیا جا سکتا کہ پیمائش آراضی جیسی کار آمد چیز فرمانروایان دہلی کے علم سے باہر رہی ہو جبکہ ایران میں شیر شاہ سے مدتوں پہلے سے اس کا رواج چلا آتا تھا اور انھوں نے ایران کا طرز حکومت اختیار کیا یہ صحیح ہے کہ زمین کی عام پیمائش کا تذکرہ شیر شاہ سے پہلے فارسی تاریخوں میں نہیں آتا لیکن پیمائش کی اصطلاحیں مدتوں پہلے سے ہندوؤں اور مسلمانوں کو معلوم تھیں جس سے پیمائش کا امکان ثابت ہوتا ہے ضیاء برنی میں ایک عبارت

جس سے اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے، حقیقت امر یہ معلوم ہوتی ہے کہ ایسے مقامات کے قانون گو جہاں پیمائش خلاف رواج نہ سمجھی جاتی تھی اپنی ہدایت کے لیے ایسے اندراج کرتے تھے لیکن مرکزی حکومت کی طرف سے عام پیمائش کی کوشش شیر شاہ سے پہلے عمل میں نہیں آئی۔ کچھ بھی ہو یہ تو ظاہر ہے کہ شیر شاہ نے بھی ایسے مقامات پر پیمائش نہیں کرائی جہاں یہ خلاف رواج سمجھی جاتی تھی۔ ہمیں اس کا ایک حکم اعظم ہمایوں کے نام ملتا ہے جس میں اس نے پیمائش کو منع کیا ہے۔ اور پیداوار کا ایک جزلے لینے کا حکم دیا ہے۔

پیمائش آراضی احمد خاں کی نگرانی میں لائق برہمنوں کی مدد سے عمل میں آئی تھی دفتر بیت المال میں ایک جسٹر ہوتا تھا جس میں حقوق مالکانہ اور صحیح رقبۂ آراضی قابل زراعت یا ناقابل زراعت درج ہوتا تھا زمین مختلف قسم کی ہوتی تھی اور ہر ایک کا نرخ علیحدہ مقرر ہوتا تھا۔ زمین ہر فصل کے وقت ناپی جاتی تھی اور اس کے مطابق لگان وصول ہوتا تھا۔ نقد مالگذاری وصول ہونے میں کوئی دقت نہ ہوتی مگر جنس کی وصولی کے متعلق صاف اور صریح ہدایتیں تھیں کہ کس قسم کا غلہ لینا چاہیئے تاکہ عمال کاشتکاروں کو ستا نہ سکیں اگر بارش کی کمی یا کسی غیر معمولی سبب سے فصل خراب ہو جاتی تو کاشتکاروں کو حکومت کی استعداد کے مطابق تقاویاں بھی دی جاتیں۔

اگر کاشتکاروں کو مالگذاری کے علاوہ اور کچھ نہ دینا پڑتا تو غالباً ان کی حالت اچھی رہتی مگر اس زمانے میں بہت سے چھوٹے چھوٹے محصول حکومت اور عمال کی طرف سے لگائے جاتے تھے اور رسم و رواج کی بنا پر مخصوص ہو گئے تھے۔ ابوالفضل نے "آئینہ اکبری" میں ان کی ایک طویل فہرست دی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ شیر شاہ کی وفات کے بعد بھی قائم رہے ان میں سے خاص خاص یہ تھے۔ مویشیوں کا محصول۔ مختلف عمال کے حقوق۔ ٹھیکہ لینے کا نذرانہ۔ درختوں اور تیل پر محصول۔ فصل کاٹنے۔ مویشی بیچنے اور مچھلی مارنے کی اجازت کے محصول وغیرہم یہ ظاہر ہے کہ ان سے کاشتکاروں کو بہت دقت اور تکلیف ہوئی ہوگی۔

محاصل کی وصولی کے بارہ میں شیر شاہ بہت سخت تھا وہ کہا کرتا تھا کہ ایک بادشاہ

کے لیے بہتر ہی کہ پیمائش کے وقت کاشتکاروں کے ساتھ رعایت برتے لیکن جب ادائگی کا وقت آئے تو کسی قسم کی رعایت نہ کرنی چاہیے۔ اور بہت سختی کے ساتھ لگان وصول کر لینی چاہیئے۔ اس اُصول کی پابندی حکومت اور کاشتکاروں کے مفاد کے لیے بہت ضروری تھی۔

آمدنی | مالیات کا مسئلہ شرع محمّدی میں کچھ پیچیدہ ہی اگرچہ وہ اصول جن پر یہ مبنی ہی بہت سادہ اور آسان ہیں۔ شریعت کی روسے آمدنی کی دو بڑی مدیں قائم کی جاسکتی ہیں۔ دنیاوی اور دینی موخر الذکر میں زکوٰۃ داخل ہی جو مویشیوں کے گلے۔ سونے چاندی۔ تجارتی مال۔ پیداوار زمین پر عاید ہوتی تھی اور اول الذکر میں وہ محاصل شامل ہیں جو غیر مسلموں پر لگائے جاتے تھے مثلاً خراج۔ جزیہ۔ غیر مسلم تاجروں پر محصول۔ مال غنیمت اور کانوں پر محصول زمینوں اور لاوارث شخصوں کی جائداد پر محصول۔ ان ذرائع آمدنی کے علاوہ حکومت اور حاکم کی ضروریات اور نئے شرعی محصولوں کے اضافہ پر مجبور کرتی تھیں۔ یہ زمانہ گزرنے پر رواج میں داخل ہوجاتے تھے۔ اگرچہ ان اصولوں کی کماحقہٗ پابندی نہ ہوتی تھی اور اسلام کی بتائی ہوئی تفصیل محاصل پر کم عمل ہوتا تھا۔ تاہم مسلمانوں کے عہد میں یہ بنیادی اُصول تھے برنی عفیف اور ابوالفضل کی تصانیف پر نگاہ ڈالنے سے یہ حقیقت روشن ہوجائے گی۔

اخراجات | بیت المال حقیقت میں رعایا کی ملک تھا اور بادشاہ کی ذاتی جائداد سے باہر خیال کیا جاتا تھا۔ قانون اسلامی کی روسے آمدنی کا ⅕ امیر کا حصہ ہوتا تھا اور ⅘ مومنین کا لیکن آسانی کے لحاظ سے ہم اخراجات کی بھی دو مدیں قائم کر لیتے ہیں۔ دینی اور دنیوی۔ اول الذکر میں اخراجات متعلق نفع عامہ شامل ہیں مثلاً علما کے وظیفے لنگر خانے۔ سرائیں۔ غربا مساکین یتیم بڈھوں اور بیواؤں کی امداد اور موخر الذکر میں حکومت کے اخراجات فوجی اور دیوانی اسی میں حاکم کے اخراجات خانہ داری بھی شامل ہیں جو ان کی مرضی پر منحصر تھے فیروز شاہ اگر نفس کش نہ تھا تو مسرف بھی نہ تھا اور عموماً اس کی ضروریات بہت سادہ ہوتی تھیں سپاہیوں

اور افسروں کی تنخواہ یا فوج کی آمادگی کے معاملہ میں وہ بہت سخت تھا اس کو ایک بڑی فوج رکھنی پڑتی تھی۔ وجہ ظاہر ہے۔ یہ فوج اکبر کی فوج سے بھی بڑی تھی چنانچہ فوجی مصارف بہت زیادہ تھے۔ محکمۂ تعمیرات عامہ میں بھی خرچ بہت زیادہ ہوتا تھا اس لیے کہ یہ اس کے سارے عہد حکومت میں کام کرتا تھا۔

خیرات واوقاف خیرات کے کاموں پر بھی کافی خرچ ہوتا تھا۔ اس محکمہ کا صدر قاضی ہوتا تھا لیکن اکبر کی طرح شیر شاہ بھی عطیات کے مسئلہ میں بہت دلچسپی لیتا تھا۔ بہت سی سیاسی اور اخلاقی مصلحتوں کی بنا پر وہ متقی اور متشرع آدمیوں کو اور خیراتی مدارس کو اس فراخدلی سے وظیفے دیتا کہ آخر زمانہ کے تاریخ نویسوں نے بہت سخت الفاظ میں اس کے خلاف لکھا ہے۔ لیکن وہ نہ تو لاپرواہ تھا اور نہ از حد مخیر۔ اس نے ان تمام عطیات کو منسوخ کر دیا جو اس کے قبل غیر افغانی ہاتھوں سے دی گئی تھیں لیکن اس نے لوگوں کو مفلس نہ بنا دیا۔ اس حکم کی وجہ یہ تھی کہ وہ عالم اور پابند مذہب طبقہ کو اپنی یعنی افغانوں کی طرف کر لینا چاہتا تھا۔ اور وہ ان عطیات کو پھر معقول اور مناسب طریقہ پر تقسیم کرنا چاہتا تھا۔ اس کا اصول تھا کہ کوئی مستحق شخص محروم نہ رہ جائے لیکن ساتھ ہی ساتھ کوئی شخص اپنی ضروریات سے زیادہ نہ پا جائے۔

شیر شاہ نے اس معاملہ میں بہت زیادہ نرمی اور سہولت سے کام لیا اس لیے وہ ان تمام الزامات سے بچ گیا جو علاء الدین خلجی اور خصوصاً اکبر پر عائد کیے جاتے ہیں۔ ایک پرگنہ کے سارے جاگیردار ایک ساتھ دربار میں بلائے جاتے تھے ان کے ساتھ بہت نرمی کا برتاؤ کیا جاتا اور واپس کرتے وقت انھیں زادِ راہ بھی دیدیا جاتا تھا سب سے زیادہ اس کا خیال رکھا جاتا تھا کہ کاتب لوگوں کو پریشان نہ کریں اور دھوکہ نہ دے سکیں لہذا شیر شاہ ہر کاغذ کو خود دیکھ لیتا اور اسے متعلقہ پرگنہ میں اپنے معتمد ملازموں کے ذریعہ سے بھیجتا تھا۔

مسجدوں اور مدرسوں کے انتظام کرنے کے علاوہ وہ حقدار طلبا اور معلموں کو وظائف بھی دیتا۔ ایک دفعہ اس نے ایک طالب کو ۱۵۰۰ روپیہ اور ۱۵۰۰ بیگہ زمین عطا کی۔ بیمار۔ ضعیف غربا۔ بیوگان اور اندھوں کے واسطے کافی انتظام تھا۔ غریب خلق نے جہاں قیام اور طعام مفت

تھا اکثر مقامات پر کھولے جاتے تھے سفر میں اس کے ہمراہ ایک لنگر خانہ ہوتا تھا جس میں محتاجوں کو ہر وقت کھانا ملتا خواہ وہ سپاہی ہوں یا کاشتکار یا فقیر۔ اس کے لنگر خانہ کا خرچ اس زمانہ میں ایک لاکھ اٹھارہ ہزار اشرفی تھا جبکہ چیزیں آج کل سے کئی گنی ارزاں ملتی تھیں۔

موجودہ ذرائع سفر کے ایجاد ہونے سے قبل سفر کرنا ایک زحمت تھی اور اس وجہ سے مسافر کے ساتھ ہر جگہ ہمدردی کا برتاؤ کیا جاتا تھا۔ مسلمان اور ہندو دونوں مسافر نوازی کو ایک خلاقی فرض سمجھتے تھے۔ شیر شاہ بھی اور بڑے بڑے بادشاہوں کی طرح مسافروں کے آرام و آسائش کا خیال رکھنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ چنانچہ اس نے سڑکوں کو اچھی حالت میں اور خطروں سے محفوظ رکھنے کی بہت زیادہ کوشش کی کچھ نئی سڑکیں بنوائیں اور پرانی سڑکوں کی مرمت کرائی۔ شاہراہوں میں سے ایک گور (بنگال) سے اودھ تک دوسری بنارس سے مانڈو اور سرحد دکن تک تیسری آگرہ سے بیانا تک ہوتی ہوئی سرحد جودھپور تک اور چوتھی بیانا سے جونپور تک جاتی تھی۔ اس نے آگرہ اور دہلی کے درمیان جنگل کاٹ کر ایک سڑک نکالی جس سے مسافت بہت کم ہوگئی ورنہ مسافروں کو دوآب سے گزر کر جانا پڑتا تھا اور اس میں چکر بہت تھا۔

سڑکیں آج کل کی سڑکوں کی طرح لمبی اور سنسان نہیں ہوتی تھیں۔ ہر بڑی سڑک پر اور خصوصاً شاہ راہ عظمیٰ پر جو سونارگاوں سے انڈس تک جاتی تھی اور اس سڑک پر جو آگرہ سے برہان پور کے قریب تک جاتی ہے ہر ہر کوس پر ایک سرائے۔ ایک پختہ کنواں ایک باغ اور ایک مسجد ہوتی تھی۔ اور اوقاف کی مدد سے جو اسی غرض کے لیے مخصوص تھے یہ ایران کی مرمت ہوتی رہتی تھی۔ ان سراؤں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے قیام کا علٰحدہ علٰحدہ انتظام تھا ہندو اور مسلمان ملازم مسافروں کے واسطے سرد اور گرم پانی پختہ یا خام جنس اور دیگر ضروریات کے مہیا کرنے کے لیے رکھے جاتے تھے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ ان سڑکوں پر مسافر نہایت اطمینان سے اپنا اسباب کسی درخت کے نیچے رکھ کر اپنے گھوڑے یا مویشی چرانے جا سکتا ہے اور ایک بڈھی عورت بھی بلا خوف و خطر زر و جواہر ساتھ لے کر تنہا سفر کر سکتی ہے مسافروں کو سب سے زیادہ آرام ان قزداد دزخوب

سے بچتا تھا جو دو رویہ سڑکوں کے کنارے لگے ہوئے ہوتے تھے۔ یہ صرف تمازت آفتاب سے بچانے کے لیئے ہی نہ تھے بلکہ مسافر اکثر ان کے پھلوں سے بھی فائدہ اُٹھا سکتا تھا۔ آم۔ جامن بیر اور کھرنی کے درخت سڑک کے دونوں جانب لگائے جاتے تھے اور مسافر بغیر کسی قسم کی مزاحمت کے مفت انھیں توڑ توڑ کر اپنی استعمال ور کرتے تھے۔ یہ تحقیق نہ ہو سکا کہ یہ سڑکیں پختہ تھیں یا خام غالباً خام ہی ہونگی۔

پولیس | مسلمانوں کے عہد میں ہندوستان میں بڑے بڑے پولیس کے محکمے نہ تھے تاہم مشہور مقامات اور سراؤں میں کوتوال اور شحنے سپاہیوں کے دستوں کے ساتھ موجود رہتے تھے شیر شاہ نے چوری ڈاکہ قتل یا اور جرائم کے انسداد کے لیے مقامی ذمہ داری کے اُصول سے کام لیا تھا اگر کوئی ایسا واقعہ پیش آتا تو "مقدم" اس کی تفتیش کے ذمہ دار سمجھے جاتے تھے اور اگر وہ تفتیش میں ناکام رہتے تو انھیں تاوان ادا کرنا پڑتا تھا اور شق دار تو برخاست ہی کر دیئے جاتے تھے۔ اس طرح عمال سرکاری اور غیر سرکاری دونوں جرائم کی تفتیش اور انسداد کی کوشش میں رہتے تھے۔ سارے مورخ اس طریقہ عمل کی تعریف میں یکزباں ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ طریقہ بہت زیادہ قابل اطمینان تھا معمولی پولیس کے علاوہ محتسب بھی ہوا کرتے تھے جو عوام کے اخلاقی محافظ ہوتے اور شراب خواری یا دوسرے اخلاقی جرائم کے انسداد کی فکریں کرتے اور دیکھتے تھے کہ مذہبی احکام کی کہاں تک پابندی ہوتی ہے۔

فوج | افغانی سلطنت کی دوبارہ تنظیم اور غیر ملکی حملوں سے محفوظ رکھنے کے لیئے ایک بڑی اور مرتب فوج کی ضرورت ہوئی چنانچہ مقامی ضرورتوں کے لحاظ سے فوج کے دستے سارے ملک میں پھیلا دیئے گئے۔ ملتان۔ رہتاس (غربی) سرہند۔ دیپال پور۔ دہلی۔ ہنڈکانٹ بیانا۔ گوالیار۔ چنار۔ رہتاس (شرقی) پٹنہ۔ گور۔ رنتھنبور۔ چتوڑ۔ رائسین۔ اور مانڈو میں فوجی چھاؤنیاں قائم کی گئیں۔ سب سے زیادہ فوج دہلی اور رہتاس (غربی) میں رہتی تھی شیر شاہ ڈیڑھ لاکھ سوار اور پچاس ہزار پیادے اپنے ہمراہ رکھتا تھا

فوج کے چار حصے تھے۔ فیل۔ سوار۔ پیدل اور توپخانہ سوار ہی فوج کی ساری طاقت تھے۔ توپخانہ اس وقت تک بہت اچھی حالت میں نہ تھا۔ ہندوستان میں ہمیشہ جنگی ہاتھیوں سے کام لیا گیا اور ایک ہاتھی پانچ سو آدمیوں کے برابر سمجھا جاتا تھا۔ شیر شاہ کا ہاتھیوں کا دستہ اکبر کے دستے سے چھوٹا نہ تھا۔ اس میں کم و بیش پانچ ہزار ہاتھی ہوتے تھے۔

فوج کی تنظیم عموماً قبیلہ وار ہوتی تھی۔ قبیلہ کا سردار اس کا فوجی قائد بھی ہوتا تھا اور اس کی طاقت یا فضیلت کا انحصار اس کے پیرؤں کی تعداد پر تھا۔ قبیلہ سور کی عظمت سب سے زیادہ تھی اگرچہ وہ سب سے بڑا قبیلہ نہ تھا۔ دوسرے نمبر پر نیازی تھے جن کا سردار ہیبت خاں اعظم ہمایوں تھا۔ اس کی کمان میں تیس ہزار سوار تھے ان کے بعد شروانی اور جلوانی قبائل کو اہمیت دی جاتی تھی جن کے سردار علی الترتیب عیسیٰ خاں اور جلال خاں تھے۔ ان کے علاوہ ہر سرکار میں ایک فوجدار ہوتا تھا جو اپنی عملداری میں فوج کے انتظام کے لیے مقرر ہوتا تھا اور بوقت ضرورت حکومت کو بغاوت فرو کرنے میں مدد بھی دیتا تھا۔

شیر شاہ خوب سمجھتا تھا کہ فوج کو خوش اور منتظم رکھنے میں کیا فائدے ہیں۔ افغان سپاہیوں کی جو کثیر تعداد میں اس کی فوج میں برابر داخل ہوتے رہتے۔ بہت خاطر مدارات کی جاتی تھی۔ غریب سپاہیوں کو اسلحہ اور گھوڑا بھی دیا جاتا تھا لیکن عام طور پر یہ امید کی جاتی تھی کہ سپاہی خود اپنا انتظام کریں گے۔ سپاہی جب چاہتے شیر شاہ تک پہونچ سکتے تھے۔ وہ ان سے بہت شوق سے ملتا اور ان کی عرضداشتیں سنتا۔ اکثر جب سپاہیوں کو تنخواہ تقسیم کی جاتی تو وہ بنفس نفیس موجود ہوتا اور اگر انھیں کوئی شکایت ہوتی تو اُسے دور کرتا۔ باوجود ان باتوں کے وہ ڈسپلن قائم رکھنے میں بہت سخت تھا اور قواعد کی خلاف ورزی پر سخت سزائیں دیتا بعض اوقات تو پھانسی کا حکم دینے سے بھی نہ چوکتا۔ جب فوج گاؤں سے ہوکر گزرتی تو سپاہیوں کو سخت تاکید کر دی جاتی تھی کہ رعایا کی جائداد کو ہاتھ نہ لگائیں اگر کاشتکاروں کا کچھ نقصان ہو جاتا تو انھیں کافی معاوضہ دیا جاتا تھا۔ کارگر توپوں کے استعمال سے قبل جنگ

میں قلعوں کی اہمیت بہت زیادہ تھی۔ ہر جنگی مرکز پر ایک قلعہ موجود تھا اور اگر کہیں نہ تھا تو وہاں شیر شاہ نے خود تعمیر کرا لیا۔ سب سے زیادہ اہم قلعے جو اس نے بنوائے پٹنہ اور رہتاس (مغربی) کے تھے۔

شیر شاہ ایک لائق مدبر تھا۔ لوگوں کے دلوں میں اس کا خوف تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کی عزت بھی کرتے تھے۔ شورش پسند افغان، قنوج اور روہیلکھنڈ کے رہنے والے، وسط اور مغربی پنجاب کے باشندے، جو اپنے تلون طبع کے لیے بہت کچھ مشہور تھے۔ مجبور کیے گئے کہ امن پسند شہریوں کی طرح زندگی بسر کریں۔ سڑکوں کی حفاظت تاجروں اور مسافروں کے ساتھ اچھا برتاؤ تجارت کی ترقی کا باعث ہوئے۔ تاجروں کو صرف دو محصول ادا کرنے پڑتے تھے ایک تو سلطنت میں داخل ہوتے وقت اور دوسرا بیچنے کی جگہ پر۔ حکومت کے اہلکاروں کو سخت تاکید تھی کہ وہ مقررہ نرخ سے کم قیمت پر کوئی چیز نہ لیں۔ اگر کوئی تاجر مر جاتا تو اس کے مال اسباب کی حکومت کی طرف سے نگرانی ہوتی تھی اور جب کوئی جائز وارث مل جاتا تو اس کے حوالہ کر دیا جاتا تھا۔ عام خریداروں کے مفاد کی بھی کافی نگہداشت کی جاتی تھی۔ دکانداروں اور تاجروں کو ہدایت تھی کہ اوزان برابر رکھیں؛ ایک قسم کی چیز کی ایک ہی قیمت لیں اور اس جدول کے مطابق فروخت کریں جو حکومت کی طرف سے وقتاً فوقتاً شائع ہوتا رہتا تھا۔ بازار کے شحنوں کا یہ فرض تھا کہ وہ ان قانونوں پر عمل کرائیں۔

شیر شاہ صرف حکم صادر کرنے پر ہی اکتفا نہ کرتا تھا بلکہ اس کے نفاذ کے متعلق پوری معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ اسے جاسوسوں اور ڈاک چوکیوں سے بہت مدد ملتی تھی۔ وہ خفیہ طور پر خود بھی لوگوں سے اہلکاروں اور زمینداروں کے متعلق دریافت کیا کرتا تھا اور دوسرے معاملات کی بھی خبر لیا کرتا تھا اس سے ہر شخص مل سکتا تھا وہ سب کی شکایتوں کو نہایت اطمینان سے سنتا اور انھیں دور کرنے کی کوشش کرتا۔

شیر شاہ خود تو سُنی مسلمان تھا لیکن دوسرے مذہب اور عقیدہ والوں سے خواہ مخواہ

تعرض نہ کرتا۔ یہ صحیح ہے کہ کسی شخص کو اس کی اجازت نہ تھی کہ اسلام کے خلاف تبلیغ کرے لیکن ہر شخص اپنے مذہب کی پوری پابندی کر سکتا تھا اور کوئی مارج نہ ہوتا۔ صرف یہ ہی نہیں بلکہ ہندوؤں کو ان کے مدارس کے لیے اوقاف بھی عطا ہوتے تھے اور اس کا انتظام بالکل ان کے ہی ہاتھوں میں چھوڑ دیا جاتا تھا تاکہ وہ اپنے مفاد کے مطابق جو چاہیں کریں۔

وہ خود چست و چالاک اور جفاکش تھا اور اس نے حکومت میں زندگی کی ایسی روح پھونک دی کہ سارا ملک امن اور چین سے بسر کرنے لگا۔ اس کی تعریف میں وہ مورخ بھی رطب اللسان ہیں جو اسی زمانہ میں رہتے تھے جبکہ افغانوں سے اظہار ہمدردی جرم سمجھا جاتا تھا۔ اگر وہ کچھ دن اور زندہ رہتا تو تاریخ کے صفحات پر اس کا نام اکبر سے زیادہ روشن نظر آتا تاہم اس قلیل عرصہ میں اس نے وہ کارہائے نمایاں کیئے کہ لوگوں کے دلوں میں ایک مدت تک اسکی یاد تازہ رہی۔

(ترجمہ)

عبدالعلیم احراری

ترکی کا مستقبل

مشیر حسین صاحب قدوائی

میرا ایک پرانا شعر ہے

اوراقِ روزگار پہ ہم نے لکھا ہے نام　　　اب آسماں سے بھی وہ مٹایا نہ جائیگا

ہم سے یہاں مراد مسلماں ہیں ۔ ترکوں کو اللہ سلامت رکھے ۔ اُنھوں نے اس شعر کو محض تخیل کی حد سے نکال کر واقعیت کا جامہ پہنا دیا ۔ کیا کیا کوششیں گردشِ روزگار نے ترکوں کے جو عرصہ دراز سے اسلام کے علمبردار ہیں مٹانے کی نہ کیں ۔ مگر اللہ رے ہمت ۔ اللہ رے اسلامی جوش کہ وہ متفقہ اور متحدہ قوتیں جنھوں نے سلطنت آسٹریا و سلطنت جرمنی کی سی قدیم ۔ مضبوط اور دولتمند سلطنتوں کو اپنے احکام نادرشاہی کا مطیع بنا کر چھوڑا ترکوں کے آگے لوزان میں صلح کے وہ شرائط ماننے پر مجبور ہوئیں جو ترکوں نے خود سے پسند کیے ۔ اور جن کو وہ اپنی شکست کھانے پر ایک قومی عہد میں اپنے لیے خود تجویز کر چکے تھے ۔ جرمنی غریب کو شاں ہے کہ کسی طرح فاتحین کا دباؤ کم ہو ۔ صلحنامہ ورسلز میں کچھ بھی رعایت ہو مگر اور سختی بڑھتی جاتی ہے ۔ دشمن بچے ہوئے حصہ ملک پر بھی قبضہ بڑھا رہے ہیں لیکن الحمد اللہ، کہ ترکوں نے عہدنامہ سیورے کی کبھی تصدیق نہ کی اور اب چینی ہی کی طرح اس کو پاش پاش کر کے چھوڑا ۔

ترکی کا مستقبل ۱۹۱۸ء میں کس قدر تاریک ہو گیا تھا اُس کا ذکر بھی دل کو ناگوار ہوتا ہے ۔ کون مسلمان ایسا ہوگا جو اُس وقت سراسیمہ نہ ہو گیا ہو ۔ لیکن مقدر نے اُس سے بھی زیادہ تاریک مستقبل قریب لکھا تھا ۔ تین سال تک روز بروز حالت بدتر ہوتی جاتی تھی

۱۹۱۹ء میں جب کہ فاتح طاقتوں کے نمایندے بلگیریا ۔ آسٹریا ہنگری ۔ اور جرمنی کی زبردست سلطنتوں کو اپنی مرضی کے موافق حکم سنا چکے ۔ تو وہ غریب بے سر و ساماں ترکوں کی طرف بھی مخاطب ہوئے ۔ ترکوں کی اُس وقت حالت عجیب تھی ۔ اُن کے

دارالسلطنت و مسلمانانِ عالم کے دارالخلافت میں سب زبردست طاقتوں کے جنگی جہاز لنگرانداز
تھے۔ سلطان کے محل کے گرد غیر سپاہ کا پہرا تھا۔ خود جامع صوفیہ کو غیر سپاہ گھیرے ہوئے تھی
کہ یونانی اس کو پھر گرجا نہ بنا دیں۔ یا ترک حالت یاس میں اُسے ڈائنامائٹ ( )
سے اُڑا دینا گرجا بننے سے بہتر نہ سمجھ بیٹھیں۔ ترکوں کی تمام فوجی قوت اُس وقت ٹوٹ چکی تھی
سامان حرب و ضرب سب غنیم کے قبضہ میں آ گیا تھا۔ دوران جنگ میں ترکوں نے قسطنطنیہ خاص کو
اس قدر مضبوط سمجھا تھا کہ سب کارخانہ بندوق و توپ و کارتوس وغیرہ کے بنانے کے انہوں نے وہیں
رکھے تھے۔ قسطنطنیہ جب قبضہ دشمناں میں آیا تو سب کارخانہ بھی انہی کے قبضہ میں آ گئے۔
جو لڑائی کا متفرق سامان اسمرنا یا اناطولیہ وغیرہ میں بچ رہا تھا وہ بھی ترکوں کے یا تو ہاتھوں سے
نکل گیا۔ یا بیکار کر دیا گیا۔ ترکوں کی فوجی تنظیم میں درہم برہم ہو گئی۔ اور ان کے بڑے بڑے
فوجی ماہر و سپہ سالار یا تو جلاوطن ہو گئے۔ یا دشمنوں کے ہاتھوں قید۔ اُدھر ترکوں کی یہ
حالت زار تھی۔ اِدھر فاتحین کی رعونت کی انتہا نہیں تھی۔ اور اُن کا جذبۂ انتقام (انگلستان
نے سب سے زبردست بری اور بحری شکستیں ترکوں ہی کے ہاتھوں سے کھائی تھیں)
پورے جوش پر تھا۔ وہ سمجھے تھے کہ ترکی اُس وقت اُن کے قدموں کے نیچے ہے۔ جو وہ حکم دینگے
اُسے قبول کرنے پر مجبور ہو گا۔ چنانچہ ترکی کے متعلق جو یکطرفہ کمیشن یونان کے کہنے سے
مقرر کیا گیا تھا اُس نے یہ فیصلہ قطعی سنا دیا کہ ٹرکش امپائر مسٹ سیز ٹو اگزسٹ
( ) ریوٹر ( ) نے یہ نادری حکم تمام دنیا کو
پہونچا دیا۔ یہ سُن کر غریب ترکوں نے پیرس ( ) ایک کمیشن بھیجا۔ کہ وہ اس نادری
حکم کے ہرگز مستحق نہیں ہیں۔ لیکن اس کو بھی ۱۷ رجون ۱۹۱۹ء کو کاؤنسل آف ٹن
( ) نے یہ رعونت مآب جواب دیا کہ ترکی قوم سے زیادہ ظالم اور سفاک کوئی قوم
دنیا کے پردے پر نہیں رہی ہے۔ ترکوں میں حکومت کرنے کی مطلق قابلیت ہی نہیں۔ اس لئے
وہ بلا فوج و قوت مدافعت اناطولیہ کے ایک مختصر سے رقبہ میں جو زیادہ تر بنجر ہے محدود

کرڈنے جائیں گے۔ اُن کے چاروں طرف اُن کے پشتینی اور جانی دشمن صاحب حکومتُ اختیار ہونگے
جن کے پاس فوج بھی ہوگی۔ اور سب سامان حملہ آوری و جنگ۔ اور اُن دشمنوں کی پشت پناہی
پر یورپ کی متفقہ قوت رہے گی۔ یہ مایوسی بخش جواب سُن کر ترکوں کا کمیشن واپس گیا۔ اور
دشمنوں نے اُسی مقصد کو زیر نظر رکھ کر ایک صلحنامہ (بلکہ عتاب نامہ) مرتب کیا۔ جس پر کوئی حیادار
ترک دستخط کرنے پر رضی نہ ہوتا تھا حتی کہ فرید پاشا بھی پیرس (Paris) سے بلا دستخط
کئے واپس گئے تھے۔ لیکن سلطان معزول وحید الدین نے ایک خبطی شخص (جو فیلسوف
مشہور بھی تھے) کو بھیجا۔ اور دشمنوں کے مرتب کردہ صلحنامہ پر پیرس کے ایک مشہور چینی
برتن بنانے کے کارخانہ میں دستخط ہوگئے۔ وہ فیلسوف صاحب قسطنطنیہ واپس جانے کی
بھی جرأت نہ کر سکے۔ بلکہ انگلستان تشریف لائے۔ میں نے پیرس کے اسٹیشن پر دور سے
اُن کی صورت دیکھی تھی۔ اس صلحنامہ سیورے (Sevres) رو سے سلطنت عثمانی عملاً فنا کر دی
گئی تھی۔ اور اگر اُس کی ہستی اگر کچھ باقی رہتی تھی تو اُس سے بدتر اور کمزور تر جو ہندوستان
کی کسی چھوٹی سی ریاست کی ہے۔ ترکوں پر اس سے جو یاس طاری ہوئی اُس کا اظہار مشکل ہے۔
عارضی صلحنامہ کے بعد سے چونکہ ترکوں سے دنیا سے بالکل قطع تعلق ہو گیا تھا۔ خصم نے سخت ترین
سینسر (Censor) خود قسطنطنیہ میں مقرر کر دیا تھا۔ خود اپنے ڈاکخانہ وغیرہ بھی کھول دیئے
تھے۔ اس طرح ترکوں کو باہر کا اگر کچھ حال معلوم ہوتا تھا تو یہ کہ ہر طرف سے اُنھیں پر ملامت پڑ رہی
ہے۔ اور ربع مسکون میں کوئی اُن کا ہمدرد نہیں۔ کاؤنسل آف ٹن Council of Ten نے نہایت
فریب و دلیری سے یہ تک اپنے جواب میں لکھ دیا تھا کہ "اگر یہ کہا جائے کہ ایک تاریخی اسلامی سلطنت
کے رقبہ کی کمی سے ہر جگہ مسلمانوں کے مقاصد کو نقصان پہونچیگا تو ہم یہ عرض کریں گے کہ یہ
ایک غلط خیال ہے۔ کیونکہ کل دنیا کے سمجھدار مسلمانوں کے لیے قسطنطنیہ کے حکمرانوں کی تاریخ
حال نہ کچھ باعث مسرت ہے نہ قابل افتخار۔" اس کے علاوہ دوران جنگ میں ترک خود دیکھ
چکے تھے کہ باہر کے مسلمان آ آ کر اُن سے جنگ [illegible] دشمنوں سے

ترکوں پر یہ حال بخوبی روشن کیا گیا کہ اُن کے باہر کے مسلمان بھائی اُن سے پوری ہمدردی رکھتے ہیں اور میں نے ترکی مسئلہ پر دوسری کتاب جو ۱۵ اگست ۱۹۱۹ء کو انجمن خدام ملکعبہ کی طرف سے لندن سے مجلس عشرہ کے ۱۷ جون کے جواب میں دی سورڈ اگینسٹ اسلام آر اے ڈیفنس آف اسلامس اسٹینڈرڈ بیررس (The Sword Against Islam or A Defence of Islam's Standard Bearers) کے نام سے شائع کی اور اپنے ایک ترک دوست کے ذریعہ سے اُسے قسطنطنیہ بھجوا دیا (میں نے اس کتاب کو ہندوستان میں شائع نہیں کیا۔ بلکہ دیباچہ میں خود لکھ بھی دیا کہ یہ کتاب صرف یورپ کے لئے ہے جس نے اسلام کے خلاف تلوار اٹھا رکھی ہے) تو وہاں فوراً ہی اُس کا ترکی زبان میں ترجمہ کرکے پچاس ہزار جلدیں ایک دم سے تشہیر کردی گئیں۔ (تشہیر کرنے والے کو انگریز اسی جرم میں مالٹا پکڑ لائے تھے) ایک نئی روح ترکی قوم میں برق کی طرح دوڑ گئی، جس سے نیشنلسٹ ( ) حرکت پیدا ہوئی۔ یہ میرے دوستوں میں سے ایک نہایت قابل اعتبار شخص نے جو اُس زمانہ میں قسطنطنیہ میں موجود تھا پیرس میں بعد کو اطلاع دی تھی) چونکہ اس سے پتہ چلے گا کہ ایک لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللهِ پر اعتقاد رکھنے والا مسلمان تاریک سے تاریک حالت میں بھی آفتاب امید کی کرنوں کو دیکھ سکتا ہے۔ اور حالت جذب میں دنیا کو اُن کے نمودار ہونے کی اطلاع دے سکتا ہے۔ میں اُس ۱۵ اگست ۱۹۱۹ء کے لکھے ہوئے رسالے کا (جب ترکی مستقبل تاریک ترین ہو رہا تھا) اختتام ترجمہ کرکے درج ذیل کرتا ہوں۔

اختتام | کاؤنسل آف ٹن Council of Ten (مجلس عشرہ) نے ترکی کی قسمت کا فیصلہ اُس سے زیادہ دردناک کرنے کی دھمکی دی ہے جو روم نے کارتھج کا کیا تھا۔

اوراق تاریخ عالم پر ایسے بہت سے موقع نقش ہیں جب کہ پُرنخوت ہستیاں تخت جبروت اقتدار پر متمکن ہو کر اور تعصب ہوس کے جذبے سے اغوا پا کر اپنے سامنے سے شکست خوردہ اور مصیبت زدہ لوگوں کو دور باش کہہ کر ہٹا دیتے ہیں۔ اُس وقت وہ اپنی رعونت میں نہ تو اُس غائبانہ دست انصاف کی پروا کرتے ہیں جو گردنوں کو تھام لیا کرتا ہے اور نہ اُس صدائے انتقام

کی کڑک کو کان دیتی ہیں جو مغرورین کو ورطۂ تباہی سے متنبہ کرتا ہی۔ جوش غضب میں آکر اور خود
اپنے سرغناؤں کے وعدوں کو فراموش کرکے مجلس عشرہ نے ایسے احکام جاری کیے ہیں
جن سے قوم عثمانی شدید اذیتیں اُٹھاکر فنا کردی جاویگی۔ مجلس عشرہ کے ارکین یہ بات
بالکل بھول بیٹھے کہ صاحب ہمت اور الوالعزم بہت اقوام حیات جاودانی اپنے قبضہ میں رکھتی ہیں شکستہ خاطر
وغم چشیدہ خون افشاں وزخم خوردہ ہونے کے باوجود اور عارضی طور پر مغلوب ہوجانے کے
باوصف وہ مکرر دست رد میدان بنتی ہیں اور خم ٹھوک کر کھڑی ہوجاتی ہیں کہ ظلم وستم توڑنے
والوں یا اُن کی اولاد در اولاد سے وہ اپنا جدّی ملک مال واپس لیں۔ وہ قوم جو فتح اور
کامیابی کے موقع پر دور اندیشی اور رحم سے کام نہیں لیتی بہت جلد وہ دن بھی دیکھتی ہی کہ خود
اُس کو دوسروں سے ترحم و مکرمت کی التجا کرنی پڑے فنا کا دست دراز فاتحاں وجوانمردان
گیلی پولی (   ) وقط کے جسموں تک پہونچ سکتا ہی۔ لیکن دشمنوں کی یہ امید رکھنا
عبث ہی کہ اُن کی کل قومی ہستی نیست ونابود کردی جاسکے گی۔

اسلام ترک جوانمردوں پر برابر ناز کرتا رہے گا کیونکہ وہ اُس کے صدیوں تک علم بردار رہے
ہیں اور ہمیشہ اُس کے نشان کو فلک رفعت بنائے رکھا ہی۔ اگر اب حوادثات زمانہ سے مجبور
ہوکر ترک اُس نشان مقدس کو اُسی بلندی پر نہ اُڑا سکیں جس پر اب تک اُنھوں نے اُسے
لاتعداد دشمنوں کے نرغہ میں بھی قائم رکھا تھا تو بھی اُن پر کوئی الزام عائد نہ ہوگا۔ حجاز پاک کے
عرب۔ اندلس کے مور۔ ہندوستان کے [illegible] علم اسلام کو خود اپنے ہاتھوں سرنگوں کر بیٹھے
اس لیے کہ وہ آپس میں لڑنے جھگڑنے لگے۔ [illegible] فرائض میں بھی غفلت برتنے لگے۔
سامان جنگ کی فراہمی سے لاپروائی [illegible] عالی سے معرا ہوجانے اور
ہمت ومردانگی کی کمی کے باعث [illegible]
لیکن ترک [illegible] میں ایک رمق
برابر [illegible] اعلیٰ منزلت

مذہب کے بیشال نظم کے سمجھنے کا مادہ اور اُس کی قیمت کرنے کا خیال رکھتے ہیں تو وہ ترکوں سے اُسی طرح پائیدار دائمی محبت کا برتاؤ برقرار رکھیں گے جیسا پیشتر رکھتے تھے۔ بلکہ ترکوں کے حال کی مظلومیت اور مصیبت جو غیروں کے قومی تعصب۔ ہوس حکمرانی و خونپاشی کی ان پر لائی ہوئی ہے ترکوں کے ساتھ مسلمانوں کی ہمدردی میں اور اضافہ کا باعث ہو گی۔

پیرس کی مجلس عشرہ نے ترکوں کی قوم کو موت کا حکم سُنا دیا ہے لیکن دنیا کی روز افزوں ساڑھے تین کروڑ مخلوق کی برادری نے ایسا کوئی حکم نہیں سنایا ہے۔ نہ اسلام نے سنایا ہے۔ نہ قادر حقیقی نے سنایا ہے۔

قوم ترک ہرگز ہرگز تباہ نہ ہوگی۔ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ

اب کہ ۹ راگست ۱۹۲۳ء ہے۔ ترکوں کا مستقبل کس قدر درخشاں ہے۔ میرے سے مجذوب کے نزدیک نہیں جو "ہوائی محل" بنانے کا عادی ہے۔ اور اب نہ جانے کیا کیا خواب اسلام کے آیندہ عروج کے دیکھ رہا ہے۔ بلکہ ایک نہایت تجربہ کار مدبر کی نظروں میں جو سراسر واقعات متداولہ پر نظر رکھتا ہو۔ اس کا اندازہ اس تار سے ہو سکتا ہے جو ہز ہائینس آغاخاں نے خود لوزان پہونچکر ترکی نمایندوں سے مل کر صلح کے بعد ہی ہندوستان بھیجا اور جو ۲۰ر جولائی کے پایونیر میں تفصیل کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ جس کا ترجمہ یکم اگست کے "ہمدم" میں حسب ذیل تھا۔

"میں یہ پیغام لوزان سے ارسال کر رہا ہوں جہاں تاریخ جدید میں سب سے پہلی بار ایک مسلم سلطنت نے مغرب کی دول عظام کے ساتھ مساوات کے درجہ پر صلحنامہ پر دستخط کئے ہیں۔ اس صلحنامہ سے غازی اعظم مصطفےٰ کمال پاشا اور عصمت پاشا کی اعلیٰ شان اور ثابت قدمانہ قیادت پر درخشاں ترین روشنی پڑتی ہے۔ اس [illegible] ظاہر ہوتا ہے کہ برطانیہ عظمیٰ فرانس اور دیگر دول مغربیہ ٹرکی اور اسلام کے ساتھ دوستانہ تعلقات [illegible] کی خواہشمند ہیں۔ اس اعلیٰ صلحنامہ کے بموجب ۲۰۰ برس بعد ترکی ایک آزاد [illegible] سلطنت بن جاتی ہے۔ اُس کے اقتدار فرمانروائی کو [illegible] لوگ مستفید ہوتے

تھے۔ اب سرزمین ترکیہ پر غیر ملکی افواج کے قدم نہیں رہیں گے اور اس کی آزادی و خود مختاری جاپان کی طرح سے کامل ہے۔ تاریخی ادارۂ خلافت علیہ آستانہ میں قائم رہے گا۔ ترکوں کو قسطنطنیہ آدرنہ اور تراقیہ واپس مل گئے ہیں۔ اسلام اس نہایت ہی قابل اطمینان فیصلے کے لیے ترکوں کی عظیم الشان شجاعانہ قربانیوں اور اُن کی بہادرانہ قوت برداشت و تحمل کا ممنون احسان ہے لیکن ساتھ ہی برطانیہ فرانس اور اطالیہ میں اکثر افراد کی خوش اعتمادی اور پرخلوص مصالحت پسندی کا بھی مشکور ہے۔ نیز ہم بہت کچھ ہز ایکسی لینسی وائسرائے اور حکومت ہند کی مسلسل حمایت کے بھی احسان مند ہیں۔

اس صلحنامہ کے معنی یہ ہیں کہ گذشتہ تنازعات و مناقشات کا خاتمہ ہو کر وہ فراموش ہو چکے ہیں اس کے معنی یہ ہیں۔ کہ ترکی دولت علیہ۔ جو اب آزاد و خود مختار ہے۔ یورپ اور امریکہ کے ساتھ مستقل دوستانہ تعلقات بدرجۂ مساویانہ قائم رکھنے کے قابل ہو گئی ہے۔

مسلمانان ہند سے صرف اس قدر میں کہنا چاہتا ہوں کہ مدبرین ترکیہ انگلستان سے دوستی رکھنے کے تہ دل سے متمنی ہیں۔ اور مجھ کو یقین ہے کہ وہ انگلستان کے ساتھ اپنی تجارت کو وسعت دینا بنظر استحسان دیکھیں گے۔ میں اپنے احباب سے یہ بھی التماس کرتا ہوں کہ وہ کوئی ایسی بات نہ کریں جس سے موجودہ بحال شدہ دوستی اور تعلقات میں بدمزگی واقع ہو جائے۔ بجائے وہ سرگرمیاں دکھانے کے جو اب قیانوسی ہو گئی ہیں اور جن سے ٹرکی کا کوئی فائدہ نہیں۔ مسلمانان ہند کو چاہیے کہ ٹرکی سلطنت کو اپنی خوشحالی بحال کرنے میں مدد دیں مسلمانان ہند کو معلوم ہونا چاہیے کہ صلحنامہ ٹرکی کی تائید ملک معظم کے مشیران سلطنت نے کی ہے۔ اور اپنے ہندی مسلمان بھائیوں کو جو بہترین نصیحت کر سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ وہ اس جدید دولت علیہ کو اُس کی موجودہ حالت درماندگی میں مدد دیں۔ یہ کام عملی تدابیر اختیار کرنے سے بخوبی ہو سکتا ہے۔

ٹرکی نے سخت خوفناک نقصانات برداشت کیے ہیں۔ اور اب اہل ٹرکی کو براہ راست اعانت کی ضرورت ہے۔ ہم کو چاہیئے کہ ٹرکی کو ہندوستان سے خاص وفود روانہ کریں۔ تاکہ ہما

جا کر بیماری کا سد باب حفظ صحت کی بحالی صحت عامہ کی درستی۔ پرورش اطفال کی ہمت افزائی اور عام مجلسی فلاح و بہبود کو نشو و نما دینے کا انتظام کریں۔ ٹرکی کی نجات کی امید تو خود فرزندان ٹرکی ہی سے ہے۔ مگر ہم یہ کام اُن کی امداد و اعانت کرکے انجام دے سکتے ہیں۔

میں ٹرکی نمایندہ مقیم لوزان کی معرفت ترکی یتامیٰ کے لیے ایک ہزار پونڈ روانہ کر چکا ہوں میں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ اس صلحنامہ کی رو سے قوم عرب کی حالت ناقابل اطمینان ہوگئی ہے مگر میں یقین کرتا ہوں کہ معاملہ یاس انگیز نہیں ہے اگر ہم کوشش اور خوش اعتمادی کے ساتھ کام کریں تو اب بھی اس مسئلہ کا قابل اطمینان حل ہو سکتا ہے۔ برطانیہ عظمیٰ میں عربوں کے دوست بیشمار ہیں۔ میں مسلمانوں کی خدمت میں اس صلحنامہ کی دل سے تعریف کرتا ہوں۔ جس کے ذریعہ سے ٹرکی کو تاریخ میں ایک جدید مقام حاصل ہوتا ہے۔ اور امید ہے کہ وہ اس سے زیادہ کے اہل ثابت ہوگی۔ ہم مسلمانان ہند سیاسی طور پر ٹرکی کی مدد نہیں کر سکتے۔ مگر ہم اُسکی مدد اس طرح سے کر سکتے ہیں کہ یہ کام ہم اپنے ذمہ لے لیں کہ وہاں امن و صلح۔ بہبودی اور خوشحالی و صحت کی بحالی کی کوشش کریں۔ اور اس طرح اس کو تاج اسلام کا درخشاں ترین جوہر بننے میں مدد دیں۔ اس تار کے کچھ حصہ نظر انداز کرنے کے قابل ہیں۔ خصوصاً وہ جس میں دول متحدہ کی دوستی کا تذکرہ ہے۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ ترکوں کی فتح اور اُن کی کامیابی محض قادر مطلق کی آسمان سے اعانت اور زمین پر ترکوں کی اپنی ہمت و جاں نثاری کا نتیجہ ہے۔ ورنہ یورپ نے اور سب سے زیادہ برطانیہ نے کوئی دقیقہ ترکوں کی سلطنت کو۔ اُن کی قوم کو۔ تباہ و برباد کر دینے کا اُٹھا نہیں رکھا تھا۔

اب بیشک امید کی جاسکتی ہے کہ انگلستان و فرانس وغیرہ سب ترکوں سے دوستی کے خواہشمند ہوں گے۔ ترکی کی ایک مثل عرصہ ہوا ترکی سفارت انگلستان کے ایک مشیر نے سُنائی تھی کہ جو ہاتھ کاٹا نہ جاسکے اُس کو چومنا چاہیے۔ یورپ و امریکہ اسی مثل پر عمل کرتے ہیں۔ خصوصاً انگریز اس لیے تعجب نہیں ہے کہ اب جب ترکی کو فنا کرنے کی ہر کوشش ناکامیاب ہوئی ہے تو اس سے

دوستی کی ٹھانی جائے۔ خصوصاً اس حالت میں کہ اس سے نہ صرف ہندوستان کے مسلمانوں پر قابو پانے میں آسانی ہوگی بلکہ اس لیے بھی کہ ترکی کی دوستی سے بالشوک خطرہ بالکل زائل ہوجاتا تھا میں اب یہ بات اپنے ہندوستانی بھائیوں سے پوشیدہ رکھنا نہیں چاہتا ہوں کہ یہ خیال غلط ہے کہ ترکی فتح بولشوک مدد سے ہوئی۔ یا یہ کہ بولشوک ترکوں سے کسی خاص دوستی پر آمادہ ہیں۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ترکی اولوالعزمی کی یہ حد تھی کہ باوجود مغربی سلطنتوں کے ناقابل برداشت دباؤ کے ترکوں نے بولشوک شرائط امداد کو منظور نہ کیا۔ اور اپنی آزادی کو اُن کے ہاتھ میں فروخت کرنے سے انکار کیا۔ یہاں تک کہ اناطولیہ میں جو کچھ ہوا اُسمیں ایک اجنبی کا بھی ہاتھ نہ تھا۔ خود ترکوں نے توپیں درست کیں۔ ریل کے انجن درست کیے۔ اور روپیہ بھی بلا ایک پیسہ کا قرض لینے کے یا کاغذ کا سکہ چلانے کے مہیا کیا اور ایک تیار فوج کو سب سامان سے خود اس طرح مہیا کیا کہ وہ فوج بھی جس کو تمام یورپ نے سامان جنگ رسد وغیرہ سے مضبوط کیا تھا سر پہ پیر رکھ کر بھاگنے پر مجبور ہوئی۔ ترکوں کے دل بولشوک سے کچھ زیادہ خوش نہیں ہیں۔ اس لیے انگلستان وغیرہ کو ترکوں سے دوستی کرنے میں شاید آئندہ آسانی ہو۔ لیکن یہ ایسی حالت میں ممکن ہوگا جب انگلستان موصل کے مسئلہ میں اور فرانس شلم کے معاملہ میں اپنی حرص سے باز آئیں۔ ورنہ میں دس برس کے اندر ہی اندر ان دونوں قوتوں سے یکے بعد دیگرے ترکوں سے تصادم کا اندیشہ رکھتا ہوں۔

ترکوں کے آئندہ کے متعلق شروع سال رواں میں مجھ سے اور آغا خاں صاحب سے جو گفتگو ہوئی تھی اُس سے مجھے خطرہ پیدا ہوا تھا کہ موصوف یا تو اُس حد تک ترکوں کی قوم کے ضمیر سے واقف نہیں جس قدر میں ہوں۔ اور یا وہ چونکہ اور ذی اثر ہندوستانیوں کے سامنے مجھ سے گفتگو کر رہے تھے اس وجہ سے اور زیادہ تر اس وجہ سے کہ یورپ ( ) یوں ہی ترکی کا دشمن ہے پین اسلام ازم کے ڈر سے ہو رہا ہے وہ ترکوں کے صرف ایک نیشنل اسٹیٹ رہنے کے ارادے پر زور دیتے تھے۔ کہ ترک اب اُسی طرح ایک پکیٹ (Sultan ?) جس کا ترجمہ

جالب صاحب نے ہمدم میں "پیوستہ" کیا ہی) دولت ملیہ National State بنا چاہتے ہیں جس طرح یورپ کی دوسری سلطنتیں مثل اسپین وغیرہ کے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ بعض تنگ نظر ترکوں کا خود بھی یہی خیال ہی۔ اور اسی غرض سے خلافت کے متعلق وہ پالیسی برتی گئی ہی جو اسلامی نقطۂ نظر سے نہایت پست۔ خطرناک اور ناروا ہی۔ باوجودیکہ اُس کی تعریف میں بھی ہمارے "علماء" رطب اللسان ہو رہے ہیں جنھوں نے عرصہ سے اپنی یہ عادت ڈال رکھی ہی کہ جو رطب یابس اُن سرغناؤں کے منہ سے نکلے جن کا اثر عوام پر زیادہ ہی اُس پر "جی بجا حضور" کہہ دیں۔ بلکہ اگر ضرورت ہو تو ایک فتویٰ بھی حاضر کر دیں

ہز آئینس آغا خاں نے اپنے لوزان سے فرستادہ تار میں بھی بار بار (نیشنل اسٹیٹ) National State کے جملہ کو دھرایا ہی۔ جس سے میں تو مایوس ہی ہو جاتا۔ اگر آخر میں خود آغا خاں سلطنت ترکی کے "تاج اسلام کا درخشاں ترین جوہر" بن جانے کی امید ظاہر کرنے پر مجبور نہ ہوئے ہوتے۔

ظاہر ہی کہ اگر سلطنت ترکی صرف قوم ترک کی ایک سلطنت بننے کی ہوس رکھتی ہی۔ اور اگر اُس نے ارادہ کر لیا ہی کہ وہ خلیفہ کو اُسی طرح رکھے گی جس طرح مصر کے سلاطین نے ایک تت رکھا تھا۔ تو مسلمانان عالم کو اُس سلطنت میں کیسی وہ دلچسپی باقی رہ سکتی ہی۔ جو اُس کے علم بردار اسلام ہونے کا باعث ہی۔ آج تو مسلمانان عالم "چنگیز خانیوں" کو "قریشیوں" پر بھی محض اسلام کی خاطر ترجیح دے رہے ہیں۔ اور اُن کو آئندہ بھی ایسی بات کی قوی اُمید ہی کہ سلطنت عثمانی صرف قومی محدود سلطنت نہ ہو گی بلکہ واقعی وہ تاج اسلام کا درخشاں ترین جوہر ہو گی۔ میری امید تو سلطنت ترکی سے یہ ہی کہ وہ تاج ایشیا کا درخشاں ترین جوہر صدف ہو گی۔ اور وہ ترکوں ہی کی تلوار ہو گی جو ایشیا کے پیر سے غلامی کی زنجیر کاٹ کر پھینک دیگی۔ ہم بھی شہانی شہانی پکارنے سے آزاد نہ ہوں گے۔

لیکن میں اس اندیشہ سے کہ اس وقت "فاش اگر گویم جہاں برہم زنم" فاش گوئی سے پرہیز کرتا ہوں۔ اور اس موقع پر صرف مستقبل قریب کی بابت تھوڑے سے تذکرے کو کافی سمجھتا ہوں۔

ظاہرا دیکھنے میں تو نہ صرف مقابلہ طرابلس جنگ سے پہلے سے بلکہ اس عالمگیر جنگ سے پہلے سے ترکی سلطنت لوزان کی کامیاب صلح کے بعد بھی نہایت مختصر رہ گئی ہے۔ افریقہ میں جو سیادت مصر پر برائے نام دولت عثمانیہ کی باقی تھی وہ بھی اب باقی نہیں۔ یورپ میں صرف ذرا سی چٹ ہی باقی ہے۔ ایشیا میں ایک کثیر رقبہ دولت عثمانیہ سے بالکل نکل گیا۔ اور شام کا سا زرخیز ملک بھی ہاتھ سے جاتا رہا جسکو مولانا محمد علی نے اپنے ترجمۂ قرآن پاک میں جنت سے تعبیر کیا ہے۔ ترکوں کو اب بحر احمر سے، نہ بحر ہند سے، نہ خلیج فارس سے کچھ سیاسی تعلق رہ گیا ہے۔ میں نے سُنا ہے کہ لاہور کے ایک ہندو اخبار نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اب اسلام کا زوال رُک نہیں سکتا جب سلطنت عثمانیہ اُس حالت میں قوت نہ پکڑ سکی جس وقت کہ وہ بہت وسیع تھی تو اب جبکہ وہ بالکل مختصر رہ گئی ہے اُس کا یا اُس کے ذریعہ سے اسلام کا مستقبل کیسے درخشندہ ہو سکتا ہے۔

میں اس قسم کے معترضین کے سامنے تو یہ امر واقعہ پیش کرتا ہوں کہ رقبہ کی کمی سلطنت کے عروج میں مانع نہیں ہوتی انگلستان ایک ذرا سا جزیرہ دنیا کے ایک گوشہ میں پڑا ہوا تھا زمین جو تھوڑی سی میسر تھی وہ بھی زرخیز نہ تھی۔ آسمان ہر وقت اشک افشاں ہی رہتا تھا۔ کہر سے اپنا ہاتھ سوجھنا مشکل ہوتا تھا۔ خلقت غبی الطبع تھی۔ مگر آج وہی انگلستان دنیا کے ایک بڑے حصے پر قابض ہے اور اُس کی سطوت کا سکہ کل عالم پر بیٹھا ہوا ہے۔ مٹھی بھر انگلستان کے باشندے تیس کروڑ ہندوستانیوں کی گلہ بانی کر رہے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ ترکوں کی سلطنت کے رقبے کے کم ہو جانے سے اُن کی قوت میں کمی نہیں آئی ہے۔ اور انشاء اللہ پھر چند دنوں بعد جب وہ پھر بڑھنا شروع کریں گے تو اُس مرتبہ اُن کو کوئی بھی روک نہیں سکے گا۔ زیادہ تر جو حصہ ملک عرب کا ترکی کے قبضے سے نکل گیا ہے وہ ترکوں کی قوت کے بجائے اُن کی کمزوری کا باعث تھا۔ مثلاً یمن جہاں ۲۰ سال سے ترک نوجوان آ آ کر اپنی جانیں نثار کرتے تھے اور سلطنت کو کچھ بھی فائدہ نصیب نہ ہوتا تھا اور اس جاں نثاری سے ترکوں کی چھوٹی سی قوم روز بروز کم ہوتی جاتی تھی کیونکہ یمن کی دائمی جنگ میں وہی لوگ زیادہ تر کام آتے تھے جو قوم کی دم خم ہی

کے بڑھانے کا ذریعہ ہوتے اگر بچ جاتے۔ جنگ میں مشغول رہنے سے اقتصادی طور پر بھی ترکوں کا نقصان تھا اسلیئے کہ ترکوں کے کاروباری قابل یا کھیتی کسانی کے قابل نوجوان جبری فوجی بھرتی کے باعث دور دراز مقامات پر اس وقت بھی بھیجدیئے جاتے تھے جب صلح ہوتی تاکہ قلعوں اور سرحد وغیرہ کی حفاظت کریں۔ اس طرح اُن کا سب کام خراب ہوتا تھا اور غیر مسلم رعایا جو جبری بھرتی سے مستثنیٰ تھی ہر وقت اپنے ذاتی کاروبار میں مستعد رہتی تھی اور اُس سے فائدہ اُٹھاتی تھی۔ عرب زیادہ تر قومی خدمت سے مستثنیٰ تھے۔ اس لیئے اُن سے ترکوں کی فوجیں قوت میں زیادہ فائدہ حاصل نہیں کرسکتی تھیں۔ جو حصہ ملک اب ترکوں سے نکل گیا ہے اُس میں کا بعض جزو ترکوں پر شدید مالی بار کا بھی باعث ہوتا تھا۔ مثلاً حجاز پر ترکی حکومت لاکھوں روپیہ سال خرچ کر ڈالتی تھی بجائے اس کے کہ بطور اپنے مقبوضہ کے اس سے کچھ خراج وصول کرتی۔ جیسا عربوں نے گزشتہ جنگ کے عین خطرناک وقت میں ثابت کر دیا۔ ترکوں کو دشمنان اسلام سے جنگ کی حالت میں عربوں سے بجائے نفع کے نقصانِ عظیم ہی پہونچنے کا اندیشہ رہتا تھا۔ الغرض یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ ترکوں کو عربستان سے نکل جانے سے آیندہ کسی بڑی کمزوری کے محسوس کرنے کی کوئی وجہ ہے۔ گو میں سمجھتا ہوں کہ شام کو وہ پھر دیر یا سویرے ہی فتح کرلیں گے۔

عربستان کے نکلنے کے بجائے ان کو بحر اسود (   ) کے پاس کا وہ قطعہ زمین حال میں مل گیا ہے جو ان کے لیئے ہر طرح از بس مفید ہے۔ اُس کی آبادی ترکی زبان بولنے والی ترکوں ہی کی ہم نسل ہے۔ اُس کے قبضہ میں آجانے سے جنگی نقطۂ نظر سے سلطنت ترکی اب روس (   ) کے حملے سے زیادہ محفوظ ہو گئی ہے۔ معدنیات بھی اس قطعہ آراضی میں زیادہ ہیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اب بہت لمبی تورانی زنجیر کی یہ پہلی کڑی ترکوں میں آملی ہے۔ انشاءاللہ رفتہ رفتہ سب اسی طرح آکر مل جائیں گی۔ اور ایشیا کا وہ کل حصہ ایک ہو جائے گا۔

میں پیدائشی مین اسلامسٹ (   ) ہوں۔ مگر جیسا میں نے اُس وقت

دوران جنگ میں انگریزی اخباروں میں لکھا تھا جب ہر طرف سے ترکوں سے بدظنی دشمنانِ
اسلام پھیلا رہے تھے۔ اور سب سے قوی ذریعہ اس بدظنی کے پھیلانے میں کامیاب ہونے کا نہ صرف
اہل یورپ بلکہ ہمارے کرمفرمایانِ حجاز بھی یہ سمجھتے تھے کہ ترکوں کی پین تورانین
(   ) خیال کی تشہیر کی جائے۔ میں پین تورانین جذبہ اور کوشش کو بھی
پین اسلامزم (   ) سمجھتا رہا۔ اس لیے کہ سب تورانی مماہیں اور کوئی
جذبہ اور کوئی تجویز جو اُن کو بیدار کرے وہ اسلام کی قوت کا باعث ہوگی۔ اصل تو یوں
ہے کہ عین عالمِ یاس میں بھی اسلام کے عروج کے لیے میری نظر اُسی قطعہ کی طرف لگی ہوئی
تھی جس نے نہایت اولوالعزم اور حملہ آور زمانہ گزشتہ میں پیدا کیے تھے۔ اب بھی میں
ترکوں کے زیرِ اثر اُسی سمت سے مدد اسلام کی توقع رکھتا ہوں اور آئندہ کے لیے سلطنت
ترکی کو قارص آرادماں وغیرہ کا پھر مل جانا نہایت اچھی فال سمجھتا ہوں۔ بلکہ میری صلاح تو
ترکوں کو یہ ہوگی کہ وہ عراق کے ریگستان کے پھر خود لینے کی کوشش کے بجائے اور ان
حیلہ ور باشندوں پر بھروسہ کرنے کے عوض جنکی اجداد نے اپنے پیغمبر کے عزیز نواسہ تک کو نہایت
بیرحمی سے دھوکا دے کر ذبح کر ڈالا تھا ایران کو اس کے حوالہ کر دیں کیونکہ شیعہ گروہ کے
مقدس مقامات اسی خطہ میں بہت زیادہ ہیں۔ اور خود ایران سے اس کے بدلے ایرانی
آذربائیجان لے لیں کیونکہ ایرانی آذربائیجان میں بھی ترکی زبان زیادہ رائج ہے۔ اور ترکی
نسل آباد ہے۔ الغرض رقبہ کے اعتبار سے اب ترکی حکومت زیادہ مضبوط ہے اور مستقبل منور ہے۔
مالی حیثیت سے بھی ترکی کی آئندہ یا موجودہ حالت بعد صلح لوزان بُری نہیں اور پہلے سے
بہت اچھی ہے۔ بلکہ اس سے بھی بہتر ہو جانے کی امید ہے۔ ترکی کا باہر کا قرضہ اب بہت ہی کم رہ
جائے گا۔ گزشتہ عالمگیر جنگ نے علاوہ امریکہ کے اور بڑی سے بڑی دولت مند سلطنتوں
کی بھی مالی نقطۂ نگاہ سے کمر توڑ دی۔ حتیٰ کہ انگلستان بھی باوجود اس کے کہ اُس کے پھندے
میں سونے کی چڑیاں موجود ہیں اب ایک مقروض سلطنت ہو گیا ہے۔ لیکن یہ عجیب اتفاق ہوا ہے

کہ جنگ عظیم نے قرضہ کا کچھ بھی بار اگر نہیں ڈالا تو اُس قوم پر جو سب سے زیادہ فلاکت زدہ تھی ترکوں نے دوران جنگ میں جس قدر قرضہ لیا تھا وہ دولتہائے متوسطہ سے اور وہ خود ترکی اور جرمنی وغیرہ کے دشمنوں نے کالعدم کرا دیا۔ یعنی ترک الزام سے بھی بری ہو گئے۔ بعد عارضی صلح کے ترکوں نے جو جنگ چار سال تک جاری رکھی وہ محض اپنی قوت پر اور انھوں نے ایک پیسہ بھی کہیں سے قرض نہیں لیا نہ کاغذ کا سکہ ہی بنایا۔

قبل جنگ عظیم کے ترکوں پر باہر کا بہت قرضہ تھا اس میں جس قدر روس کا تھا وہ زار کی حکومت کے فنا ہونے کے بعد جس طرح ایران میں فنا ہو گیا اسی طرح ترکی میں۔ اب رہے دوسرے قرضے سو ان کی بابت لوزان میں یہ طے ہو گیا ہے کہ جنگ طرابلس و بلقان سے اس وقت تک جو ملک ترکی سلطنت سے الگ ہوئے ہیں ان کا قرضہ حصہ کے حساب سے علیحدہ شدہ ممالک پر ڈالا جائے گا۔ ترکی کے ذمہ سے وہ اتر جائے گا۔ اس طرح ایک کثیر رقم کے قرضہ سے ترک سبکدوش ہو گئے۔ اور تازہ رقبہ جو ان کو واپس ملا ہے وہ قرضہ سے پاک صاف ہے۔

لیکن سب سے دل خوش کن بات جو آیندہ کے عروج کی اور ترکی سلطنت کی بہتری کی سب سے زیادہ ضامن ہے وہ وہی ہے جس کی طرف آغا خاں صاحب نے توجہ دلائی ہے یعنی یہ کہ دو سو برس کے بعد ترکی حکومت کو واقعی خود مختاری نصیب ہوئی ہے اور آج ترکی اسی طرح آزاد ہے جس طرح جاپان یا خود انگلستان۔

کیپی چولیشن ر   ) (مراعات) جو اول اول ترکی سلطان نے اپنی اسلامی رواداری کے باعث خود اپنے سر منڈھے تھے اب ترکی کی گردن کے لیے ایسا بھاری پتھر بن گئے تھے جو اس کو پانی کے اندر روز بروز زیادہ گہرائی میں لے جا رہا تھا۔ ان رعایات مخصوص کے باعث ترکی حکومت عرصہ دراز سے اپنی اصلی خود مختاری اور آزادی کھو بیٹھی تھی جبکہ نواب صاحب رام پور بھی اپنی ریاست میں ہر طرح کا ظلم و ستم برطانوی رعایا پر توڑ سکتے ہیں سلطنت عثمانی جو ہر سہ برّ اعظم پر پھیلی ہوئی تھی اس بات پر مجبور تھی کہ وہ ہر اجنبی خطاکار

کو فوراً اس کی عدالت کے جو سلطنت عثمانی کے اندر اجنبی دول نے قائم کرائی تھیں پیش کرے۔
جبکہ نظام حیدرآباد کو اختیار حاصل ہے کہ وہ اپنے یہاں چنگی کا جو محصول چاہیں لیں دولت عثمانی کے لیے ایک حد مقرر تھی جس سے زیادہ وصول کرنے کا اُسے مطلق حق نہ تھا۔ دولت عثمانی کی نوبت یہ پہونچی تھی کہ جو آمدنی اُس نے اپنے کسی قرضہ میں کسی کمپنی کے پاس مکفول کی تھی اُسے وصول کرنے کے لیے وہ کمپنی خود اپنے عہدہ دار مقرر کر سکتی تھی جس طرح کوئی چھوٹے سے زمیندار کی اُس جائداد کا حال ہو جس پر قبضہ مرتہنانہ ہو گیا
ترکی سلطنت کے اجنبی باشندے ٹیکسوں سے بھی مستثنیٰ تھے۔ القصہ قبل منحوس غیر مصدقہ عہدنامہ سیورے کے بھی حکومت ترکی ہرگز کل طور پر خود مختار نہ تھی۔ اصل خود مختاری اسے اب ہی حاصل ہوئی ہے۔ اور قوی امید ہے کہ اسی طرح آزاد شدہ سلطنت ترکی جاپان سے بھی زیادہ قوت دار آیندہ ثابت ہوگی۔ اور دول عظمیٰ میں نمایاں رتبہ حاصل کرے گی۔
خداوند کریم کی عجب کارسازی ہے کہ جبکہ جرمن۔ اسٹریا ہنگری۔ بلگیریا سب پر شکست کے بعد سے فوجی قیود عائد کر دیئے گئے ہیں اور بحری قوت سب کی فنا کر دی گئی ہے، ترکوں نے اپنے کو ان قیود سے بھی آزاد کر لیا ہے۔ ابھی میرے پاس پورا معاہدہ لوزان نہیں پہنچا، مگر چونکہ میں ترکوں کے رگ و ریشہ سے واقف ہوں مجھے یقین کامل ہے کہ اُنھوں نے جنگی جبری خدمت کے حق کو کسی طرح نہ دیا ہوگا۔ جو جرمنی وغیرہ سب سے لیا گیا ہے۔ اور یہ تو مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ ان کا جنگی جہاز کیوبن (جو جرمنی سے بھاگ کر آ گیا تھا) جس کو میں نے بعد جنگ مارسیلز کے سمندر میں معمولی جہازوں کے ساتھ کھڑا دیکھ کر آہ سرد کھینچی تھی اُن کو واپس مل جائے گا۔
یونان نے بھی اُن کے سب گرفتار کردہ جہاز واپس دیئے۔ گو ترکوں کو اب بحری تیاری میں بہت نہ صرف کرنا پڑے گا اس لیے کہ ساحلی رقبہ سلطنت بہت گھٹ گیا ہے پھر بھی اگر ان کو ایک طاقت اور اثردار دولت بننا ہے تو بحری اور ہوائی سامان کی بھی خبر رکھنی ہی پڑے گی۔ اس لیے آیندہ کے لیے ہمارے سب کے لیے یہ بہت خوشی کی بات ہے کہ جبکہ جرمنی کا بیڑہ جہازات سمندر کی

تہ میں پڑا سڑ رہا ہے تو ترکوں کے دو چار جو جہاز تھے وہ ان کو واپس مل جاویں گے۔ سلطنت ترکی جنگ کے بارے بھی قریب قریب بالکل بچ گئی ہے۔ انگریزوں نے جو دو جہاز واپس نہیں کیے ان کی جگہ ترکوں کو چاہیے کہ جہاز خود اپنے یہاں بنالیں۔

سلطنت ترکی آیندہ اجنبی طلبگاران رعایات کی شکار نہ ہو گی۔ بلکہ اپنی اقتصادی ترقی اپنی حسب مرضی کرے گی۔ ترکوں نے یہ دوراندیشی کی ہے کہ اقتصادی ترقی میں مدد امریکہ سے حاصل کی ہے۔ بجائے حالت ماسبق کے کہ یورپ کی دول کے سپرد سب کچھ ہو جاتا تھا۔

معاہدہ چسٹر (   ) بھی تاریخ عثمانی میں ایک نیا باب ہے۔ اور مستقبل کے لیے امید افزا۔ لیکن میں ترکوں کو آگاہ کرتا ہوں کہ وہ "سگ زرد برادر شغال" کی مثل کو نہ بھولیں۔ اور جلد سے جلد جاپان کی طرح خود اپنے ہات سے اپنی اقتصادی ترقی کی طرف متوجہ ہوں۔

خدا کا شکر ہے کہ اب اس میں ان کو آسانی حاصل ہو گئی ہے۔ اور کم سے کم چار پانچ سال تک تو اُنھوں نے سب اپنا کام خود ہی کیا ہے۔ بات یہ ہوئی کہ دوران جنگ میں چونکہ جرمنی ترکوں کا حلیف تھا اس لیے اُس نے اِس کی بہت کوشش کی کہ ترک صنعت و حرفت نیز فلاحت و زراعت میں ہوشیار ہو جائیں تاکہ اُس کو مدد دے سکیں اور خود بھی اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکیں۔ تاکہ جرمنی کو ان کی زیادہ مدد نہ کرنی پڑے۔ اس غرض سے جرمنی نے معلم اور کتابیں وغیرہ ترکی کے ممالک میں پھیلا دیئے تھے۔

عارضی صلح کے ہوتے ہی جرمن کا خود تو ایک متنفس بھی سرزمین عثمانی پر باقی نہ رہنے پایا لیکن تعلیم رائیگاں نہیں ہوئی۔ اور خود ترکی زبان میں بھی اک ذخیرہ جمع ہو گیا۔ پھر بھی ترکوں کو جاپانیوں کی حالت پر پہنچنے کے لیے جلد سے جلد ہزارہا نوجوان یورپ و امریکہ حصول علم کے لئے بھیجنا چاہیے۔ تاکہ وہ واپس آکر دوسروں کو تعلیم دیں۔ اور خود بھی کمپنیاں وغیرہ قائم کریں۔ تعلیم صنعت و حرفت کی ایک ایسی مکمل جامعہ (   ) فوراً کھلنی چاہیئے جہاں ہندوستان سے بھی طالب علم حصول علم کے لیے پہنچیں۔ جبکہ ترکوں کی آیندہ زندگی اُن کی تجری

بحری و ہوائی قوت پر منحصر ہی اور لازمی ہی کہ وہ مضبوط اور آلات حرب حال سے مسلح فوج سے زبردست بیڑہ جہازات ہوائی و دریائی - نیز آبدوز کشتیاں موجود رکھیں - آیندہ کی ان کی بہبودی کا انحصار اس پر بھی ہی کہ وہ ہر قسم کی اقتصادی ترقی سے مطلق غافل نہ ہوں - اور سب سامان حرب و ضرب خود اپنے ہی ملک میں تیار کریں - وہ یہ یاد رکھیں کہ آیندہ جنگ کے لیے بھی لازمی ہی کہ وہ طبیعات وغیرہ میں ترقی کریں - ورنہ اُن کی بیعدیل بہادری و شجاعت بھی زیادہ کام نہ آئے گی - آیندہ جنگ میں علم کیمیائیت کام آئے گا اور کیمسٹری مسلمانوں کا اپنا ایجاد کردہ علم ہی "اطلب علم بالسین" ترکوں کا آیندہ موٹو ہو جرمنی ان کا بہترین معلم بنے گا یہ سلطنت عثمانی کس طرح تاج اسلام کا درخشندہ ترین جوہر بن سکے گی اور قومیت کے محدود دائرہ سے نکل کر وہ کس طرح پھر ایک عالمگیر زبردست سلطنت بنے گی اور اس کے لیے مسلمانان عالم کو کیا کیا کوشش کرنی پڑیگی یعنی ترکی کے مستقبل کا پین اسلامک پہلو کیا کیا ہے ابھی ایک پین اسلامک دماغ ہی کے پردوں میں اُس کا خاکہ بالکل محفوظ رہنا مناسب ہی - لیکن ہندوستان کی موجودہ حالت پر نگاہ رکھ کر مجھے نہ صرف واسطے ہندو بلکہ مالوی پنتھر دھانند کے بھی یہ گوش گزار کردینا ضروری ہی کہ ترکی کا مستقبل اور ہندوستان کا مستقبل ایک ہی زنجیر سے وابستہ ہی گو اس وقت درمیان میں بہت سی کڑیاں ہیں - بلکہ عرب کا ترکی سے علیحدہ ہو جانے سے کچھ فاصلہ اور زیادہ ہو گیا ہی - مگر چونکہ ایشیار کا آیندہ اب ترکی سے اور زیادہ وابستہ ہو گیا ہی اس لیے ہندوستان کی حالت کا انحصار ترکی کی آیندہ حالت پر زیادہ ہی - یاد رہے کہ اب زمانہ آیندہ میں کل ایشیائے قریب کی رہنمائی ترکوں ہی کے ہاتھ میں ہوگی - جو ہندو ہندوستان کی آزادی کے لیے جاپان کی طرف آنکھ اُٹھاتے ہیں وہ غلطی پر ہیں -

میرے سینہ میں پین اسلامک جوش نہیں ہی بلکہ پین ایشیاٹک بھی جب میں پین اسلامک سوسائٹی کو لندن میں چلا رہا تھا تو اسی زمانہ میں میں نے کوشش کی تھی کہ ایک پین ایشیاٹک سوسائٹی قائم کروں - چونکہ ایشیا کی سب سے زیادہ طاقت ور سلطنت جاپان کی تھی اسلیئے

اس کے سفیر سے رجوع کیا۔ مگر اُس طرف سے مطلق کوئی ہمت افزائی نہ ہوئی۔ اس کے علاوہ اور بیسیوں طرح سے جاپان نے یہ روشن کر دیا کہ اُس نے اپنی قسمت کو مغرب کی دولتوں کی قسمت کے ساتھ آویزاں کر دیا ہے۔ اور اُس کی امکانی کوشش یہ ہے کہ وہ بجائے ایک ایشیائی قوم کے ایک مغربی قوم سمجھی جائے۔ برخلاف اس کے ترکوں نے چار سو برس یورپ پر حکومت کی لیکن اس صلح پر دستخط سے چند ہی روز پیشتر لوزان سے یہ خبر یاد آئی تھی کہ لاکھ کوشش کی جاتی ہے کہ ترک ایک یورپی قوم نہیں اور گو وہ چار سو سال سے یورپ میں ہیں مگر وہ وہی ایشیائی قوم رہتے ہیں۔ میں نے مولانا ابوالکلام صاحب کے زبردست اخبار "الہلال" میں دس بارہ سال ہوئے یہی خیال ظاہر کیا تھا کہ ایشیا کی بہبود جاپان کے بجائے ترکی سے متعلق ہے۔ اور گنگا پرشاد ورما کے سے زبردست قوم پرست اور اپنے مذہب ہندو کے عاشق نے بھی میرے استدلال کو تسلیم کیا تھا۔ حال میں تو اپنے عمل سے جاپان نے اور بھی ثابت کر دیا کہ ایشیا کے فوائد پر اُس کی مطلق نظر نہیں بلکہ لوگوں کا خیال تو یہ ہے کہ اس جنگ میں اُس نے ایشیا کو ( ) کر کے خود ہی نقصان پہونچایا۔ جغرافیائی لحاظ سے بھی ایشیا کی رہنمائی ترکوں ہی کے ذمہ عائد ہوگی۔ ہندو بھائیوں کو یہ یاد رہے کہ دریائے انڈس سے لیکر دریائے مرتضیٰ تک یہ ایک طویل حصۂ عالم جس میں زیادہ تر ایشیائی ہی ہیں ایک نہ ایک وقت ترکی سیادت میں متحرک ہوگا۔ اور ہندوستان کے لیے دو ہی راستہ ہوں گے یا تو اس عظیم حرکت کا وہ ساتھ دے اور بھائی کی طرح اس کے ساتھ ساتھ آگے بڑھے اور یا اس حرکت کو اسی طرح اپنی طرف کھینچ لے جس طرح پہلے ایک بار ہو چکا ہے۔ اور خود پھر دب کر بیٹھ جائے۔ یاد رہے کہ شدھی اشدھی کی تحریکیں۔ یہ سنگھٹن یہ ہندو اکھاڑے کام آنے والے نہیں۔ اگر ہندوؤں کو غلامی سے نکلنا ہے اگر اپنے ملک کے لیے ان کو سوراج حاصل کرنا ہے تو ہندو مسلمانوں کو مل کر چلنا ہوگا۔ ورنہ ہندوستان کی تاریخ پھر اپنے کو دُھرائے گی اور ہندوستان پھر فاتحین کا جولانگاہ بنے گا۔ مسلمانان عالم بے تعلق ہو کر اور ہندوستان کے مسلمانوں سے بگاڑ کر کے ہرگز ہندوستان کی فلاح زمانہ

مستقبل میں ممکن نہیں۔

دنیا کا کوئی ملک اب سب سے الگ ہو کر زندگی نہیں بسر کر سکتا۔ ہندوستانی بھی اب ہمالیہ کے اندر ہی دنیا کے حدود نہیں تصور کر سکتے۔ اب ایک قوم کو دوسری باہر کی قوموں سے رابطہ اتحاد قائم کرنا ضرور ہوگا۔ نیشنلزم کی جگہ اسلام کی اول اول قائم کردہ انٹرنیشنلزم کا دور دورہ ہوگا۔ ہندوستان کے لیے ترک ہی فطرتی دوست ہوں گے۔

وہ مسلمانان ہند کے بھائی ہیں اور یہ برادرانہ سلسلہ اب مسلسل برابر قائم ہو جائے گا اب وقت تک جو بہت بڑی روک روس کی تھی وہ ٹوٹ گئی اور نہیں ٹوٹی تو جلد ٹوٹ جائے گی۔

اس وقت زار کی حکومت مانع تھی۔ قومی جوش مسلمانان روس میں نہیں پیدا ہونے پایا تھا مگر اب ایسا نہیں ہے۔ اگر آج بالشوک بخارا اور خیوا کے اُس طرف یا روسی آذربائیجان کے دوسری طرف جو باتے میں کامیاب بھی ہوئے اور ترکمانوں کی آزادی میں حائل بھی ہوئے تو عنقریب ہی جب اُس طرف افغانستان اور دوسری طرف ترکوں کا دباؤ پڑے گا۔

(اور زمانہ مستقبل میں ایران بھی بیچ میں دباؤ ڈالنے کی قابل انشاءاللہ ضرور ہو جائے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ عنقریب ہی ترک سورما اُس کی فوجی حالت کو درست کرنے میں معاون ہونگے) تو روس کو اپنی ہی خیر منانا مشکل ہوگا۔ الغرض جہاں تک انسان مستقبل کا اندازہ کر سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اب ہندوستان کا ہم سرحد صرف ایک ذرا سا افغانستان نہ ہوگا بلکہ کل اسلامی ایشیا۔ اہل ہند کو چاہیئے کہ اپنی اندرونی اور بیرونی سیاست میں اس امر کو فراموش نہ کریں۔

میں پھر کہتا ہوں کہ مستقبل ترکی مستقبل ہندوستان سے وابستہ ہے۔

ہندو مسلمان آٹھ نو سو سال سے بھائی بھائی کی طرح ہندوستان میں آباد ہیں۔ اگر اب بھی ایک دوسرے کو دشمن سمجھیں تو دونوں پر لعنت۔ اب ہندوستان یہاں کے مسلمانوں کی اسی طرح ماں ہے جس طرح ہندوؤں کی۔ مسلمان ہرگز غیر بن کر نہیں رہے ہیں۔ انھوں نے ہندوؤں کے بہت سے رسم و رواج کو بھی قبول کر لیا ہے۔ ہندوستان کی بہتری مسلمانان ہند

کی بہتری ہی۔ ہندوستان کا نقصان، ہندوستان کی غلامی اُن کی غلامی ہی۔ جب تک ہندو بھی آزاد نہ ہوں، ہندوستان میں فلاح نہ ہو گی۔ اور مسلمان ہرگز ہرگز آزاد نہیں ہو سکتے۔ بلکہ اگر ہندوستان دستِ غیر میں اسی طرح آلہ بنا رہا جیسا اس وقت تک ہی تو تمام ایشیا (ترک، عرب، ایران اور مصر) خطرہ میں رہیں گے۔ اس وجہ سے مسلمانانِ ہند کو بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اگر وہ ترکی کی یا کسی اسلامی سلطنت کی بہبودی چاہتے ہیں تو ہندوستان کے ہندوؤں کو اپنے ساتھ رکھیں۔ اور دستِ غیر میں ان کو آلہ بننے دیں۔ جس طرح ہندوؤں کو اپنے ملک کی آزادی کا خیال ہو مسلمانوں کو بھی اسی طرح چاہیئے۔ جس طرح ہندوؤں کو بیرونی حملہ سے ہندوستان کو بچانے کی فکر ہو۔ مسلمانانِ ہند کو بھی ویسی ہی فکر چاہیئے۔ ایک مسلمان کو بھی اس کا حق اسلام نے نہیں دیا ہی کہ وہ دوسرے مسلمان کو غلام بنائے جس طرح افغان و ترک اور عرب اپنے ملکوں کی آزادی میں کوشاں ہیں ہم مسلمان اپنے ملک ہند کی۔ جس طرح قادرِ مطلق مالک الملک نے اُن کی مدد کی اسی طرح ہماری بھی مدد کرے۔ آمین۔

کشمیر بہشت نظیر

"جو لوگ کیفیات نفسی کے حقیقت شناس ہیں اُن پر یہ امر ہرگز پوشیدہ نہیں کہ اگر ایک انسان سے کسی خاص شئے کے متعلق بیان کرایا جائے تو اس کے طرز بیان کی ترتیب اس کے دماغی رجحانات کے موافق ہوگی، وہ سب سے پیشتر اس رجحان کی طرف متوجہ ہوگا جس کے سب سے زیادہ گہرے اثرات اس کے دماغ نے قبول کیے ہیں۔ اگر اس وقت میں شاعرانہ کیفیات سے مدہوش ہوکر اس مضمون کی ابتدا کرتا تو شاید عشق کی کرشمہ سازیاں اور حسن کی جلوہ پاشیاں میرا موضوع بحث ہوتا۔ لیکن نہیں میرا مقصد دوسرا ہے۔ کشمیر کے حسن رنگا رنگ سے زیادہ کشمیریوں کی ناگفتہ حالت نے مجھکو اپنی طرف متوجہ کیا۔ ممکن ہے بد مذاقی کا الزام لگایا جائے کہ کشمیر بہشت نظیر کے تذکرہ میں محققانہ خشک مزاجی سے کام لیا گیا۔ ممکن ہے کوئی منچلا جس کو "فلسفۂ حسن" سے دلچسپی ہو کہہ اُٹھے کہ جمالیاتی پہلو ( ) بالکل نظر انداز کر دیا گیا۔ اس مضمون کا مقصد یہ ہے کہ صرف واقعات کو پیش کیا جائے اور ان مقامات کا جہاں سے گذرنے کا اتفاق ہوا تذکرہ کر دیا جائے"

حدود اربع | کشمیر کے شمال میں مغربی چین، مشرق میں تبت، مغرب میں روسی ترکستان اور افغانستان اور جنوب میں پنجاب ہے۔ اپنے جغرافی موقع کی وجہ سے کشمیر کی اہمیت اور زیادہ بڑھ گئی ہے کیونکہ پانچ خود مختار ممالک کے حدود اس کی سرحد سے ملتے ہیں۔ وسط ایشیا اور ہندوستان کی تجارت کا بھی یہی راستہ ہے۔

کشمیر کا رقبہ ۹۰۰۰۰ مربع میل ہے اور آبادی ۱۵ لاکھ ۵۰ ہزار نفوس پر مشتمل ہے۔

گذشتہ تاریخ | اگرچہ کشمیر کی گذشتہ تاریخ کے متعلق ہمارے پاس صحیح واقعات اور مواد کی کمی ہے تاہم جو کتابوں اور مقامی مروجہ کہانیوں سے مستنبط کیا جا سکتا ہے وہ پیش کیا جائے گا۔

تمام ملکوں کے عہد قدیم کی تاریخ کے لیے روایات قومی، مقامی مروجہ کہانیوں اور آثار کہن کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ بہرحال یہ کام شاید وہ شخص اچھی طرح کر سکے گا جو وہاں کی زبان، رسم و رواج

اور کشمیری قوم کی خصوصیات نسل سے واقف ہو۔

یہاں کی کہانیوں میں یہ بتلایا جاتا ہے کہ حضرت سلیمان کشمیر تشریف لائے اور لوگوں کو توحید کی تعلیم دی لیکن ہمارے پاس اس کے تاریخی شواہد موجود نہیں۔ کشمیر کی باقاعدہ تاریخ کا پتہ بدھ کے زمانہ سے چلتا ہے بدھوں کے زمانے کی پرانی عمارتوں نیز آثار قدیم سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کشمیر بدھوں کا بہت بڑا مرکز تھا۔ بدھوں کے بعد ہندوؤں (برہمنوں) کی حکومت اسی علاقہ پر سنہ ۱۰۰۰ء تک قائم رہی۔

اس زمانہ میں مسلمان تمام اقصائے عالم میں پھیلنا شروع ہو گئے تھے۔ چنانچہ ۱۰۱۵ء میں محمود غزنوی نے علاقہ کشمیر کو اپنی سلطنت سے ملحق کر لیا۔ چونکہ افغانوں نے کوئی باقاعدہ نظام حکومت یہاں قائم نہیں کیا تھا اس لئے تبت کے ہندو راجہ کو ۱۳۱۵ء میں کشمیر فتح کرنے میں کوئی موانع پیش نہیں آئے۔

اسی راجہ کی نسل میں شہزادہ یو فتن مشرف باسلام ہوا اور اس کا نام صدر الدین رکھا گیا۔ اس کے انتقال کے بعد اس کا وزیر شمس الدین سریر آرائے سلطنت ہوا۔ شمس الدین کے زمانہ میں مقابلۃً کشمیر نے بہت ترقی کی۔

مغلوں کے زمانہ تک کشمیر آزاد حکومت کی حیثیت رکھتا تھا۔ بالآخر اکبر اعظم نے ۱۵۸۶ء میں اس صوبہ کو سلطنت مغلیہ میں شامل کر لیا۔ جنرل قاسم خاں نے جو اکبر کے مشہور و معروف سرداروں میں تھا کشمیر کو فتح کیا لیکن اس کے بعد سے دربار شاہی کے تعلقات اس خطہ سے ایسے وابستہ ہوئے کہ یقیناً مغلوں کی حکومت کے آخر وقت تک قائم رہے۔ اکبر خود کشمیر گیا اور قلعہ ہری پربت کی تعمیر اپنے سامنے شروع کرائی جس کو جہانگیر نے اپنے زمانہ میں پایۂ تکمیل کو پہونچایا۔

جہانگیر کو خطۂ کشمیر سے خاص انسیت تھی اس کے بنوائے ہوئے باغات اور عمارتیں اب تک موجود ہیں۔ جہانگیر کی محبت کا اظہار اس کے ان الفاظ سے ہوتا ہے جو اس نے اپنی عمر کے آخری لمحوں میں کہے۔ "مجھ کو ویری ناگ لے چلو" اس کی یہ آخری خواہش تھی جو کارکنان قضا و قدر کے ہاتھوں کبھی نہ پوری ہونے والی تھی۔ چنانچہ وہ پیر پنجال کے دشوار گزار راستوں سے ویری ناگ

روانہ ہو گیا لیکن مقام بنا منگلہ پر اس نے اپنی آخری آرزو کو لیے ہوئے اس جہان تیرہ کو خیرباد کہا۔ ؏ ۔ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔

کشمیر جہانگیر کے زمانہ حکومت میں اس کی تفریح گاہ تھا۔ اس کی دل لگی کا سامان تھا۔ اس کے بعد شاہجہاں نے بھی اس خطہ کی قدر دانی اپنے والد ماجد سے کسی طرح کم نہیں کی۔ وہ بھی ان طرب آگیں مناظرہ قدرت سے ویسا ہی محظوظ ہوتا تھا جس طرح جہانگیر۔ فطرت کی نیرنگیوں اور بوقلمونیوں کا وہ بھی اپنے والد کی طرح قدر دان تھا۔

۱۷۴۰ء میں جب سلطنت مغلیہ کے دست و بازو بالکل شل ہو چکے تھے عبدالبرکات نے جو ایک سردار تھا کشمیر کے صوبہ کو خود مختار کر لیا۔ کچھ عرصہ کے لیے پھر دوبارہ پٹھانوں نے کشمیر پر اپنا قبضہ کر لیا لیکن ۱۸۱۹ء میں رنجیت سنگھ نے پٹھانوں کو شکست دینے کے بعد اس کو سکھ حکومت میں شامل کر لیا۔

انگریزوں نے جب پنجاب فتح کیا تو ۱۸۴۶ء میں انہوں نے یہ صوبہ گلاب سنگھ کو فروخت کر دیا اس کے بعد سے گلاب سنگھ کے خاندان میں کشمیر کی زمام حکومت ہے۔

طرز حکومت | دیگر دیسی ریاستوں کی طرح یہاں بھی حکومت کے جمہوری اصول پر شاذ ہی عمل درآمد ہے۔ یہاں طریقۂ استبداد کا نظارہ اپنی اصلی آب و تاب کے ساتھ ہوتا ہے۔

چند سال سے دوسری ریاستوں کی طرح یہاں بھی نام نہاد کونسل وزراء قائم کی گئی ہے جس کی غرض و غایت مہاراجہ صاحب کو امور سلطنت میں مشورہ دینا ہے۔ یہ کونسل مختلف شعبہ جات کے وزیروں پر مشتمل ہے۔

کشمیر کی آبادی میں ایک کثیر عنصر مسلمانوں کا ہے لیکن سخت افسوس اور تعجب ہے کہ ریاست کے اعلیٰ حکام سے لے کر ادنیٰ تک مسلمان شاذ ہی نظر پڑتا ہے۔ باوجودیکہ مسلمانوں کی آبادی کی نسبت ۹۵ فی صدی ہے لیکن ان کے حقوق کی کما حقہ نگہداشت نہیں کی جاتی۔

تعلیم | مسلمانوں میں تعلیم کا فقدان اس کی ایک بڑی وجہ بتائی جاتی ہے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ

مسلمان غیر تعلیم یافتہ ہیں لیکن اس کی ذمہ داری بھی ریاست ہی پر آتی ہے۔
کیا ریاست کی طرف سے کوئی خاص انتظام کیا گیا ؟ نہیں
کشمیر میں دو کالج ہیں ۔ سری پرتاپ کالج سری نگر اور جموں کالج ۔
سری پرتاپ کالج (موجودہ والیٔ کشمیر کے نام کے ساتھ موسوم ہے) میں ۲۰۰ کے قریب طالب العلم ہیں اور
ساتھ ہی کالجیٹ اسکول میں تقریباً ۵۰۰ طلبا رہیں۔ ان طلبا میں مسلمانوں کا اوسط ۵ فیصدی ہے۔
سری نگر کالج کے ایک پروفیسر صاحب سے مجھ کو یہ سُن کر تعجب ہوا کہ کالج کے مسلمان طلبا میں سے
کوئی بھی کشمیری نہیں بلکہ سب پنجابی ہیں۔
مسلمانوں میں فقدان تعلیم کی یہی وجہ ہے کہ کسی قسم کی حوصلہ افزائی ریاست کی طرف سے نہیں کی جاتی۔
سری نگر میں ایک صنعتی کالج (ٹیکنیکل انسٹیٹوٹ) بھی ہے۔ اس کا انتظام ظاہر میں اچھا معلوم ہوتا ہے
لوہاری، بڑھئی، معماری اور انجنیری وغیرہ کے علاوہ تصویر کشی کا خاص انتظام کیا گیا ہے۔ اسی کالج
پرنسپل کی کوٹھی جو خود طلبا کالج کی تعمیر کردہ ہے نہایت عمدہ عمارت ہے اور اس امر کا بین ثبوت ہے کہ
طالبعلموں سے عملی کام یورپ کے صنعتی کالجوں کے طریقہ تعلیم کے موافق لیا جاتا ہے۔
میں نے خاص طور پر مسلمانوں کی حالت اس لیے بیان کی ہے کہ اب تک نہ صرف ان کے حقوق
کی کافی نگہداشت کی طرف سے بے اعتنائی برتی گئی ہے بلکہ ان کی آیندہ ترقی اس بات پر منحصر ہے کہ
جلد از جلد ان کی طرف قوم توجہ کرے۔
امرتسر میں کشمیریوں کی اصلاح و ترقی کے لیے ایک جماعت عرصہ سے قائم ہے۔ ہر سال
کانفرنس بھی منعقد ہوتی ہے اور تجاویز بھی پاس کی جاتی ہیں لیکن عملی کام اب تک مطلقاً کچھ نہیں کیا گیا۔
صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب خود وہاں کی صورت حالات دیکھنے کے لیے تشریف لے گئے تھے
اور کشمیریوں کی اصلاح کے لیے اُنھوں نے قوم سے اپیل بھی کی تھی۔ لیکن جس طرح ان کی دھیمی
آواز کی اپیل تھی اس سے بھی گری ہوئی آواز میں قوم نے اس کا جواب دیا۔
بہرحال اب اس وقت ضرورت ہے کہ کشمیریوں کی اصلاح و ترقی کی طرف مسلمان بہت جلد توجہ کریں۔

معاشرت و اخلاق | کشمیریوں کے غربت و افلاس کی حالت اُس وقت اچھی طرح ظاہر ہو جاتی ہے جب ان کے کسی گاؤں سے گزرنے کا اتفاق ہو۔ گاؤں کے بچے جن کی صورتیں فرشتوں کی سی ہوتی ہیں چاروں طرف سے ہر مسافر یا سیاح کو گھیر لیتے ہیں۔ ہر طرف سے "بخشش" کی آواز بلند ہوتی ہے تاآنکہ ہر سخت دل رکھنے والا بھی ان معصوم صورتوں پر رحم کھا کر جو چشم براہ بیٹھے رہتے ہیں کچھ نہ کچھ دے دیتا ہے۔ ذلت و نکبت کی انتہائی حالت اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے؟

اسی افلاس و عسرت کی وجہ سے کشمیریوں سے وہ تمام جذبات عالیہ فنا ہو چکے ہیں جو دنیا میں کسی قوم کی بقا کے لیے ضروری ہیں انھیں کے پڑوس میں افغانوں کی غیور و اولوالعزم قوم آباد ہے لیکن دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

کشمیری قوم کے اخلاق کو بُرا نہیں کہا جا سکتا لیکن سخت افسوس کے ساتھ اس کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ سرینگر کی حالت اور خصوصاً ہانجی فرقہ (یہ لوگ عموماً ملاحی کرتے ہیں) کی اخلاقی حالت ناگفتہ بہ ہے شراب خواری، عورتوں کی عصمت فروشی اور بے حیائی یقیناً ایسی بد اخلاقیاں ہیں کہ پوری قوم کو تباہ کرنے کے لیے کافی ہیں۔ میں نے اس امر پر غور کیا ہے کہ آیا ان کی بداخلاقیاں ان کے افلاس و غربت کا نتیجہ ہیں یا ان کی خواری و رسوائی کے اعمال کی مکافات میں ہے۔ میرے خیال میں ان کی ان تمام بُرائیوں کا اصل سبب ان کی عرصہ کی غلامی ہے۔

ہندوستان کے اکثر حصوں کی طرح کشمیر میں بھی اسلام صوفیائے کرام کے تصرف سے پھیلایا گیا چنانچہ عرصہ تک رشد و ارشاد کے سلسلے برابر جاری رہے لیکن اب دوسرے مقامات کی طرح تصوف کی روحانی کارفرمائی ختم ہو چکی اور دنیا طلبی و حرص و آز کی گرم بازاری ہے تصوف کے فیضان و برکات کی بجائے ہر طرف توہمات کا ایک انبار نظر آتا ہے۔ افلاس و غلامی نے پہلے ہی کشمیریوں کی بلند حوصلگی کو خاک میں ملا دیا تھا جب ایسے بالطبع نیاز کیش موجود ہوں تو مرشد کی پانچوں گھی میں ہیں۔ انہیں نیاز مندوں کی ان کو تلاش رہتی ہے۔

میرے خیال میں کشمیر کے موجودہ پیروں کے تنزل اور عدم ترقی کی ایک بڑی وجہ ہیں کشمیری دماغ کی جو نشو و نما د اخلاق، فراست، اور ملک پیمائی میں اپنا نظیر نہیں رکھتا تھا ایک

عرصہ سے تو بات نے روک دی ہے۔ تعلیم کا فقدان جہالت کی تاریکی اور سیاسی بڑھ کر غیروں کی غلامی نے خودداری اور خود شناسی کے احساس کو بالکل محو کر دیا ہے۔

علامہ اقبال ذیل کے اشعار میں کشمیریوں کی حالت کا کن پر درد الفاظ میں نقشہ کھینچتے ہیں :-

کشمیری کہ با بندگی خو گرفتہ ۔۔۔ بتے می تراشد ز سنگ مزارے

ضمیرش تہی از خیالے بلندے ۔۔۔ خودی ناشناسے ز خود شرمسارے

بریشم قبا خواجہ از محنت او ۔۔۔ نصیب تنش جامۂ تار تارے

نہ در دیدۂ او فروغ نگاہے ۔۔۔ نہ در سینۂ او دل بے قرارے

بایں ہمہ ان میں اصلاح و ترقی کی استعداد موجود ہے۔ اس گئی گذری حالت میں بھی ان پر مذہب کا کافی اثر باقی ہے۔ نماز جمعہ میں مجھ کو دیکھ کر تعجب ہوا کہ وہی لوگ جو دن بھر جھوٹ بولتے ہیں امام کے خطبہ کے وقت زار زار روتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام سننے کے ساتھ ہی درود کی آواز سے تمام مسجد اٹھ آتی ہے ان کے مذہب کا بین ثبوت یہ ہے کہ باوجودیکہ مسیحی مشنری تبلیغ عرصہ سے جاری ہے لیکن اب تک کسی کشمیری کے متعلق یہ نہیں سنا گیا کہ اس نے مذہب عیسوی کو قبول کیا ہو۔ سرینگر اور بارہ مولہ میں اسی غرض کے لیے مشنری اسکول قائم کیے گئے اور انجیل کا کشمیری زبان میں ترجمہ بھی کیا گیا لیکن عیسائیوں کو ابتک مطلقاً کامیابی نہیں ہوئی۔

مشہور مقامات | میں کشمیر جموں کے راستہ سے گیا اور راولپنڈی کے راستہ سے واپس آیا میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ میری کشمیر کی سیر مکمل ہوئی کیونکہ اس کے لیے کم از کم چھ ماہ درکار ہیں لیکن میں نے وہ سب مقامات دیکھ لیے جو زیادہ مشہور ہیں اور جن تک راستہ کی آسانیاں ہیں۔

میں نے اپنا زیادہ وقت تین وادیوں کی گلگشت میں صرف کیا جو یقیناً خلاصۂ کشمیر

کی جا سکتی ہیں یعنی وادی کشمیر، وادی لدر، وادی سندھ۔

وادی کشمیر | یہ وادی ۸۰ میل طویل اور ۲۰ میل چوڑی ہے۔ ریاست کشمیر میں یہ وادی سب سے زیادہ زرخیز اور گنجان آباد ہے۔ ریاست کے مشہور شہر اور دارالسلطنت بھی اسی وادی میں واقع ہیں۔

سرینگر | بہ حیثیت ایک شہر کے یہاں کوئی قابل تعریف نہیں۔ مقامات میں باغات کی بہتات ہے۔ جہانگیر کے عہد کی تعمیر کردہ جامع مسجد قابل دید ہے، اس کی عمارت عالیشان اور طرز تعمیر کعبۃ اللہ کے نمونہ پر ہے۔

قلعہ ہری پربت اکبر کے زمانہ کی تعمیر ہے جو جہانگیر کے عہد میں پایہ تکمیل کو پہونچی۔

تخت سلیمان۔ ہندوؤں کا ایک بہت پرانا مندر کوہ سلیمان پر واقع ہے۔ اشوک کے بیٹے جلاک نے ۲۰۰ سال قبل مسیح میں اس جگہ جہاں تخت سلیمان واقع ہے ایک مندر تعمیر کرایا تھا راجہ گپادتھ نے سنہ [illegible]ء میں پرانے مندر کی جگہ یہ مندر بنوایا جو اب تک موجود ہے۔

اسلام آباد | کی آبادی دس ہزار ہے۔ وادی کشمیر میں سرینگر کے بعد بڑا شہر ہے۔ یہاں گندک کے چشمے ہیں جہاں لوگ دور دور سے نہانے آتے ہیں۔

بون | اسلام آباد سے پانچ میل پر واقع ہے۔ یہاں ایک خوشنما چشمہ ہے جس کے قریب جہانگیر کے عہد میں ایک باغ تعمیر کیا گیا تھا۔ اس باغ کے چبوترہ کے نشانات اب تک باقی ہیں۔

اسی باغ کے قریب پانڈوؤں کے زمانہ کے غار ہیں جو ۲۰۰ فٹ پہاڑ کے اندر ہی اندر چلے گئے ہیں۔

مٹن | سطح مرتفع پر واقع ہے۔ وہاں سے منظر نہایت شاندار ہے۔ یہاں ایک مندر ہے جس کی از سر نو تعمیر آجکل ہو رہی ہے۔ علاقہ کشمیر میں یہ مندر سب سے زیادہ قدیم خیال کیا جاتا ہے۔

وادی لدر | اس مقام سے وادی لدر شروع ہو جاتی ہے۔ اس وادی کے متعلق تمام سیاحان عالم کا مستفقہ فیصلہ ہے کہ مناظر قدرت کی دلفریبیوں کے لحاظ سے یہ وادی دنیا کی سب سے زیادہ خوشنما وادیوں میں سے ہے۔ لہٰذا ہمالیہ کی تو بہترین وادی یہی ہے۔

فطرت معہ اپنی تمام نگینیوں اور جلوہ آرائیوں کے یہاں ظاہر ہوتی ہے۔

عیش مقام | یہاں زین الدین صاحب کا مزار ہے جو ان صوفیائے کرام میں سے ہیں جنھوں نے کشمیر میں اسلام کی روشنی پھیلائی - یہ زیارت پہاڑ کے اندر تاریک غار میں واقع ہے جہاں پہونچکر بالطبع انسان کو ایک قسم کی ہیبت معلوم ہوتی ہے۔

یہاں سے ایک میل کے فاصلہ پر نہر نکالی گئی ہے۔ نہر کے مصنوعی آبشار قابل دید ہیں۔

وادی سندھ | اس وادی سے وسط ایشیا کو راستہ جاتا ہے۔ دریا کے کنارہ کنارہ سڑک کے پیچ و خم بھی دور تک چلے جاتے ہیں۔ اس وادی سے پہاڑ رک مکھ (۱۷۰۰۰ فٹ) جو ہمیشہ برف سے ڈھکا رہتا ہے معہ اپنے وقار و تمکین کے صاف نظر آتا ہے۔

گاندر بل - مانس بل اور کنگن اس وادی میں قابل دید مقامات ہیں۔

باغات | جہانگیر کو باغات کا بہت شوق تھا اور اس شوق کو پورا کرنے کے لیے کشمیر جیسی آسانیاں اور جگہ نہیں ہم پہونچ سکتی تھیں۔ فطرت خود باغ لگانے کو تیار، بہترین مواقع موجود پھر قدر دان شہنشاہ کے لیے کونسے موانع درپیش تھے۔

باوجود ان کی کس مپرسی اور عدم اعتنا کے جب ان باغوں میں جا کر بیٹھیے جو جہانگیر نے بنوائے ہیں تو اٹھنے کو طبیعت نہیں چاہتی۔ اور ایک عجیب روحانی کیف و انبساط اور دلی طمانیت حاصل ہوتی ہے۔

شہنشاہ جہانگیر کے عہد کے تعمیر کردہ باغوں میں سے یہ مشہور باغات موجود ہیں۔

شالامار باغ اور نشاط باغ | یہ دونوں باغات ڈل جھیل کے کنارہ واقع ہیں۔ یہ باغ عین اس مقام پر واقع ہیں جہاں سے چشمے نکلتے ہیں اس لیے پانی کی قلت کبھی نہیں محسوس ہوتی۔ آبشاروں اور فواروں کا خاص اہتمام ہے۔ جو یقیناً کسی دوسری جگہ محال ہے۔

اچھابل | یہ باغ بھی جہانگیر کا تعمیر کردہ ہے۔ ایک مثلث پہاڑی پر چشمہ کے قریب واقع ہے۔ اس پہاڑ پر بہت گھنا چیڑھ کا جنگل ہے جس کی وجہ سے نظارہ دلفریب ہو گیا ہے۔ اور باغات

کی طرح یہاں بھی آبشار موجود ہیں اور کبھی کبھی فوارے بھی چلتے ہیں۔

ویری ناگ سرینگر سے فاصلہ پر واقع ہونے کی وجہ سے اس باغ کی طرف بہت بے التفاتی برتی گئی ہے۔ حالانکہ موقع و محل کے لحاظ سے اس باغ کو کشمیر کے دیگر باغات پر فوقیت حاصل ہے۔ ویرناگ در اصل وہ چشمہ ہے جو دریائے جہلم کا منبع ہے۔ اس چشمہ کے چاروں طرف جہانگیر نے ایک عمارت تعمیر کرادی تھی اور اس کے بعد شاہجہاں نے آبشار بنوائے۔

شہنشاہ جہانگیر کو اس مقام سے اُنسیت تھی۔ کشمیر میں اس کا یہی مقام مرکز تھا۔ چنانچہ نورجہاں کے محلات کے آثار اب تک باقی ہیں اور دوسری عمارتیں ناقدری سے معدوم ہو گئی ہیں۔

جب جہانگیر کی زندگی کے چند لمحے باقی تھے اس وقت اس کی زبان پر اسی جگہ کا نام تھا اور اس کے دل میں کسی طرح پرواز کرکے اس مقام پر پہونچ جانے کی آرزو۔ یہ در اصل اسکی رنگینیٔ مزاج کا اقتضا تھا کہ وہ ایسے مقام پر مرنے کی آرزو کرے۔

چشمہ کے گرد عمارت میں قطعات تاریخی بھی کندہ ہیں۔

"بادشاہ ہفت کشور شہنشاہ عدالت گستر ابوالمظفر نورالدین جہانگیر پادشاہ ابن اکبر بادشاہ غازی بتاریخ ۱۵ سنہ جلوس دریں سرچشمہ فیض آئین نزول اجلال فرمودند۔ ایں عمارت بحکم آنحضرت صورت اتمام یافت۔"

قطعہ

از جہانگیر شاہ حیدر شاہ — ایں بنا سر کشید بر افلاک
بانی عقل یافت تاریخش — قصر آباد و چشمۂ ورناک

دوسرا قطعہ یہ ہے

حیدر بحکم شاہجہاں پادشاہ دھر — شکر خدا کہ ساخت چنیں آبشار و جوئے
زیں جوئے دادہ است زجوئے بہشت یاد — زیں آبشار یافتہ کشمیر آبروئے
تاریخ جوئے آب بگفتہ سروش غیب — از چشمۂ بہشت بروں آمدست جوئے

گلمرگ مرگ مرغزار کو کہتے ہیں۔ یہ مقام سطح سمندر سے ۸۵۰۰ فٹ بلندی پر واقع ہے۔ گلمرگ ایک سبزہ زار ہے۔ جدھر آنکھ اٹھتی ہے سبزہ ہی سبزہ نظر پڑتا ہے۔ بلندی پر واقع ہونے کی وجہ سے یہاں بمقابلہ وادیوں کے سردی زیادہ ہوتی ہے۔ گلمرگ سے دو میل پہاڑ کی چوٹی پر کھلن مرگ بہت وسیع مرغزار ہے۔ اس مقام سے دو میل فاصلہ پر ایک جھیل ہے جس کی سطح آب پر ہمیشہ یخ جمی رہتی ہے۔ یہاں سے ہندوستان سے سب سے بڑی جھیل ولر صاف دکھائی دیتی ہے بشرطیکہ ابر نہو۔ یہ بھی کشمیر کے ان چند مقامات میں سے ہے جن کے بیان کے لیے قلم کی زبان کی بجائے شاعر کی زبان زیادہ موزوں ہے اور اچھی طرح ادائیگی فرض سے عہدہ برا ہو سکتی ہے۔ جذبات، کیفیات اور احساسات کی صحیح ترجمانی صرف شاعر ہی کر سکتا ہے اس لیے بہتر ہوگا اگر میں یہ ذمہ داری کسی شاعر کے لیے چھوڑ دوں۔

یوسف حسین خاں
متعلم جامعہ ملیہ اسلامیہ

رفتار تعلیم

ڈاکٹر بٹلر، صدر کولمبیا یونیورسٹی نے لندن کی ایک انجمن اساتذہ کے جلسہ میں یہ بیان کیا کہ تعلیم کا قدیم معیار یہ تھا کہ معلومات میں کس قدر اضافہ ہوا لیکن اُنھوں نے بتایا کہ دراصل صحیح معیار تعلیم یہ ہونا چاہیئے کہ (۱) مادری زبان کا صحت و خوبی کے ساتھ استعمال کرنا آجائے۔ (۲) شریفانہ آداب اور اخلاق پیدا ہوں (۳) حسن و خوبی، قدر و منزلت اور اخلاق و آداب کے پرکھنے کا مذاق سلیم پیدا ہو (۴) نتائج پر غور و فکر کرنے کی قوت اور عادت ہو۔ (۵) نظم و نسق کے ساتھ کام کرنے کی قابلیت اور صلاحیت پیدا ہو۔ ڈاکٹر موصوف نے فرمایا کہ ہماری تعلیم میں یہ مقاصد ہمیشہ مدنظر ہونے چاہئیں، نہ یہ کہ بقول شخصے "چل پڑیا اور معلوم نہو کہ کدھر جارہے ہیں" اس پر آپ نے پروفیسر ہکسلے اور گاڑی بان کا قصہ بیان کیا کہ ایک بار پروفیسر ہکسلے چلتے چلتے ایک سڑک کے سرے پر جا پہونچے۔ دیر ہو رہی تھی، وہ فوراً ایک گاڑی میں بیٹھ گئے اور گاڑی بان سے کہا کہ "ہانکو" چلتے چلتے انھیں خیال آیا اور گاڑی بان سے پوچھا کہ "کہاں لے چل رہے ہو؟" اس نے جواب دیا "مجھے کیا معلوم؟ میں تو آپ کے حکم کے مطابق چل رہا ہوں"

ڈاکٹر بٹلر کے ان خیالات سے کسے انکار ہو سکتا ہے؟ ساتھ ہی اس کے کون نہیں جانتا کہ ہمارے طلبا کی کثیر جماعت ایک ایسی شاہراہ پر گامزن ہے جنھیں خود منزل مقصود کا پتہ نہیں اور ہندوستان کی کونسی یونیورسٹی ہے جو زبان حال سے یہ نہیں کہہ رہی ہے کہ "معلوم نہیں کہ ہم کہاں جارہے ہیں، آؤ، ساتھ چلے چلو"

بابو جگل کشور برلا نے بنارس ہندو یونیورسٹی کے طلبہ کے لیے پندرہ روپے ماہانہ کے وظائف عطا کیے ہیں جنمیں سے ۲۵ برہمن طلبہ کے لیے مخصوص ہیں۔ ۵۰ دیگر ذات کے

طلبہ کو دیئے جائیں گے۔ دو دو وظیفے سکھ اور تین طلبہ کو ملیں گے۔ اور ۲۵ وظائف نیچی ذات کے لڑکوں کو دئے جائیں گے۔

---

۲۵ ہزار ڈالر کی سالانہ رقم جاپان کی طرف سے اس غرض کے لیے مقرر کی گئی ہے کہ اس سے جاپان کے چینی طلبہ کو ۵۰ وظائف دیئے جائیں۔ ہر وظیفہ کی رقم ۵۰۰ ڈالر ہی جو دس ماہ تک جاری رہے گا۔ چینی گورنمنٹ سے دریافت کیا گیا ہے کہ وہ طلبہ کو نامزد کر دے۔ ـــ ۵

گر فتم کز حریفاں بیش یا کم میتوان گفتن
ز دستت تا چہ آمد؟ آخر ایں ہم میتواں گفتن

مسٹر پربھت چندر سر بدھیکاری جو تین سال سے سائنس کالج لندن میں نباتیات کی تعلیم پا رہے تھے، ابھی حال میں لندن یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی سند حاصل کی ہے۔ سند لینے سے قبل انھیں ایک سو پونڈ کا وظیفہ دیا گیا اور اس وقت سے انھیں ۱۵۰ پونڈ کا دوسرا وظیفہ ملا ہے تاکہ وہ اور ایک سال تک اپنے فن میں تحقیق جاری رکھ سکیں۔

تعلیم کے اغراض و مقاصد اور علم و فن کے فضایل و مکارم علما و فضلا کی زبان سے تو ہم نے بہت سنے ہیں لیکن ذرا یہ بھی دیکھیں کہ یورپ کا ایک سیاسی مدبر یعنی وزیر انگلستان نے اس موضوع پر کیا کچھ کہا ہے۔

"اب جبکہ ہم ایک شہری بننے کی غرض سے تعلیم دینا چاہتے ہیں تو ہم کو چاہیئے کہ ہم خواہ تاریخ و معاشیات، ریاضی یا اور کسی دوسرے علم کی تعلیم پاتے ہیں، ایک مقصد اپنے پیش نظر رکھیں (۱) یہ کہ اپنے دماغ کو لاف زنی سے پاک رکھیں (۲) یہ کہ منطقی طرز دلائل کو سمجھ کر مغالطہ کی گرفت کر سکیں۔"

اس ضمن میں مسٹر بالڈوین نے ایک واقعہ بیان کیا کہ ایک لیڈی نے ایک بار میرے ایک دوست سے پوچھا کہ "کیا یہ جدید وزیر اعظم تعلیمیافتہ شخص بھی ہے؟" یہ فقرہ اس امر کے لیے کافی ہے کہ "تعلیمیافتہ شخص" کا تصور اس شخص کے لیے کس قدر بلند ہے اور یہ کہ وزارت کے لیے تعلیمیافتہ شخص کی ضرورت ہے۔

کسی قوم میں انقلاب کے بعد سب سے پہلا تعمیری کام جو شروع کیا جاتا ہے وہ تعلیم کا ہوتا ہے۔ روسی قوم نے بھی ۱۹۱۷ء کے انقلاب کے بعد اب جو ذرا دم لیا تو سب سے پہلے قومی تعلیم میں ہاتھ لگایا۔ اور اس کے لیے دامے درمے قدمے ہر ممکن ذریعے سے کام کر رہے ہیں۔

جمہوریہ روس (سویٹ کانگریس) کے دسویں اجلاس نے یہ طے کر لیا ہے کہ تعلیم عامہ کے لیے انتہائی کوشش اور موثر ترین ذرائع عمل میں لائے جائیں گے چنانچہ آجکل حسب ذیل فقرے تمام بڑے بڑے مقامات پر چسپاں نظر آئیں گے۔

"ایک بہت ہی اہم مسئلہ آجکل ہمارے سامنے ہے۔ اپنی تمامتر کوششوں سے ہم کو اپنی تعلیم کو عام بنانا اور ترقی دینا ہے۔"

"ہماری جمہوریہ میں اسکولوں کا کام آجکل رو بہ زوال ہے۔ مدارس کی تعداد دن بدن گھٹ رہی ہے۔"

"روس کی مجلس انتظامی تمام مرکزی و مقامی جماعتوں سے یہ اپیل کرتی ہے کہ وہ اپنی قابلیت اپنے تجربے، اپنی معلومات اور اپنے مادی ذرائع اسکولوں کو تباہی سے بچانے میں صرف کر دیں اور آیندہ ان میں استقلال اور نشو و نما پیدا کریں۔"

"اسکولوں کے کارکنان خود بھی ہماری جمہوریہ کے علمی و تمدنی ترقی میں حصہ لیں۔ اسکول کا ایک تعلیمیافتہ کارکن ہے جو سوویٹ حکومت کا ہوا خواہ ہو، اسکول کی تعمیر کا بہترین ذریعہ بن سکتا ہے۔"

"ہمارے اسکول کب تک غلام بنے رہیں گے؟ انہیں لڑکے کی طرح نہیں رکھنا چاہیئے بلکہ

انہیں اراکین حکومت (سوویٹ) اور مزدور پیشہ جماعتوں کے حقیقی فرزند کی طرح ہونا چاہیئے"

غرض یہ کہ اب ان کا تکیہ کلام ہوگیا ہے کہ

"دشمن حالات کے مقابلہ میں صرف بستہ ہوکر بڑھو سوشلسٹ جمہوریہ کو بالاتریہ کہ علمی جمہوریہ بنی چاہیئے"

یوں تو تعلیم عامہ کے لحاظ سے ریاست میسور ہندوستان میں ایک نمایاں خصوصیت رکھتی ہے لیکن اس لحاظ سے بھی خاص طور پر قابل داد ہے کہ اس کے ہاں اندھوں اور بہروں کی کے لیے بھی ایک مخصوص درسگاہ ہے۔ حکومت اور پبلک دونوں کی عدم توجہی و غفلت کے باوجود یہ درسگاہ جو ایک عرصہ سے قائم ہے اپنا کام نہایت مستعدی اور انہماک کے ساتھ برابر انجام دے رہی ہے۔ سنہ ۲۳-۱۹۲۲ء میں طلبہ کی مجموعی تعداد ۶۱ تھی جن میں سے ۲۳ بہروں کی اور ۳۶ اندھوں کی اور ۲ صحیح وسالم لڑکوں کی تھی۔ ان میں ایک اندھی اور ۲ بہری لڑکیاں بھی شامل ہیں۔ درسگاہ کی مقبولیت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ سال مذکور میں ۲ طالب علم احاطہ بمبئی اور ۶ احاطہ مدراس کے موجود تھے۔ بہروں کو بُننے وغیرہ کا کام سکھایا جاتا ہے۔ اندھوں کو موسیقی مثلاً ہارمونیم اور بانسری وغیرہ بجانے کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اندھوں کو پڑھانے کے لیئے ایک طرح کے اُبھرے ہوئے حرفوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ اس قسم کا ایک پریس بھی اب کھولا گیا ہے جس میں کمپوزنگ کا کام وہ لڑکے خود کرتے ہیں اور اس طریقے سے ان کی کتابوں کے دشواری کا مسئلہ بھی حل ہوگیا۔

اس دورِ جدید کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ہر طرف علوم و فنون کی گرم بازاری نظر آئیگی تعلیم کے متعلق ہمیشہ نئے نئے اُصول و مبادی مرتب ہوتے رہتے ہیں جس سے رفتار تعلیم میں روز بروز ترقی ہوتی جاتی ہے۔ ذیل کے چند اصول جو مختلف لکچروں۔ کتابوں اور تعلیمگاہوں کے

مطالعہ و معائنہ کے بعد جمع کیے گئے ہیں۔

۱۔ یہی نہیں کہ طلبہ تک معلومات صرف پہنچا دی جائیں بلکہ انھیں خود کتابوں اور اصلی ذرائع معلومات سے فراہم کرنے اور تحقیق و تفتیش کرنے کا موقع دو۔

۲۔ حتی الامکان باقاعدہ جماعتوں کی پابندی سے پرہیز کرنا چاہیئے اور اس کی بجائے ہر متعلم کو ایک مخصوص کام دیا جائے جسے وہ خود اپنی تلاش و سعی سے کرے۔

۳۔ بعض تعلیمگاہوں میں ایسے علمی کام ایک فرد کی بجائے جماعت کے سپرد کیے جاتے ہیں جو مسئلہ مخصوص پر ایک مشترکہ رپورٹ پیش کریں۔

"معلم"

مطبوعات جدید

المومن

ازمولوی محمد اسلم صاحب جیراجپوری

یہ ایک سہ ماہی رسالہ ہے جو مولوی محمد یحییٰ صاحب مومن کی ادارت میں دفتر المومن نمبر ۲۳ بنیا پوکھر روڈ کلکتہ سے شائع ہوتا ہے۔ اب تک تین پرچے نکل چکے ہیں۔ ضخامت ڈھائی جز۔ اور لکھائی چھپائی کاغذ وغیرہ پسندیدہ ہے۔ قیمت سالانہ مع محصول ڈاک ۱۲ ہے۔

یہ رسالہ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے خصوصیت کے ساتھ قوم مومن یعنی نوربافکی اصلاح اور ترقی کے لئے ہے نیز بالعموم مسلمانوں کی بہبود بھی اس کے پیش نظر ہے۔

قوم مومن ہندوستان میں کثیر التعداد ہے۔ اور دینداری۔ عبادت اور تقوے میں نہایت ممتاز۔ ہم نے ان میں سے بہت سے ایسے مسلمان دیکھے ہیں جو ہندوستان کی دوسری قوموں میں ہم کو نہیں مل سکے۔ علوم اسلامیہ میں اس قوم کے بہت سے لوگوں نے نمایاں شہرت حاصل کی ہے۔ اب بھی علماء دین اس میں بکثرت ہیں۔ اور تاریخ اسلام میں تو بہت سے ائمہ حدیث و علماء دین ایسے ملتے ہیں جن کا یہی پیشہ تھا۔ مگر ہندوستان کے اہل اسلام پر یہ رونے کا مقام ہے کہ نسلی عصبیت نے ان کے اوپر ایسا غلبہ پالیا۔ اور ہندوؤں کے اثر سے خاندانی شرافت کا خیال اس طرح ان کے اوپر مسلط ہوگیا کہ وہ اس قوم کو جو ہندوستان کی جماعت اسلامیہ کا ایک نہایت صالح جزو ہے اور دینی و دنیوی ہر کام سے مفید تر ہے پست اور ادنیٰ سمجھتے ہیں یہاں تک کہ یہ رسالہ جو اس قوم کی طرف سے نکلا ہے اس میں اس کے تمام مقاصد میں سے سب سے اول مقصد یہ ہے کہ

"مسلمانو! ہم کو ذلیل اور رذیل نہ سمجھو"

افسوس صد افسوس۔ کیا مسلمانان ہند باوجود اس کے دعویٰ کرسکتے ہیں کہ وہ اسی نبی برحق

کے پیرو ہیں جس نے فخر بالانساب کو فتح مکہ کے دن پاؤں سے روند ڈالا۔ اور فرمایا۔

لا فضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی ولا لاحمر علی اسود ولا لاسود علی احمر۔ الناس کلھم من آدم وآدم من التراب

نہ عربی کو عجمی پر فضیلت ہے۔ نہ عجمی کو عربی پر نہ گورے کو کالے پر نہ کالے کو گورے پر سارے آدمی آدم کی نسل سے ہیں۔ اور آدم مٹی سے بنے تھے

اسلام ہر قسم کی نسلی تفریق کو مٹا کر تمام مسلمانوں کو آپس میں بھائی بھائی بناتا ہے۔ اس کے نزدیک یہ مشت خاک جس کا نام گوشت۔ پوست اور استخوان ہے ہرگز فخر کے قابل نہیں ہے۔ بلکہ بزرگی کا مدار صرف تقوے پر ہے۔ قرآن میں ہے۔

یا ایھا الناس انا خلقناکم من ذکر و انثیٰ وجعلناکم شعوباً و قبائل لتعارفوا۔ ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم

لوگو۔ ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا۔ اور تمھارے خاندان اور قبیلے بنا دئیے تاکہ آپس میں پہچان ہو حقیقت یہ ہے کہ سب سے زیادہ بزرگ اللہ کے نزدیک وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔

نسب کو جس کے اوپر بعض لوگ گھمنڈ رکھتے ہیں قرآن محض دنیاوی شئے قرار دیتا ہے۔ قیامت میں یہ سارے جسمانی تعلقات فنا ہو جائیں گے چنانچہ اس میں ہے۔

فاذا نفخ فی الصور فلا انساب بینھم یومئذ ولا یتسائلون فمن ثقلت موازینہ فاولئک ھم المفلحون ومن خفت موازینہ فاولئک الذین خسروا انفسھم فی جھنم خالدون ط

جب صور پھونکا جائیگا تو ان میں کسی قسم کا نسب ہوگا نہ وہ ایک دوسرے کو پوچھیں گے جن کا (میزان عمل) پلہ بھاری ہوگا وہ نجات پا جائیں گے۔ اور جن کا ہلکا ہوگا۔ اُنھوں نے اپنے آپ کو خسارہ میں رکھا وہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔

الغرض جو شخص نسب پر فخر کرے اور اس گھمنڈ میں اپنے کو شریف اور دوسروں کو رذیل سمجھے وہ ابھی جسمانیت کی جہالت اور جاہلیت کے آب و گل میں ہے۔ نہ اُسے روحانیت کی ہوا لگی ہے نہ اسلام کی روشنی اس نے دیکھی ہے۔

مجھے یاد ہے کہ ایک بار میرے والد مولانا سلامت اللہ صاحب مرحوم وزیر تعلیمات ریاست بھوپال کے یہاں مولانا حافظ عبد اللہ صاحب مرحوم غازی پوری جو قوم مومن سے تھے مہمان تھے۔

میں بہت نوعمر تھا۔ ایک دن غصہ میں کسی نوکر کو "جلاہا" کہہ بیٹھا۔ والد مرحوم نے ایسی غضب آلود نگاہ سے میری طرف دیکھا جس نے اس جاہلیت کے دلدل سے نکال کر مجھے کوسوں فاصلہ پر پھینک دیا اور ہمیشہ کے لیے میری اصلاح کر دی۔

میں المومن کے اڈیٹر صاحب کو مشورہ دیتا ہوں کہ وہ اس مقصد کو اپنے رسالہ سے خارج کر دیں۔ کیونکہ جو مسلمان فخر بالانساب میں مبتلا ہیں وہ حقیقت میں خود ہی ذلیل و خوار اور مجرم و گنہگار ہیں۔ ان کی اصلاح کی ضرورت ہے نہ کہ ان سے اس استدعا کی کہ وہ آپ کو شریف سمجھیں۔ ان کے سمجھنے یا کہنے سے ہوتا ہی کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وللہ العزۃ ولرسولہ وللمومنین ولکن المنافقین لایعلمون ؎ — عزت اللہ اور اُس کے رسول اور مومنین کے لیے ہے۔ لیکن منافق نہیں جانتے۔

جماعت نورباف کا فرض یہ ہے کہ وہ اپنی قوم کی دینی اور دنیوی ترقی کے لیے ہر ممکن کوشش کرے۔ اس قوم میں جیسا دینی اثر اور باہمی اتحاد ہے اس سے ہم کو توقع ہے کہ انکی ترقی جلد اور آسانی کے ساتھ ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد جو لوگ اس قوم پر تحقیر کی نظر ڈالتے ہیں وہ اپنے گریبانوں میں منہ ڈال کر خود اپنی جہالت پر افسوس کریں گے۔

اپنی ہر آبادی میں پنچایت قائم کرنا۔ ہر مقام پر مدرسے کھولنا۔ دینی علوم کے ساتھ صنعت و حرفت کی تعلیم دینا۔ خاصکر اپنے پیشہ کی۔ معاشرت اور تمدن کو خالص اسلامی تعلیم کے مطابق کرنا۔ قرب و جوار میں دین کی تبلیغ۔ مشترکہ سرمایہ سے تجارتی کاروبار کو بڑھانا۔ جو لوگ اعلیٰ تعلیم کے قابل ہوں اُن کو وظائف دینا وغیرہ۔

یہ اجمالی مقاصد ہیں جن کو پیش نظر رکھنا چاہیئے اور فوراً پوری توجہ سے تمام جماعت کو کوشش میں لگ جانا چاہیئے۔ قوم نورباف میں حسن معاملت۔ جفاکشی۔ باہمی محبت۔ اور اپنے سرداروں کی اطاعت وغیرہ ایسے بے نظیر صفات ہیں جن کے ہوتے ہوئے ان کی ترقی بالکل مشکل نہیں ہے۔ صرف ان کے رؤسا کو ہمت اور کوشش کی ضرورت ہے۔

۔ رسالہ المومن بے شک ہموار ہونا چاہیئے۔ لیکن اسی کے ساتھ سستے داموں کا اگر روزانہ نہیں تو کم سے کم ہفتہ میں دو بار یا ہفتہ وار ہی سہی ایک اخبار بھی ہونا چاہیئے۔ فقط

بصائر القرآن ۔ مرتبہ محمد مہدی صاحب ۔ مطبع مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

فرمانروائے بھوپال کے قدردانی علم اب محتاج تعارف نہیں۔ اکثر مطبوعات دفتر تاریخ سے شائع ہوتی رہتی ہیں۔ بصائر القرآن اسی قسم کی ایک کتاب ہے جس کو محمد مہدی صاحب نے نہایت محنت سے ترتیب دیا ہے۔ یہ دو سو آٹھ صفحہ کی کتاب ہے۔ بڑی تقطیع کاغذ معمولی سفید اور طباعت نہایت صاف اور روشن ہے۔

مرتب صاحب نے جلیل القدر پیغمبروں کے حالات اور قرآن کریم کے مشہور قصص حکایات کو ایک جگہ نہایت سادہ اور مختصر الفاظ میں جمع کیا ہے اور ہر قصہ یا بیان کے بعد نتیجہ کے عنوان سے بچوں کی ہدایت کے لیے کچھ الفاظ اس بیان یا واقعہ کے متعلق اضافہ کیئے ہیں۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ نتیجہ کے عنوان سے جو کچھ اضافہ کیا گیا ہے وہ اگر بالکل نہ ہوتا تب بھی کتاب کی خوبی پر کوئی اثر نہ پڑتا۔ بعض جگہ نتیجہ اخذ کرنے میں بچوں کی استعداد کا بھی لحاظ نہیں کیا گیا۔

کتاب اس قابل ہے کہ بچوں کو مدارس اور گھروں میں پڑھائی جائے۔

کلام جوہر

"مولانا کے برادر مکرم ذوالفقار علی خاں صاحب گوہر سے مولانا اور نیز شوکت علی صاحب کو اپنے زمانہ نظربندی اور بیتول جیل میں کچھ شکایات پیدا ہو گئی تھیں۔ ذوالفقار علی خاں صاحب نے اُن شکایات کا جواب ایک غزل میں دیا تھا جس کا مطلع یہ ہے:

جور اعدا کے گلے تیری جدائی کے گلے
اس دلِ تنگ میں ہیں۔ ساری خدائی کے گلے

(گوہر)

مولانا نے گلے شکوؤں کا جواب بڑے مزے سے اپنے انداز میں لکھا ہے"

(مدیر)

کبھی چکھے ہی نہیں آبلہ پائی کے مزے — خضر کیا جانے بھلا راہ نمائی کے مزے
کثرتِ شوق سے تھا ہجر بھی ہم رنگِ وصال — ہم نے لوٹے ہیں بہت تیری جدائی کے مزے
کششِ شوق تھی اور لذتِ بُعدِ منزل — سب طرف خار تھے اور آبلہ پائی کے مزے
طبع آزاد، اسیری میں بھی پابند نہ تھی — قید میں ہم نے اُٹھائے ہیں رہائی کے مزے
سمجھے ہر سجدے کو معراج جو زاہد چکھ لے — درِ توبہ پہ مری ناصیہ سائی کے مزے
آ گئی وادی پرخار پڑا ہو تو قدم — پھر نہ کہنا نہ ملے راہ نمائی کے مزے
میری مرضی ہوئی گم جب سے تری مرضی میں — بندگی ہی میں ملے ساری خدائی کے مزے
درگہِ حسن پہ سب ایک ہیں محمود و ایاز — بادشاہوں کو بھی ملتے ہیں گدائی کے مزے

شعر جوہر کی ہو کیا قدر سخن سازوں کو
ہم سے پوچھے کوئی اس ہرزہ سرائی کے مزے

جزیرۃ العرب

مولانا محمد اسلم صاحب جیراجپوری

"مولانا اسلم صاحب کے نتائج فکر کا دوسرا ہدیہ ناظرین جامعہ کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے' یوم جزیرۃ العرب عنقریب تمام ہندوستان میں منایا جائے گا' مولانا نے ذیل کی پُر اثر نظم اسی موقعہ کے لیے تحریر فرمائی ہے" مدیر

وہ عرب کہ دینِ برحق۔ ہوا جس سے آشکارا
کہ مٹا جہاں سے باطل۔ کیا کفر نے کنارا

حرمِ خدا ہے اُس میں۔ حرمِ نبی ہے اُس میں
کہ ملائکہ کی فوجیں جہاں رہتی ہیں صف آرا

ہے اُسی میں گھر خدا کا۔ کہ جو چشمہ ہے ہدے کا
کہ جہانِ تیرہ میں ہے وہی حق کا اِک منارا

وہ کتابِ آسمانی۔ کہ ہے نورِ جاودانی
اُسی سرزمیں میں رب نے اُسے عرش سے اُتارا

وہ رسولؐ فخرِ آدم کہ ہے رحمتِ دو عالم
اُسی خاک میں ہے پنہاں۔ وہیں تھا وہ جلوہ آرا

حرمین جانے والے ۔ قدم ادب سنبھالے!!
کہ وہاں کا ذرّہ ذرّہ ۔ مری آنکھ کا ہے تارا

کفِ پائے شاہ دیں کے ۔ لیے ہونگے اس نے بوسے
مجھے سنگپارہ بطحا کا ہے لعل سے بھی پیارا

مُتوَلّیِ حرم سے کوئی کاش جا کے کہہ دے
کہ ہے آبروئے ملّت کا یہ آستاں سہارا

یہ حرم کی سرزمیں ہے ۔ یہ متاع مسلمیں ہے
نہ کسی کی ہے تجارت ۔ نہ کسی کا ہے اجارا

یہاں مُلحِدی[1] کا شیوہ کوئی چل نہیں سکے گا
کہ تجھی کو پھونک دے گا ترے فتنہ کا شرارا

یہ حریم کبریائی ۔ کہ ہے قلعۂ خدائی
یہاں غیر کی رسائی ۔ نہیں مطلقاً گوارا

یہ جزیرۃ العرب ہے ۔ یہاں آستانِ رب ہے
کہ ہم اُس کے پاسباں ہیں وہ ہے پاسباں ہمارا

---

[1] اس آیت پاک کی طرف اشارہ ہے۔ ”وَمَن یُرِدْ فِیهِ بِإِلْحَادٍ بِظُلْمٍ نُذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ أَلِیمٍ“ ظلم سے اسمیں جو الحاد کا ارادہ کرے گا اُس کو ہم دردناک عذاب چکھائیں گے!!

سیرِ بہشت

مولانا آزاد عظیم آبادی

کل سیرِ خلد کو جو مجھے لے گیا خیال　　وہ نہر و باغ و نعمتِ الوان و حورِ عیں

کیا ذکرِ خورد و نوش کہ خود بھوک تھی نہ پیاس　　حوریں تو تھیں سِرے سے مِرے کام کی نہیں

حیراں ہوا کہ کیجئے کیا اس بہشت کو　　کچھ خوبیاں تو ہو نہ سکیں اس کی دلنشیں

لیکن ملا یہ نکتۂ نایاب بیدرنگ　　شایانِ شکر مائدہ نعمت آفریں

یک گردہ نانِ تازہ و یک جام آبِ سرد

بروقت ہاتھ آئے تو جنت ہی بس یہیں

العلم عند اللہ

اے محوِ جلوہائے طلسمِ تصورات　　کیا حاصلِ تصورِ میلادِ ممکنات

جس پر کوئی دلیل نہیں وہ قیاس کیا　　کچھ بھی چلا کسی کی خلقت کا جب پتا

اے آزرِ بتانِ خیالِ خدا تراش　　کس واسطے مدارجِ تکوین کی تلاش

عاجز ہے ہیں جسکی ذات سے سب حکیم　　صبحِ ازل کے صدق وصفا کا خدا علیم

آزاد عظیم آبادی

شذرات

عالم اسلامی میں جو عظیم الشان انقلاب اس وقت ظہور پذیر ہو رہے ہیں۔ اُن کی اہمیت کا صحیح اندازہ تو ابھی نہیں کیا جا سکتا لیکن آل عثمان کی جانبازی و حق پرستی کے جو ثمراتِ اولین اب قسطنطنیہ و سلطنت ترکی میں نظر آ رہے ہیں اُن کو البتہ دنیا دیکھ رہی ہے۔

نومبر ۱۹۱۸ء میں اتحادی افواج نے قسطنطنیہ پر قبضہ کیا تھا اور اُس وقت واقعات کا رُخ ایسا تھا کہ ہمدردان اسلام مایوس ہو چلے تھے اور اُمید نہ تھی کہ ۲؍ اکتوبر ۱۹۲۳ء بھی آ ئیگی جبکہ ان قبضہ کرنے والوں نے غالباً ہمیشہ کے لیے قسطنطنیہ کو الوداع کہا اور اس طرح ترکی فتح و لازوال کی عظیم الشان کامیابی پر گویا مہر ثبت ہو گئی۔ غالباً ترکی قوم کے لیے اپنی جنگی کامیابیوں سے فائدہ اُٹھانے کا گزشتہ پچاس سال میں یہ پہلا موقع ہے اور اس اعتبار سے جس جوش مسرت کا اظہار اس وقت تمام ممالک اسلامی میں ہو رہا ہے وہ ذرا بھی غیر متوقع نہیں کہا جا سکتا۔

ترکوں نے اپنی آزادی کا پہلا عملی ثبوت انسداد مے نوشی کے قابل قدر قانون سے پیش کیا ہے جس کا نفاذ اب قسطنطنیہ و حدود ترکی میں نہایت سختی سے ہو چکا ہے۔ اہل یورپ و یورپ پرست ترک آب انگور کے اس طرح دفعتاً غایب ہو جانے سے اپنی تشنہ کامی کو اس امید موہوم سے تسکین دے رہے ہیں کہ غالباً مے پرستوں پر یہ جبر و تشدد زیادہ عرصہ قائم نہ رہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ میخانۂ ہستی کے جن بادہ خواروں نے اس رسم کہن کو پھر تازہ کیا ہے وہ اپنے نکتہ چینوں سے کہیں زیادہ سرشار و مدہوش ہیں اور یہ نشہ تا ساقی اُتر ہی نہیں سکتا اس لیے کہ موجودہ دور قسطنطنیہ کے عہد قدیم سے بالکل مختلف ہے۔

بادہ آشام نئے بادہ نیا خم بھی نئے!

حکومت انگورہ نے اپنا جدید نظام اساسی طیار کیا ہی اور سلطنت ترکی کے لیئے جمہوری طرز حکومت کا اعلان ہو چکا ہی۔ دار السلطنت بھی بجائے قسطنطنیہ کے انقرہ تجویز کیا گیا ہی ہر چند کہ ترکی قوم کو حق حاصل ہی کہ وہ اپنے لیئے جو طرز حکومت مناسب سمجھے اختیار کرے اور نہ جمہوریت موجودہ تمدن و آئین اسلام کے خلاف ہی لیکن آل عثمان کا جو تعلق اب تک عالم اسلامی سے رہا ہی اور منصب خلافت کی وجہ سے جو اقتدار اُن کو صدیوں حاصل رہا اُس کے اعتبار سے اس فیصلہ کو ہندوستان کے بعض حلقوں میں اک گونہ تعجب کی نظر سے دیکھا گیا ہی۔ بعض حضرات کے نزدیک مسئلہ خلافت کی صورت اب بالکل نئی ہو گئی، کچھ لوگ خلافت و حکومت کی اس تقسیم سیاسی کو مذہباً ناجائز اور مصلحتاً نامناسب تصور فرماتے ہیں حکومت ہند گو بظاہر خاموش ہی لیکن ہمدردان حکومت اس واقعہ کی تاویل کچھ اس انداز سے کر رہے ہیں کہ گویا آتش خاموش کے لیے سامان اشتعال کی تلاش میں ہیں۔ بہر حال اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اس اہم اور نہایت نازک مسئلہ کے متعلق مسلمانان عالم کے متفقہ فیصلہ کی ضرورت ہی اور اکابرین قوم کو جلد اس طرف متوجہ ہونا چاہیئے ہم نے مسئلہ کی اہمیت کا خیال کر کے جامعہ میں اک سلسلہ مضامین شائع کرنے کا قصد کیا ہی لیکن اس مقصد میں کامیابی کی صرف یہ ہی صورت ہی کہ بزرگان قوم بھی ہماری اعانت فرمائیں اور اپنے خیالات کے اظہار میں جامعہ کے صفحات کی طرف متوجہ ہوں۔

مسئلہ کینیا کے متعلق سر تیج بہادر سپرو کے مساعی جمیلہ کا ذکر ہمارے صوبہ کے بعض اخبارات اور رایٹر کے تاروں میں نہایت تفصیل سے رہتا ہی کاش برٹش امپایر کانفرنس کی بجائے کسی زیادہ مفید و با اثر ذریعہ کو سر تیج بہادر اپنی کوششوں کا وسیلہ بناتے تاکہ انہیں کامیابی کی کوئی امید ہو سکتی۔ موجودہ صورت میں اگرچہ انھوں نے اپنا فرض نہایت قابلیت کے ساتھ ادا کیا، لیکن غریب ہندوستان کے لیے وہ کچھ زیادہ سود مند نہیں ہو سکتا

اس لئے کہ جس انجمن سے وہ حق پرستی و دادرسی کی توقع فرماتے تھے اُس کا حال یہ ہے کہ خود اُس کی متفقہ قراردادوں کو جو گزشتہ سال منظور کی جا چکی ہیں آج جنرل اسمٹس جو امپائر کانفرنس کے رکن رکین ہیں طاق نسیاں کے نذر فرما چکے ہیں اور اس تجاہل عارفانہ کی تلافی بھی نہیں کرنا چاہیے۔ اُن کے نزدیک اُس تجویز پر جس کے تسلیم کرنے والوں میں ایک وہ بھی تھے اب عمل ہی نہیں ہو سکتا! ایسی حالت میں ڈاکٹر سپرو کی "کامیابیاں" واقعیت اور حقیقت کے اعتبار سے کیا حیثیت رکھتی ہیں؟ کیا کینیا کے معاملہ پر دوبارہ غور کرنے کی امید موہوم اُن غریب ہندوستانیوں کے درد دل کی دوا ہو سکتی ہے جو اپنے وطن سے دور سرمایہ داری کی بے پناہ تلوار اور نسلی تعصبات کی کند چھری سے ذبح کیے جا رہے ہیں۔

انگلستان کے بلند پایہ مصنفین میں نارمن اینگل کا نام جو عظمت و اقتدار حاصل کر چکا ہے وہ محتاج تشریح نہیں۔ صرف انگلستان ہی نہیں تمام عالم میں "گریٹ الیوژن" کے مصنف نے دسمبر ۱۹۱۹ء میں جو ہل چل پیدا کر دی تھی وہ آج بھی کہ یورپ کا سیاسی مطلع تیرہ و تار ہے اور ایشیا کی سرزمین ہیجان و اضطراب کی بجلیاں اپنے دامن میں چھپائے ہوئے ہے، فراموش نہیں کی جا سکتی۔

حال میں نارمن اینگل نے انگلستان کے مقتدر اخبار "نیشن" میں ایک سلسلہ مضامین شروع کیا ہے جس میں پریس کا روز افزوں اقتدار اور ہیئت اجتماعی و سیاسی زندگی پر غیر معمولی اثر دکھانے کے بعد انھوں نے اُن خطرات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے جو خود غرض و تاجر صفت مالکان اخبار کے وجہ سے ملک میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ شراب نوشی کا عام رواج اور دیگر مسکرات کی حکومت کی طرف سے اشاعت اس درجہ خطرناک نہیں، ڈاکٹر اگر مریضوں کے لئے غلط علاج تجویز کریں تو وہ اس قدر اندیشہ ناک نہیں، لیکن جو زہر کہ اخبارات کے ذریعہ ملک میں پھیلایا جاتا ہے اور جو نہ بجھنے والی پیاس غلط خبروں کے ذریعہ پیدا کی جاتی ہے

اُس کے نقصان کا کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا اور نہ اُس کی تلافی بہ آسانی ممکن ہے۔
دوران جنگ میں ایک اخبار نے جرمنی میں ایک ایسا کارخانہ دریافت کیا تھا جہاں لاشوں کو ضائع کر کے اُن سے تجارتی فائدہ حاصل کیا جاتا تھا۔ آج کل بھی بجائے امن و سکون کی کوشش کے پریس آئے دن ہوٹل کے نوکروں، کارخانہ کی لڑکیوں، اسکول کے بچوں میں انقلاب، اضطراب پیدا کرنے کی فکر میں مبتلا ہے۔ اور یہ زہریلا اثر رفتہ رفتہ تمام ملک میں پھیلتا جاتا ہے۔

اسی مضمون کی تائید انگلستان کے دوسرے نامور صحافی و ادیب مسٹر چسٹرٹن کی طرف سے ہوئی ہے جنھوں نے کیمبرج یونیورسٹی کے مباحثہ میں ایک معرکۃ الآرا تقریر فرمائی۔
مسئلہ زیر بحث یہ تھا کہ پریس کا غیر معمولی اثر ملک کے لیے مضر اور اس لیے قابل افسوس ہے۔ مسٹر چسٹرٹن نے دوران تقریر میں پریس کی جس حیثیت کو سب سے زیادہ قابل افسوس و مضرت رساں ثابت کیا وہ "اجارہ داری" ہے۔ یعنی بعض دولتمند افراد کا مقتدر و با اثر اخبارات کو تجارتی اصول پر قائم رکھنا اور چلانا۔ اس اجارہ داری کی تازہ مثال ہلٹن پریس کی بیع ہے اور لارڈ راتھمیر اور لارڈ نارتھ کلف کا وہ خطرناک اثر ہے جو برطانوی حکومت کے علاوہ دنیا کے دوسرے حصوں میں بھی یکساں محسوس کیا جاتا ہے۔ لیکن باوجود 'ڈیلی میل'، 'دی ٹائمز' جیسے اخبارات نہ ہونے کے ہندوستان خداوندان صحافت کے ہاتھوں جس مصیبت میں گرفتار ہے اُس کے مظاہر نہایت عبرت خیز و درد انگیز ہیں۔
پنجاب، مدراس، صوبہ متحدہ، بنگال کسی صوبہ کو لے لیجئے اور وہاں کے سیاسی، مذہبی واجتماعی اختلافات و مناقشات پر غور فرمائیے تو حیرت ہوتی ہے اور کسی طرح سمجھ میں نہیں آتا کہ عقل، و دانش کے طویل دعاوی کے باوجود تعصب جہالت کی گرم بازاری کیوں ہے؟

مکتبہ جامعہ ملیہ کی خاص کتابیں

تاریخ الامت۔ مصنفہ مولانا حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری۔ آغاز اسلام سے آخر زمانہ سلاطین بنی امیہ و بنی عباس تک مکمل تاریخ اسلام اس سے قبل اردو میں موجود نہ تھی۔ تاریخ الامت نے اس ضرورت کو پہلی مرتبہ پورا کیا ہے اور اسی وجہ سے وہ علمی حلقوں میں خصوصیت سے مقبول ہوئی۔ تاریخ اسلام پر اس سے بہتر جامع مختصر اور مسلسل کتاب موجود نہیں۔ قیمت حصہ (سیرۃ) ۸؍ حصہ دوم (خلافت راشدہ) ۱۲؍

حصہ سوم (بنی امیہ) ۸؍ حصہ چہارم (بنی عباس) ۱۲؍

ترکوں کی کہانیاں آل عثمان کے جنگی کارناموں اور ترکی بہادروں کی جوانمردی اور اسلامی اخوت و ہمدردی کی سچی تصویریں (جو موجودہ واقعات سے لی گئی ہیں) کہ اس کتاب میں نظر آتی ہیں۔ قیمت ۴؍

مبادی معاشیات پروفیسر ذاکر حسین خاں صاحب کی درمعرکۃ الآرا کتاب ہے جو علم المعیشت کے تمام اصول نہایت خوبی کے ساتھ سہل اور عام فہم طریقہ سے ذہن ذہن نشین کر دیتی ہے۔ قیمت عہ؍

مجموعہ کلام جوہر رئیس الاحرار مولانا محمد علی صاحب جوہر کی تمام جدید و قدیم کلام کا مجموعہ جس کا زیادہ حصہ بیجاپور جیل میں تصنیف ہوا ہے مع مقدمہ از مسٹر عبدالماجد بی۔اے و تازہ فوٹو مولانا صاحب۔ قیمت ۶؍

ازہار العرب مولانا محمد سورتی صاحب نے ادب عربی حصہ نظم کا ایک مختصر انتخاب فرمایا ہے جو عام طور پر طلبہ و اہل علم میں مقبول ہوا۔ قیمت ۸؍

ضروری تصحیح اس نمبر میں صفحہ ۲۱۴ کے بعد ۲۲۵ غلطی سے لکھا گیا ہے ۲۱۵ ہونا چاہیے اسی طرح ۲۴۴ تک صفحوں کے سب نمبر بدل جائینگے اس غلطی سے مضمون کے تسلسل میں کوئی فرق نہیں ہوتا ہے ناظرین تصحیح فرمالیں۔ منیجر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جلد ۲ | ماہ ربیع الثانی سنہ ۱۳۴۲ھ مطابق نومبر سنہ ۱۹۲۳ء | نمبر ۵

تاریخ تصوف کا ایک ورق

کشف المحجوب

(شیخ علی بن عثمان ہجویری رح)

تصوف کا اثر ہندوستان پر اس قدر شدید و وسیع ہی کہ اُردو زبان باوجود اپنی کم عمری کے قدم قدم پر تصوف کی ممنون ہی، فن شعر جو ایشیائی ادب کا جزو اعظم ہی تصوف ہی کے سہارے اوج رفعت پر پہونچا ہی، حتیٰ کہ روزمرہ کی زندگی میں بھی مسائل تصوف پر دار و مدار ہی۔ لیکن افسوس ہی کہ اُردو میں تصوف کے متعلق کوئی مفید و مستقل تصنیف تو درکنار فارسی کتابوں کا معقول و قابل فہم ترجمہ بھی موجود نہیں ہی۔ ہمارے مکرم جناب عبدالماجد صاحب بی۔ اے نے جب سے رمز شناسی کو فلسفہ دانی پر ترجیح دی اُن کے قلم سے اس مسئلہ پر متعدد مضامین شائع ہوئے لیکن آج جس مضمون کے شائع کرنیکا فخر ہمیں حاصل ہی وہ محض ایک آرٹیکل نہیں بلکہ مستقل تصنیف

"تاریخ تصوف" کا ایک باب ہے جو باقاعدہ جامعہ میں شائع ہوگا۔

مدیر

عربی میں تصوف کی قدیم ترین موجود کتاب کا نام کتاب اللمع ہے۔ جس سے ہم روشناس ہو چکے۔
فارسی میں تصوف کی قدیم ترین موجود کتاب کشف المحجوب ہے۔ کتاب اللمع آج سے چند سال قبل دنیا
کے لیئے معدوم تھی، اور اب بھی مشرق کے لیئے اُس کا عدم، اس کے وجود سے کچھ ہی بہتر ہے۔
خوش قسمتی سے کشف المحجوب اس حجاب گمنامی میں نہیں۔ داتا گنج بخش لاہوری کا نام اکثروں کی
زبان پر ہے، بالائی ہند کے بہ کثرت گھرانے ان ذات کے ساتھ عقیدتمندی کے مسکن ہیں۔ لاہور میں
مدت ہوئی اصل فارسی نسخہ طبع ہو چکا ہے۔ اُر دو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ چند سال ہوئے
سینٹ پٹرسبرگ یونیورسٹی (روس) کے پروفیسر ژوکو دوسکی، کے زیر اہتمام کتاب یورپ میں
چھپنے والی تھی، ممکن ہے چھپ چکی ہو۔ یہ سب کچھ ہے تاہم استفادہ کرنے والوں کا حلقہ اب بھی محدود
ہے اور تصنیف و مصنف کے تعارف کرانے کی ضرورت باقی ہے۔

(۱) مصنف

مصنف علیہ الرحمۃ کا پورا اسم گرامی ابو الحسن علی بن عثمان بن علی الغزنوی الجلالی الہجویری
اللاہوری ہے۔ ہندوستان میں عرف عام داتا گنج بخش مشہور ہے وطن غزنین تھا۔ مضافات
غزنین میں ہجویر و جلاب دو قریہ ہیں۔ دونوں میں قیام رہا، آخر عمر میں لاہور میں سکونت اختیار
فرمائی تھی۔ یہیں انتقال کیا۔ اور یہیں مدفون ہوئے۔ اس ساری نقل و حرکت کے اظہار کے لیئے
نام کے ساتھ غزنوی۔ جلابی ہجویری لاہوری کا ضمیمہ لگا ہوا ہے۔
سید حسنی نے شجرۂ نسب بعض تذکروں میں یوں دیا ہے۔ علی بن سید عثمان بن سید علی
بن عبدالرحمن بن شاہ شجاع بن ابو الحسن علی بن حسن اصغر بن سید زید شہید بن امام حسن بن
علی مرتضیٰ۔ بیعت شیخ ابوالفضل بن حسن سے تھی۔ جو شیخ ابو الحسن حصری کے مرید تھے۔ شجرۂ
طریقت سید الطائفہ جنید بغدادی تک پہونچتا ہے۔ متعدد دیگر مشائخ کبار سے بھی استفادہ کیا تھا۔

کشف المحجوب میں جا بجا ان مشائخ کا ذکر کرتے ہیں۔ اور اپنے اور اُن کے تعلقات پر روشنی ڈالتے جاتے ہیں، مثلاً امام ابو العباس شقانی کے تذکرہ میں کہتے ہیں:۔

"مرا با وے اُنسے عظیم بود، و وی را بر من شفقت صادق، و اندر بعضے علوم اُستاد من بود"
(کشف المحجوب، مطبوعہ لاہور، ص ۱۲۱)

شیخ ابو القاسم گرگانی اور اپنے تعلقات کے تذکروں میں ایک عجیب واقعہ تحریر فرماتے ہیں:۔

"روزے من اندر پیش شیخ نشستہ بودم، و احوال ہا و نمودہائے خود را بر می شمردم، بہ حکم آنکہ روزگار خود بروے سرہ (؟) کنم، کہ ناقد وقت است، و وے بہ کرامتے آں از من می شنید و مرا نخوت کودگی و آتش جوانی بر گفتار آں حریص می کرد، و خاطر بے صورت می بست کہ مگر ایں پیر را در ابتدا در یں کوے گزرے نہ بودہ است کہ چندیں خضوع می کند اندر حق من ۔ دنیا زمی نماید۔ اندر باطن من آن بدید، و گفت اے دوست پدر (؟) بہ آنکہ ایں خضوع من نہ با ترا و حال تر است کہ محول احوال بر محل محال آید (؟) بلکہ ایں خضوع من محول احوال را می کنم، و ایں عام باشد مر ہمہ طلاب را نہ خاص ترا۔ چوں ایں بشنیدم از دست بیفتادم وے اندر من بدید، و گفت اے پسر آدمی را بدیں طریقت نسبت بیش ازاں نبود کہ چوں وے را بہ طریقت باز بندد۔ پندار یافت آں بگرداند تا چوں ازاں معزول کنند ش بہ عبارت پندارش برسد۔ پس نفی و اثبات نعقد وجود وے ہر دو پندار باشد، و آدمی ہرگز از بند پندار نرہد۔ وے را باید کہ درگاہ بندگی گیرد و جملہ نسبتہا را از خود دفع کند بجز نسبت مردمی و فرمانبرداری و از بعد آں مرا با وے اسرار بسیار بود اگر بہ اظہار آیات وے مشغول گردم از مقصود بمانم" (ایضاً، ص ۱۲۳)

ایک جگہ خواجہ ابو احمد مظفر سے اپنی ملاقات کا حال لکھا ہے، وہ بھی ارباب حال کے لیے اسی قدر دلچسپ ہے:۔

"روزے من اندر گرمائے گرم بہ نزدیک وے اندر آمدم با جامہ راہ و ژولیدہ موے مرا گفت یا ابا الحسن، ارادت حالے مرا گوے تا چیست۔ گفتم مرا سماع می باید۔ اندر حال کسی را فرستاد

تا قولے بیاورد وندہ جماعتے را از اہل عشرت۔ و آتش کودگی و قوت عادت و حرکت ابتداء مرا اندر سماع کلمات مضطرب کرد۔ چوں زشتے برآمد و سلطان دعلیان آں طاقت اندر من کمتر شد مرا گفت چگونہ بود مرترا بایں سماع گفتم ایہا الشیخ سخت خوش بودم گفت دستےبیاید کہ ایں و بانگ کلاغ ہر دو مرترا یکساں شود۔ قوت سماع تا آنگاہ بود کہ مشاہدہ نہ باشد۔ چوں مشاہدہ حاصل آید ولایت سمع ناچیز شود۔ ذکر دو، تا ایں را عادت نہ کنی، تا طبیعت نہ شود و بالریداں بمانی" (ایضاً ص ۱۲۳)

اسی طرح سلطان ابوسعید ابوالخیر، شیخ ابوالقاسم قشیری وغیرہ دیگر مشاہیر صوفیہ سے اپنی ملاقات کے تذکرے لکھے ہیں :-

حنفی المذہب تھے۔ امام ابوحنیفہ سے خاص عقیدت تھی۔ اُن کا نام "امام اماماں و مقتدائے سُنیاں، شرف فقہا، وعز علما" کی حیثیت سے لیا ہے، اور اُن کے کمالات کا بیان تفصیل سے کیا ہے (ص ۶۱)

اس ضمن میں اپنا ایک خواب بھی تحریر فرماتے ہیں، جس کا اقتباس لطف و نفع سے خالی نہ ہوگا۔ فرماتے ہیں۔ کہ

"میں ملک شام میں تھا۔ ایک مرتبہ حضرت بلالؓ (موذن) کے مزار کے سرہانے سو گیا۔ خواب میں دیکھتا ہوں، کہ مکہ میں حاضر ہوں، اور پیغمبر خدا صلعم باب بنی شیبہ سے اندر داخل ہو رہے ہیں۔ اور اس طرح کہ کوئی کسی بچہ کو گود میں لیے ہو، ایک مسن شخص کو اپنی گود میں لیے ہوئے ہیں۔ میں ڈرتا ہوا حضور میں پہونچا، پاے اقدس کو بوسہ دیا، اور دل میں سوچنے لگا، کہ یہ مرد مسن کون ہیں۔ حضور صلعم کو میرے مضطرب قلب پر اطلاع ہو گئی۔ ارشاد ہوا، کہ یہ شخص تیرا اور تیری قوم کا امام ہے یعنی ابوحنیفہ۔ اس سے مجھے اپنے اور اپنی قوم کے حق میں بہت کچھ امیدیں ہو گئیں۔ اور اس خواب سے مجھ پر یہ بھی منکشف ہو گیا کہ ابوحنیفہ ان لوگوں میں ہیں جو اپنے صفات ذاتی سے خالی ہو چکے ہیں، اور محض احکام شرع کے لئے باقی ہیں، اس لیے کہ اُن کے حامل رسول خدا صلعم تھے۔ اگر میں انھیں خود چلتے ہوئے

دیکھا تو معلوم ہوتا کہ وہ باقی الصفت ہیں۔ اور باقی الصفت کیلئے خطا و صواب دونوں کا امکان ہے لیکن چونکہ انھیں رسول خدا صلعم کی گود میں دیکھا اس سے معلوم ہوا کہ اُن کا وجود واقی فنا ہو چکا ہے اور اب جو اُن کا وجود قائم ہے وہ رسول خدا صلعم کے وجود سے قائم ہے اور چونکہ رسول خدا صلعم کے لئے کسی طرح کی خطا کا امکان نہیں اسلئے جس کا وجود اُن میں فانی ہو چکا ہے وہ بھی امکان خطا سے پاک ہے (ایضاً ص ۲۵۹)

سفر و سیاحت میں اکثر رہا کرتے تھے۔ شام سے لے کر ترکستان، اور ساحل سندھ سے لے کر بحر قزوین تک، یعنی اپنے زمانہ کی تقریباً ساری اسلامی مملکت کی سیاحی کا ذکر کیا ہے۔ آذربائیجان، بسطام، دمشق۔ رملہ۔ بیت، الیمن۔ طوس۔ تحنہ اور جبل السلام کے نام اپنے سفرناموں کے ذیل میں تعریف کے ساتھ لیے ہیں۔ ایک بتہ دوران قیام عراق میں معلوم ہوتا ہے کہ دولت بہت جمع ہو گئی تھی، اور اُس کے اسراف سے قرضداری کی نوبت آ گئی تھی۔ فرماتے ہیں:-

"وقتے من اندر دیار عراق اندر طلب دنیا و فنا کردن آں تاباکے می کردم (؟) و وام بسیار برآمدہ بود، شو بہ ہر کسے را کہ بایستے بشے (؟) رشے بہ من آوردہ بودند، و من دررنج حصول ہوائے شان ماندہ بودم" (ص ۲۶۵)

عرصہ تک پریشانی رہی۔ بالآخر ایک درویش کی موعظت کے اثر سے قراعت نصیب ہوئی۔ قید ازدواج سے غالباً ہمیشہ آزادی رہی۔ البتہ ایک مقام پر آپ بیتی یوں بیان کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید ایک بتہ کسی کے خدنگ نظر سے گھائل ہو گئے تھے، اور ایک سال تک اس زخم کی تڑپ نے بیتاب کر رکھا، بالآخر فضل ایزدی نے زخم کا مرہم بھی پیدا کر دیا عبارت اس قدر مبہم ہے کہ تفصیلات کا پتہ بالکل نہیں چلتا:-

"من کہ علی بن عثمان الجلابی ام از پس آنکہ مرا حق تعالےٰ یازدہ سال از آفت تزویج نگاہ داشتہ بود، ہم تقدیر کرد تا بفتنہ اندر افتادم۔ و ظاہر و باطنم اسیر صفتے یا شد کہ با من کردند (؟) بے آنکہ رویت بودہ، و یکسال مستغرق آن بودم چنانچہ نزدیک بود، کہ دین برمن تباہ شود۔

تا حق تعالے بہ کمال لطف و تمام فضل خود، عصمت را بہ استقبال دل بیچارہ من فرستاد، و بہ رحمت خلاصی ارزانی داشت" (ص ۲۸۵)

استعداد علمی کی تفصیل کسی تذکرہ میں درج نہیں۔ لیکن کشف المحجوب کی تصنیف خود اس امر کا واضح ثبوت ہے، کہ اُس کا مصنف علوم ظاہری میں تبحر رکھتا ہے بعض تذکروں میں اجمالاً صرف اس قدر ہے "جامع بود میاں علوم ظاہر و باطن" اور یہ یقیناً صحیح ہے۔

بعض تذکروں میں ہے، کہ لاہور اپنے مرشد کے حکم سے آئے۔ اور حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیائؒ کے ایک ملفوظ میں تو ورود لاہور کی تفصیل بھی ملتی ہے۔ فوائد الفواد میں ہے کہ شیخ علی ہجویریؒ و شیخ حسین زنجانیؒ دونوں ایک ہی مرشد سے بیعت رکھتے تھے۔ شیخ حسین زنجانیؒ عرصہ سے لاہور میں سکونت رکھتے تھے۔ ایک روز شیخ علی ہجویری کو مرشد کا حکم ملا کہ لاہور میں سکونت اختیار کرو۔ عرض کیا کہ وہاں تو شیخ حسین پیشتر سے موجود ہیں" مکرر ارشاد ہوا کہ "تم جاؤ"۔ تعمیل کی۔ شب میں لاہور پہونچے، اُسی شب میں شیخ حسین نے انتقال فرمایا، اور صبح اُن کا جنازہ اُٹھایا گیا[۵]۔ ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ لاہور کو مرشد کے حکم سے اپنا مسکن بنایا تھا۔ لیکن خود کشف المحجوب کی ایک عبارت سے کچھ ایسا مترشح ہوتا ہے، کہ لاہور کا قیام مرضی کے خلاف کسی مجبوری سے تھا۔ فرماتے ہیں، کہ

"کتب من بہ حضرت غزنین ماندہ بود و من در دیار ہند در بلدہ لاہور کہ از مضافات ملتان است درمیان ناجنسان گرفتار شدہ بودم (ص ۶۹)	میری کتابیں غزنین میں چھوٹ گئی ہیں اور میں ہندوستان میں شہر لاہور میں ناجنسوں کے درمیان گرفتار ہوں۔

اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا کہ "گرفتاری" کا لفظ فقرہ بالا میں مجازاً استعمال کیا ہے، یا واقعۃً۔

عام لقب گنج بخش مشہور ہے، اس کی بابت یہ روایت ہے کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اجمیریؒ نے آپ کے مزار پر آکر چلہ کیا، اور اکتساب فیوض و برکات کے بعد جب رخصت ہونے لگے تو

---

[۵] فوائد الفواد، مرتبہ امیر حسن علاء سنجریؒ، ص ۳۵ (مطبوعہ نولکشور)

مزار کے رخ کھڑے ہو کر یہ شعر پڑھا ہے

گنج بخش ہر دو عالم مظہر نور خدا   کاملاں را پیر کامل ناقصاں را رہنما

اس وقت سے گنج بخش کا لفظ عام زبانوں پر چڑھ گیا[۱]

سنہ وفات کے متعلق اختلاف ہے۔ صاحب نفحات الانس خاموش ہیں۔ صاحب سفینۃ الاولیاء نے دو روایتیں دی ہیں۔ ایک ۴۵۶ھ اور دوسری ۴۶۴ھ کی بابت[۲] آزاد بلگرامی نے ایک ضمنی موقع پر ۴۶۵ھ درج کیا ہے[۳] نکلسن کا قیاس ہے کہ ۴۶۵ھ و ۴۶۹ھ کے درمیان وفات ہوئی[۴] مزار پر جو قطعہ تاریخ کندہ ہے اس سے بھی ۴۶۵ھ ہی نکلتا ہے۔ راقم سطور کے نزدیک بھی اسی کو صحیح ماننا چاہیئے۔ مزار شہر لاہور کے باہر سمت غرب میں واقع ہے۔ ہر جمعرات و جمعہ کو زایروں اور حاجتمندوں کا ہجوم رہتا ہے۔ عام عقیدہ یہ ہے کہ چالیس روز متصل، یا چالیس شبہائے جمعہ کو طواف مزار کرنے سے ہر مشکل آسان اور ہر حاجت روا ہو جاتی ہے[۵]

اس قدر یقینی ہے کہ تصوف پر متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ لیکن آج ان تصانیف کا وجود تو الگ ہے رہا، ان کے نام تک کسی تذکرہ میں محفوظ نہیں۔ صاحب سفینۃ الاولیا راس سے زاید نہ لکھ سکے کہ

"حضرت پیر علی ہجویری را تصانیف بسیار است"

البتہ خود کشف المحجوب میں مصنف نے جابجا اپنی دوسری تصانیف کے حوالے دیئے ہیں۔ ان عبارتوں کے یکجا کرنے سے تصانیف ذیل کا پتہ چلتا ہے ممکن ہے کہ ان کے علاوہ کچھ اور بھی ہوں۔ اس قدر تو بہر حال قطعی ہیں :۔

نام کتاب	عبارت کشف المحجوب
۱۔ دیوان	یکے آنکہ دیوان شعرم کسے بہ خواست (ص۱)

---

[۱] خزینۃ الاصفیاء، غلام سرور لاہوری، جلد دوم ص۲۳۲ [۲] سفینۃ الاولیاء ص۱۶۵

[۳] مآثر الکرام ص۱ (نسخہ شائع کردہ عبد اللہ خاں، حیدر آباد دکن) [۴] مقدمہ ترجمہ انگریزی کشف المحجوب

[۵] سفینۃ الاولیاء ص۱۶۵

۲۔ منہاج الدین "دیگر کتابے تالیف کردم اندر طریق تصوف، نام آں منہاج الدین (ص۔) نیز "پیش ازیں کتابے ساختہ ام مرآں را منہاج الدین نام کردہ اندر وے مناقب [اہل صفہ] یک یک بہ تفصیل آوردہ" (ص۔)
نیز "اندر کتابے کہ کردہ ام بجز ایں منہاج نام" (ص۱۱۱)

۳۔ کتاب الفنا والبقا "ماز ایں جنس سخن است اندر کتاب فنا و بقا" (ص۔)

۴۔ اسرار الخرق والمؤنات "مرا اندریں باب کتابے ست مفرد کہ نام آں اسرار الخرق والمؤنات است" (ص۳)

۵۔ کتاب البیان لاہل العیان ."من اندریں معنی تا حال ہدایت کتابے ساختہ ام و آں را کتاب البیان لاہل العیا نام کردہ شد (ص۱۹۵)

۶۔ بحر القلوب "اندر بحر القلوب اندر باب جمع فصولے گفتہ ام" (ص۱۹۵)

۷۔ الرعایۃ لحقوق اللہ "طالب ایں علم را ایں مسئلہ از کتاب دیگر باید طلبید کہ کردہ ام، وآں را الرعایۃ لحقوق اللہ نام کردہ" (ص۲۱۱)

ذیل کی عبارتوں میں دو کتابوں کے حوالے اور آتے ہیں، خدا معلوم ان سے مراد کتب بالا ہی ہیں، یا یہ تصانیف ان کے علاوہ ہیں۔ نکلسن کا خیال ہے کہ یہ علیحدہ تصانیف ہیں۔ اس حساب سے دو کتابوں کا اور اضافہ سمجھنا چاہیئے۔

۸ ۔ "پیش ازیں اندر شرح کلام وے [منصور حلاج] کتابے ساختہ ام" (ص۱۱۱)

۹ "من اندر بیان ایں (ایمان) کتابے کردہ جداگانہ (ص۲۱۵)

آج یہ سب کتابیں عنقا ہیں۔

مخدوم موصوف علیہ الرحمۃ کے مرتبہ کمال کا اعتراف سب کو رہا ہے۔ خواجہ خواجگان حضرت معین الدین چشتی اجمیریؒ اور شیخ المشائخ حضرت بابا فرید گنج شکرؒ جیسے مسلم اکابر نے آپ کے مزار پر چلے کھینچے ہیں، اور فیوض و برکات حاصل کئے ہیں۔ باقی آیندہ

"نامۂ جوہر"

(۱)

بزرگانِ قوم کی بعض خصوصیات جو دلیلِ بزرگی اور وجہ عظمت ہیں قوم کے سامنے اُن کی حیات میں نہیں آتی ہیں یہی سبب ہے کہ اکثر اکابر ملت کی زندگی میں ان کے کارناموں کا صرف ایک ہی رُخ نظر آتا ہے اور موت کے بعد لوگوں کو جستجو ہوتی ہے کہ کسی طرح اس بزرگ کی زندگی کے متعلق جس قدر معلومات حاصل ہوسکے فراہم ہو جائے۔ مکتوبات شائع کیے جاتے ہیں، احباب و رفقا کی یادداشتوں سے کام لیا جاتا ہے تصنیفات اور تالیفات کی اشاعت کی فکر ہوتی ہے لیکن جن بزرگوں کی حیات میں علاوہ دیگر کارناموں کے متعلق اس قسم کی معلومات بھی فراہم ہو جائے تو اس کو اُن کی اور قوم دونوں کی خوش قسمتی سمجھنا چاہیئے، اُنکی اسلئے کہ اُنکی زندگی کے متعلق غلط فہمی کی گنجائش نہیں رہتی اور قوم کی اسلئے کہ وہ اُن سے زیادہ فائدہ اُٹھاسکتی ہے۔"

"ہم اس مکتوب گرامی کی اشاعت اپنے مکرم جناب عبدالماجد صاحب بی۔ اے کی عنایت سے کر رہے ہیں اور امید ہے کہ یہ سلسلہ کچھ دنوں جاری رہے گا۔" مدیر

چھندواڑہ ۱۶ اگست ۱۹۱۶ء

مکرمی۔ السلام علیکم۔ عنایت نامہ مورخہ ۷ اگست چند روز ہوئے ملا۔ مجھے تو خوف تھا کہ کہیں آپ میری تنقید سے ناراض نہ ہو جائیں[۱] مگر نیت بخیر تھی اور جانبین کو صرف اصلاح مطلوب تھی نہ کہ

[۱] مکتوب الیہ کا انگریزی رسالہ سائیکالوجی آف لیڈرشپ ۱۹۱۵ء کے آخر میں انگلستان میں شائع ہوا ہے، جون ۱۹۱۶ء میں حضرت جوہر کی نظر سے زمانۂ نظربندی چھندواڑہ میں گزرا ہے، اور اُنھوں نے اس پر ایک مبسوط اور پُرزور تنقید اپنے عنایت نامہ میں لکھ کر مصنف کو بھیجی ہے، جس میں زیادہ تر گرفتیں مذہبی نقطۂ نظر سے ہیں۔ مکتوب الیہ نے اس کے لیے شکریہ لکھ کر بھیجا ہے، اور ضمناً بعض مسائل کی مزید توضیح کی ہے۔ یہ مکتوب گرامی اسی کے جواب میں ہے، اس کے قبل کے عنایت نامہ افسوس ہے کہ انگریزی زبان میں ہیں، مکتوب الیہ کے پاس ابتک محفوظ ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ ترجمہ میں ان کا پورا لطف باقی نہیں رہ سکتا۔

افساد اس لیے میرا خیال صحیح نکلا کہ آپ کو ایک سچی اور دلسوزی کی تنقید محض تقلیدی تعریف و
توصیف سے زیادہ پسند ہوگی۔ عریضہ نہایت ہی مفصل تھا مگر پھر بھی اگر ہم دونوں ساتھ ہوتے
تو جزئیات کے متعلق بھی بہت کچھ عرض کر سکتا اس زمانہ میں استبداد و استعباد نے جن کا آپ نے
ذکر کیا ہے دو لفظ گھڑ لئے ہیں، (Construotive او Destruotive یا تعمیری و تخریبی) اور اس میں سے
مؤخر الذکر کو تو ہر سچی تنقید کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اور مقدم الذکر کو اُس عنقا صفت تنقید کے لئے
سینت کر رکھا ہے جو آج تک نہ آنکھوں نے دیکھا نہ کبھی کانوں نے سُنا اور جو نہ کسی متنفس کے دل و دماغ
میں کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی جاگزیں ہوا حالانکہ اگر فن نقادی کو صحیح طور پر دیکھا جائے تو اس کا
اولین فرض ہوتا ہے کہ اس قصر سر بفلک کی تعمیر کے لیے جس کا نقشہ اس کے تصور ہی میں ہوتا ہے
(یا کہیں کہیں کسی شاعر یا فلسفی یا ادیب کے کلام میں بھی کوئی محراب یا گنبد نظر آجاتا ہے) زمین کو صاف
کرے اور آس پاس کے بوسیدہ مکانات بدنما جھونپڑے اور تنگ و تاریک بے قاعدہ گلیاں
وہاں سے دور کر دے بہر حال تعمیر سے پہلے تخریب بھی بہت کرنا ہی پڑتی ہے اگر استبداد کے عام
اعتراض میں کوئی اصلیت ہے تو محض اس قدر کہ تخریب صرف تخریب کی غرض سے نہ ہو بلکہ تعمیر کا
پیش خیمہ ہو سو میں نے جو کچھ بھی لکھا اسی غرض سے لکھا تھا کہ جب کبھی نظر ثانی کا موقع آئے تو آخری
فیصلہ کرتے وقت میرے پراگندہ خیالات میں سے جو ضروری اور مفید معلوم ہوں پیش نظر رکھے جائیں،

پیغمبر اسلام (روحی فداک یا رسول اللہ) کے متعلق ظاہر ہے کہ آپ ان کو اتنا بڑا پیشوا مانتے
ہیں اور کتاب کے ہر پڑھنے والے سے بھی منوانا چاہتے ہیں جتنا کہ کوئی پیشوا ہو گزرا ہو جن کی نظیر
کتاب میں موجود ہے[۱] ورنہ ایک مسلمان کو کچھ بھی ضرورت نہ تھی کہ جہاں نپولین وغیرہ کا موازنہ کیا گیا
ہو وہاں ذکر حبیب خدا صلی اللہ علیہ وسلم بھی کیا جائے آج کل کی سیاست بین الاقوامی کی اصلاح

---

[۱] کتاب مذکور میں جہاں جہاں قایدین عظام یعنی بڑے بڑے لیڈروں کی مثالیں درج کی گئی تھیں، وہاں مصنف نے
اپنی جہالت سے حضور سرورِ عالم صلعم کا اسم پاک بھی درج کیا تھا اور اگرچہ حضورؐ کی ذات گرامی کو سب سے افضل قرار دیا
گیا تھا، تاہم اسی طبقہ میں نپولین، سکندر، وغیرہ دنیوی سرداروں کا بھی ذکر تھا۔

میں آپ کا "غیر طرفدار" رہنا بھی ایک ایسی کتاب کے لکھنے میں جسے ہر ملت و مذہب الا پڑھے قرین مصلحت تھا میں نے اس خیال (Conception) پر ہرگز اعتراض نہیں کیا ہے اگر اعتراض ہے تو محض طرز عمل (Executiv) پر۔ اب چونکہ خود آپ کی تحریر سے واضح ہو گیا کہ آپ ہی چاہتے تھے جو میں سمجھا تھا کہ آپ چاہتے ہونگے اس لئے میری تنقید کی نوعیت بھی واضح تر ہو گئی اور وہ اسی طرح باقی ہے یعنی ایک عام پڑھنے والے پر آپ کے الفاظ اور جملوں کا اور نیز ان موقعوں کا جن پر تذکرۂ آنحضرت صلعم کیا گیا ہے ایک حد تک ضرور یہ اثر پڑتا ہے کہ وہ بار بار غور کرے کہ کہیں آپ آنحضرت صلعم کو مارگولیتھ (یہ میری بدنصیبی تھی کہ آکسفورڈ میں جب میرا ارادہ تحقیق (Research) کی ڈگری لینے کا تھا تو یہ میرے رہنما مقرر کئے گئے تھے اس کے علاوہ پیشتر بھی کچھ عربی ان سے پڑھی تھی) وغیرہ کی طرح ایک چلتا ہوا لیڈر تو ثابت نہیں کرنا چاہتے۔ چونکہ یہ کام آپ کا نہ مفہوم ہو سکتا تھا نہ ہے اس لئے میری یہ توقع بھی بیجا نہیں کہ آپ اپنی تصنیف کو ایک بار اس شبہ کو دل میں جگہ دے کر پڑھیں کہ مصنف کوئی غیر مذہب الا ہے جو مسلمانوں کو یا کم از کم غیر مسلموں کو تو ضلالت کی طرف آہستہ آہستہ لے جانا چاہتا ہے تاکہ وہ عظمت جو ایک وحی پانے والے رسولؐ کی ان کے دل میں ہے وہ دور ہو جائے اور اس طرح دور ہو کہ خود پڑھنے والوں کو بھی اس تبدیلیٔ خیالات کا احساس نہ ہونے پائے اور اس لئے بطور ایک "بئس البدل" کے خلعت نبوت اتار کر لیڈری کی گون (Gown) پہنا دی ہے یہ ہرگز آپ کا خیال نہ تھا نہ ہے نہ ہو سکتا ہے مگر جس طرح سے حساب میں بچے اپنے سوالوں کے جوابات کی جانچ کرتے ہیں کہ تقسیم کا ہے تو ضرب دے کر دیکھتے ہیں اور تفریق کا ہے تو جمع کر کے اسی طرح ایک پڑھنے والے کے جذبات اور اس کے دل پر جو اثرات پیدا ہو سکتے ہیں ان کا اندازہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ اس سلسلۂ تاثر کو الٹ دیا جائے اور جو تنقید کہ ایک نقاد پیش کرتا ہو اس کو صحیح تسلیم کر کے اور جو اثر کہ آخر کار پڑھنے والوں کے دل پر بقول اس کے پڑنا ممکن یا اغلب ہو اسے قبول کر کے پھر کتاب کو پڑھا جائے اور دیکھا جائے کہ جو نقوش پڑھنے سے پیشتر ہی دل پر منقش ہو گئے تھے باقی رہتے ہیں یا مٹ جاتے ہیں یہ بھی یاد رہے کہ گھڑی ساز جو گھڑی کے کسی ٹوٹے ہوئے پرزے کو

سنبھالنا چاہتا تو خوردبین شیشہ لگا لیتا ہی جس سے نقص اصلیت سے کہیں بڑا معلوم ہوتا ہی یہ اس غرض سے کہ باریک سے باریک نقص بھی صاف نظر آجائے اور اصلاح کی جاسکے اچھے سے اچھا نقاد بھی اکثر اسی غرض سے مبالغہ سے کام لیتا ہی اور عوام سے کہیں زیادہ اُسے لطیف اور باریک بین بننا پڑتا ہی چونکہ غرض اصلاح ہی نہ کہ افساد اس لیئے یہ بال کی کھال نکالنا اُس کے لیئے جائز ہی نہیں سمجھنا چاہیئے بلکہ اس کے لیئے اصرار کرنا چاہیئے اسی وجہ سے میں نے بھی اس تنقید میں مبالغہ سے کام لیا ہی اور مصر ہوں کہ آپ خود اس سے بھی زیادہ مبالغہ سے کام لیں جوہری جب نگین تراشنے میں مصروف ہوتا ہی تو زیادہ وقت اس کا اس تراش خراش میں صرف نہیں ہوتا جو عوام کو نظر آسکے بلکہ ایسے باریک اصلاح میں جس کا نظر آنا تقریباً ناممکن ہی اور جو کچھ وہ گھنٹوں کی محنت میں تراشتا ہی وہ نہایت باریک خاک کے چند ذرے ہوتے ہیں جو تراشتے تراشتے ہی ہوا سے اُڑتی ہی مصنف کسی طرح جوہر فروش سے کم نہیں اور اس سے زیادہ باریک بین نقاد اُس کی تصنیف کا اور کوئی نہ ہونا چاہیئے فلسفۂ اجتماع[1] کب تیار ہوئی؟ افسوس ہی کہ انجمن ترقی اردو اپنی طرف سے شائع کردہ کتابوں کا کافی اشتہار نہیں دیتی اُسے چاہیئے کہ اگر کسی کتاب پر ایک ہزار روپیہ صرف کرے تو کم از کم ۲۵۰ روپیہ اس کے متعلق اشتہاروں پر بھی صرف کرے۔ اخبار والے اُس کے ساتھ ضرور رعایت کریں گے میں نے خود ہمدرد میں یہی کیا تھا مگر خود انجمن کے کارکن اس معاملہ میں تساہل برتتے تھے آپ بیسویں صدی کی اس ضرورت اور Psychology of the Advertise پر عبدالحق صاحب کو ضرور کچھ لکھنے۔

نفسیات القرآن[2] پر آپ نے جو لکھنے کا ارادہ ظاہر کیا ہی اُس کے متعلق کیا پوچھ سکتا ہوں کہ

---

[1] مکتوب الیہ کی اردو کتاب کا نام ہی جو اسی قسم کی مزخرفات سے لبریز تھی اور جس کی اشاعت اب اس نے دو تین سال سے روک دی ہی۔

[2] مکتوب الیہ کا ارادہ اُس وقت انگریزی میں ایک دوسری کتاب Psychology of the Quran کرنے کا تھا بلکہ اس کا ابتدائی حصہ تحریر بھی ہو چکا تھا۔

کلام کا "نقشہ" اور "تخمینہ" (بہ اصلاح تعمیرات) کیا ہے میں جانتا ہوں کہ آپ مجھ سے ناراض ہونگے زیادہ سے زیادہ ایک سیاسی ریڈیکل کے جسم میں ایک مذہبی دقیانوسی کی روح رکھنے والا سمجھیں گے اگر میں عرض کروں کہ بقول حالی؀ "یاں جنبشِ لب، خارج از آہنگ خطا ہے" جو کچھ بھی لکھا جائے وہ یہ سمجھ کر کہ یہ کسی انسان کا کلام نہیں۔ محاورہ انسانی ہے مگر اس کی تمام Psychology خلاق زمین آسمان کی ہے غالباً آپ نفسیات القرآن سے یہ ثابت کرنا چاہیں کہ بڑے سے بڑا Psychologist بھی اس طرح انسانی نفسیات کے اسرار و نکات سے نہ واقف ہو سکتا ہے نہ اُن کے اظہار کیلئے الفاظ اور ترکیبیں اور فقرے کسی زبان میں پا سکتا ہے جس طرح خود اُس ذات پاک نے قرآن کریم میں ظاہر فرما دیا عَالِمُ الْغَیْبِ وَالشَّھَادَۃِ اور انسان کا پیدا کرنے والا ہے اگر آپ کا یہ خیال ہے تو میدان نہایت وسیع ہے مگر رہرو کو ہر قدم پھونک پھونک کر اُٹھانا پڑتا ہے، میں ہرگز اُن لوگوں کے طرفداروں میں نہیں ہوں جو کلام ربانی سے اس قدر خائف ہو جائیں کہ نہ اُسے کبھی سمجھ کر پڑھنے کی کوشش کریں نہ اس کے متعلق کچھ سوچیں نہ پوچھیں لکھیں، کلام پاک ریشم کے جزدانوں میں اور الماری کے بالاترین حصوں میں اور وہاں کی گرد و غبار کے لیئے آسمان سے نازل نہیں ہوا تھا میں چاہتا ہوں کہ قرآن پاک کا ہر ایک نسخہ اس کثرت سے مستعمل ہو کہ پنسل کے نشان۔ کاغذ کی پٹیاں بین الاوراق یہاں تک کہ انگوٹھے اور انگلیوں کے نشان ہر جگہ نظر آئیں اور ثابت کر دیں کہ اس کتاب سے زیادہ اس کے ماننے والے کسی کتاب کو نہیں پڑھتے نہ اس سے زیادہ کسی کتاب کے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں مگر مجھے اُن لوگوں سے ہمدردی ضرور ہے جو قرآن کو نہایت احتیاط و اہتمام کے ساتھ چھوتے ہیں گو برس دو برس میں ایک ہی دفعہ کیوں نہو، یہ اُمُّ الکتاب ہے اور اس کا ادب باقی رکھنا اس لیے لازم ہے کہ اگر اتنی احتیاط نہ برتی جائے تو تحریف کا اندیشہ ہے اور تمام صحف ماقبل اس خطرہ کے بیجا ہونے کا کافی سے زیادہ اور سخت ہولناک شبوت ہیں اس لیئے ایک صاحب نے جب ایک ترجمہ بلا متن میرے پاس ریویو کے لیئے بھیجا تو میں نے انھیں اطلاع دے دی کہ مجھے ہندوستان کی ترجمہ کی ضرورت نہیں ہے کیا مسلمانوں کے لیے یہ بات مایۂ ناز نہیں کہ تیرہ سو برس سے زیادہ عرصہ گزر گیا مگر مسلمانوں نے اس اُمُّ الکتاب

کو اس احتیاط سے رکھا کہ آج تک ایک لفظ یا حرف تو کجا ایک زیر زبر کا بھی فرق نہیں ہونے پایا اور تمام فرقے اس پر اتفاق کلی کرتے ہیں قرآن پاک تو قرآن پاک دوسرے صحائف ہمارے کتب حدیث کی تحقیق و تدقیق اور صحت و حفاظت کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتے قصہ مختصر مجھے اُمید ہی کہ جو کچھ بھی آپ لکھیں گے وہ اب قرآن کو ہر طرح ملحوظ رکھیں گے مگر لکھئے ضرور اس سے ہرگز نہ خائف ہو جیئے یہ تو ایسی سیدھی سادی کتاب (غیر ذی عوج) ہی کہ عرب کے گنوار مدینۂ منوّرہ جاتے اور نبی اکرمؐ سے اسے سُنتے اور ہم سے کہیں زیادہ سچے مسلمان بن کر اپنے بالوں والے خیموں اور اپنے ریگستان اور گلّوں میں واپس آجاتے مفسرین کا جہاں شکریہ ادا کرنا ہی وہاں یہ شکایت بھی باقی ہی کہ باوجود سچی محبت اور احترام کے اُنھوں نے بھی ایک حساب داب قرآن پاک قائم نہ رکھا جو کچھ لکھا وہ زیادہ تر اس نیت سے کہ اپنا کمال تمام اس صحیفۂ اکرم پر صرف کر دیں مگر بعض اوقات یہ بھول گئے کہ کہیں حاشیہ متن کو اپنے بوجھ اور پھیلاؤ سے چھپا اور دبا نہ لے یہی حال شیکسپیر کے جرمن شارحین کا ہی ان کا ساری دُنیا پر احسان ضرور ہی کہ شیکسپیر کو خود اس کے ہموطنوں کے تغافل سے نجات دی مگر اب تو بعض نے شیکسپیر کو محض اپنی مضمون آفرینی کا آلہ بنا لیا ہی خدا مسلمانوں کو قرآن پاک متعلق اس شر سے بچائے[۱] آمین۔

"آپ میری شاعری کا کیا پوچھتے ہیں۔ بچپن میں تو بہت سے سامان ایسے بہم ہو گئے تھے کہ میں آج زلف و ابرو کی تعریف میں خاصے شعر نکال لیا کرتا رام پور میں اُس زمانہ میں پیدا ہوا تھا۔ جب گھر گھر مشاعرہ ہوتا تھا، داغ، امیر، تسلیم، جلال، عروج، دہلی اور لکھنؤ کے آسمانوں کے ٹوٹے ہوئے ستارے سب رام پور کے آسمان سے نور افشانی کر رہے تھے، خود میرے خاندان میں بھی شعر گوئی کا ذوق ہوا تین چار عزیز اُستاد داغ کے شاگرد ہوئے جن میں ایک میرے حقیقی بھائی ذوالفقار علی خاں صاحب گوہر اور میرے چچا زاد بھائی اور خسر عظمت علی خاں صاحب

---

[۱] ان اشارات و مواعظ عالیہ کی قدر مکتوب الیہ کو ان کے وقت تحریر سے ۲ - ۲ سال بعد جا کر ہوئی۔

اور ان کے بھائی حافظ احمد علی صاحب شوق شامل تھے گھر پر بار ہا مشاعرہ ہوا، پھر داغ کو نواب کلب علی خاں صاحب مرحوم نے جن کی نظر ہمیشہ کفایت شعاری پر رہتی تھی از راہ پرورش سرکاری اصطبل کا داروغہ بھی کر دیا تھا، تاکہ وظیفہ محض کار بیکاران کی مد نہ ہو، یہ میرے مکان کے عقب میں تھا، اس لئے روزان کی زیارت یوں ہی ہو جاتی تھی، اور اب اس بذلہ سنج کے شعر کا لطف اٹھاتا ہوں۔ جس نے داغ کے اس تقرر پر کہا تھا (ممکن ہے کہ تاریخ بھی ہو) کہ

آیا دہلی سے ایک مشکی خر ۔ آتے ہی اصطبل میں داغ ہوا، داغ کی غزل بہ کیجئے ہے

آج رخصت جہاں سے داغ ہوا ۔ خانۂ عشق بے چراغ ہوا

اس پر مستزاد یہ کہ ذوالفقار روزانہ داغ کے گھر جاتے تھے جو ہمارے مکان سے دور نہ تھا، اور مجھے بھی لے جاتے تھے۔

داغ نے پہلے دن پوچھا کہ کچھ شعر بھی یاد ہیں میری عمر بہت ہی کم تھی، مگر بھائی نے کچھ شعر یاد کرا دیئے تھے، جنھیں میں نہایت زور اور شان سے کڑک کر پڑھا کرتا تھا، میں نے داغ ہی کے چند شعر انھیں سنا دیئے سن کر پھڑک اٹھے۔ اور اس کے بعد ہمیشہ اصرار رہا، کہ اس بچہ کو ضرور لایا کرو۔ جناب والا اس کے بعد اگر میں یہ دعویٰ کروں۔ کہ شعر و سخن کی گود میں پلا ہوں۔ تو بیجا نہ ہوگا۔ مگر میرا دعویٰ تو اس سے بھی بڑھ چڑھ کر ہے، سنیئے، میں نہ صرف شعر و سخن کی گود میں پلا ہوں۔ بلکہ اسی کو ذیر کو دا ہوں۔ اسے ہاتھی بنا کر پیٹھ پر سوار ہوا ہوں۔ غرض کوئی بے ادبی یا گستاخی باقی نہیں رہی ہے جو میں نے شعر و سخن کی شان میں نہ کی ہو۔

میری پیدائش ۱۸۸۲ء کے اواخر کی ہے۔ میں نے دس برس ہی کی عمر میں بہت سے لغو و فضول شعر مگر بامعنی اور موزوں کہے تھے اور اچھا ہوا کہ اب کسی کو یاد نہیں ورنہ جب میرے Official Biography (یعنی گورنمنٹ کی طرف سے نہیں بلکہ بقول آپ کے میری امت کی طرف سے) لکھنے کا وقت آتا۔ تو میرے سیرۃ نگار کو سخت مشکل کا سامنا ہوتا کہ اس لچر پوچ کو ردی (۱)

بلکہ آتشدان کے نذر کیا جائے۔ یا سیرۃ چھپوائے تو وہ قوم و ملک میں چھوڑ دی جائے، ہمدرد کے سرپرست دجن کا چند ماہ کے بعد ہی انتقال یکایک ہو گیا) تو ہمدرد میں سے ایک چڑیا چڑوسنٹے کی کہانی کو بھی (جو محض امتحاناً درج کی گئی تھی) خارج کر دیا تھا اور اعتراض کیا گیا تو کہا کہ بھائی ہو تو چڑیا چڑوسنٹے ہی کی کہانی اور مطلب بھی صاف معلوم ہوتا ہے۔ مگر ہمدرد والوں سے ڈر ہی لگتا ہے۔ اور ہردئی کا معاملہ ہے، نہ معلوم اس میں بھی کچھ زہر بھر دیا ہو، اور جوابدہی ہمارے سر آپڑے۔

آپ نفسیات کے ماہر ہیں، کیا ممکن نہیں کہ میرا ایجنے والا سیرۃ نگار باوجود نقادِ سخن ہونے کے محض بطل پرستی کے باعث یہ خیال کرنے لگتا۔ کہ نہ معلوم کیا کیا اسرار اس بظاہر لچر پوچ میں پوشیدہ ہیں۔ اور آنے والی نسلیں ممکن ہے کہ اس سے بھی زیادہ روشن ضمیر ہوں اور اُن اسرار سے واقف ہو کر دنیا کو نئے نئے معلومات اور عجیب عجیب انکشافات سے مالا مال کر دیں۔ اس لئے بہتر ہے کہ انہیں داخل ہی کر دو۔ اور اسی طرح ہمیشہ کے لئے میری پوچ گوئی باقی رہتی اور قیامت کے دن اُستاد داغ میرا دامن پکڑتے کہ خود بھی بدنام ہوئے اور ہمیں بھی بدنام کیا۔ خیر اب سُنئے کہ گیارہ برس کی عمر میں علیگڑھ گیا۔ ایک بڑے بھائی نے میری موزوں گوئی کا ذکر مولانا شبلی مرحوم سے کیا۔ دوسرے نے میرے حافظہ کی تعریف کی کہ "المامون میز پر رکھا تھا۔ اُٹھا کر پڑھنے لگا اور ایک دن میں نے امین کے قتل پر جو مرثیہ ہے۔ اُس کا ایک شعر عربی کا پڑھا۔ تو اُس کا مجھے ترجمہ سُنا دیا۔ حالانکہ عربی سے بالکل ناواقف ہے" مولانا کو یقین نہ آیا۔ اور امتحان کی غرض سے ہم بلائے گئے پہلے مامون کی اولاد کی فہرست مانگی۔ پھر اُس کا حلیہ پوچھا۔ جب اس میں پاس ہو گئے تو ایک مصرعۂ طرح اُسی وقت دیا۔ اور کہا کہ شعر لکھو۔ چیزے از قسم لچر پوچ اُسی وقت تیار ہو گئی۔ میرا خیال ہے کہ مولانا مرحوم پر تو جو سکہ بیٹھ گیا تھا وہ اسی لچر پوچ کا تھا۔ میں اسکول ہی میں تھا کہ ایک نظم انعامی میں نے بھی لکھی۔ اور مولانا حکم ٹھہرے۔ انعام تو ایک کہنہ مشق بزرگ کو ملا۔ مگر ہمارے لچر گوئی کا بھی خاصہ شہرہ ہوا۔ اکثر ایسا ہوا کہ ذوالفقار بھائی نے کوئی نظم لکھ دی۔ اور ہم نے اپنی طرف سے پڑھ دی۔ مگر جب عمر ذرا زیادہ ہوئی۔ تو امتحانوں نے فرصت نہ دی۔ کالج میں

البتہ آخری سال سجاد حیدر کی صحبت میں شعر و سخن کا چرچا رہا۔ پہلے بھی جب ہم لوگ انٹرنس میں تھے تو ایک نظم تین شعرائے باکمال نے حاجی اسمٰعیل خاں صاحب (تربیت الدجاج و یونین جیک والے) کی دعوت کے شکریہ میں تیار کی تھی' ان میں سے ایک یہ خاکسار تھا۔ ایک سجاد حیدر صاحب اور ایک سید وزیر حسین صاحب' آنریبل و آزموده کار سکرٹری مسلم لیگ کے برادر "اصغر" خیر ایک سال آخری کالج میں خوب گزر گیا۔ اور وہ مشاعرہ جسے بعدہٗ حسرت نے رونق بخشی ہم لوگوں ہی کا ایجاد کردہ تھا۔ چودھویں کو ہوا کرتا تھا۔ اور شمع پیش نہ کی جاتی تھی' کرکٹ کا لان جائے مشاعرہ تھا۔ ایک بار چودھویں کو بارش ہو گئی تو تین چار دن مطلع صاف ہونے کی راہ دیکھ کر ڈائننگ ہال میں کیا گیا۔ اس وقت میں نے اپنی ایک غیر طرح میں اس شعر کا بھی اضافہ کر دیا ؎

لطف مشاعرہ تو گیا چودھویں کے ساتھ　　　فرش زمردیں نہیں وہ چاندنی نہیں

علی گڑھ کالج میں شاعری تو کچھ کی مگر وہی فرضی معشوق۔ اگر کچھ اصلیت تھی بھی تو اتنی ہی جتنی ایران کی شاعری کو اور "سبزۂ خط" وغیرہ کو ایک حد تک بامعنی کر دیتی ہے۔ کالج چھوڑا تو ولایت جانا ہوا یہاں البتہ شاہدان اصلی کی کمی نہ تھی۔ مگر ذوق نظارۂ جمال لاکھ سہی اور گرہ میں مال بھی سہی تاہم طبیعت کا میلان خلاف دستور عام زہد و تورع کی طرف تھا۔ دو برس کے قریب تو ہندوستان کے کچے دھاگے نے باندھے رکھا۔ دو برس کسی اور کے خیال نے مگر یہ آخری خیال بھی باعصمت تھا اور محض حالات گرد و پیش کا تقاضا اس کا محرک تھا۔ جب ان سب تجربوں کے بعد "کپڑے پھاڑے گھر کو آئے" تو تاہل کی زندگی بال بچوں کے خیال نے شاعری سے مستغنی نہیں تو غافل ضرور کر دیا گزشتہ چند سالوں میں اگر کچھ ترشح شاعری کا ہوا۔ تو وہی قومی مرثیہ مگر زیادہ تر رسمی۔ البتہ پچھلے دو تین برس میں عشق حقیقی رنگ لایا ہے۔ اور تغزل کا زور ہے۔ یہ اپنی تنگ آبی ہے کہ سوائے چار پانچ غزلوں کے اس فرصت کے زمانہ میں بھی کچھ نہ لکھ سکا۔ لکھنے کے لئے نہ بیٹھتا ہوں نہ کوشش کرتا ہوں مگر جب طبیعت پر خود ہی کسی بیرونی تحریک کا غلبہ ہوتا ہے۔ تو بغایت مجبوری کہہ لیتا ہوں۔ اور یہی ایک ذریعہ (علاوہ تلاوت قرآن پاک کے) تسکین قلب کا رہ گیا ہے۔ چونکہ آپ کا اصرار ہے۔

کہ پوری غزلیں لکھ بھیجوں۔ اس لیے یہ لکھے بھیجتا ہوں Touch stone کی معشوقہ سے زیادہ قابلِ قدر نہیں A poor thing but mine own اب رخصت ہوتا ہوں اور تضیعِ اوقات کی معافی کا خواستگار ہوں (غزلیں درج ہیں) یہ چند اشعار ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ بقول آپ کے میری "اُمت" ان سے کچھ تسکین پائے۔ بہرحال خود مجھے ضرور کچھ نہ کچھ تسکین ہو جاتی ہے۔ مگر ان کو لٹریچر سے کیا تعلق یہ صرف اپنی دست افشانی اور پاکوبی کے لیئے ہیں۔"

دولت موریہ

دولت موریہ کا آغاز کیونکر ہوا

۱۔ سکندر رومی کے حملے سے جو بے ربطی و توزیت کے عناصر پیدا ہو گئے تھے وہ ایک بردست شہنشاہی کے بال و پر بن گئے جس نے دو سو برس تک ہندوستان پر نہایت سطوت و جبروت سے حکومت کی۔ دولت نندہ کا غیر مستقل اور زوال آمادہ نظام اس طوائف الملوکی کی تاب نہ لا سکا جو رومی حملے سے پیدا ہوئی تھی اور بدنظمی کے پھیلتے ہی خاندان نندہ خیال باطل کی طرح منتشر ہو گیا لیکن قدرت نے اس عام بدنظمی اور بے ربطی میں ایک ایسا بے وطن مشکل پسند شخص پیدا کیا جس نے منتشر قوم کی شیرازہ بندی کی۔ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے سکندر کی فوج میں رہ کر مرتب و مستعد لشکر کے فائدے اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے اس نے محمد علی پاشا کی طرح محسوس کیا تھا کہ بڑی سلطنتیں جن کا نظام بے ربط ہو آسانی سے دشمن کا شکار بن جاتی ہیں۔ خوش قسمتی سے اس کا وزیر چانکیا۔ دور اندیش اور ہوشیار مدبر تھا جس کی مدد سے اس اولوالعزم نوجوان نے ایک لشکر ترتیب دے کر شاہان نندہ کے دارالامارت پٹالی پتر پر قبضہ کر لیا۔ سلطنت موریہ کے قیام سے (یعنی ۳۲۳ء ق۔م سے) ہندوستان کی سیاسی تاریخ حقیقی معنوں میں شروع ہوتی ہے۔

چندر گپت

۲۔ چندر گپت معمولی بادشاہ نہ تھا سکندر کے حملے کے نتائج اس کے ذہن سے محو نہ ہوئے تھے بادشاہ ہوتے ہی اس نے ایک بردست لشکر تیار کر کے شمال ہند پر قبضہ کر لیا۔ اس کی کامیابی کی بڑی دلیل یہ ہے کہ ۳۰۵ء ق۔م میں جب سلوکس نیکاتار (فاتح) نے جو سکندر کے ممتاز افسروں میں تھا اور جس نے سکندر کے ایشیائی مقبوضات کو باآسانی فتح کر لیا تھا اپنے نامور آقا کے نقش قدم پر چلنے کے ارادے سے دریائے سندھ پار کیا تو ایک جرار ہندی لشکر اس کے مقابلہ کے لئے دریائے سندھ کے دوسرے کنارے پر موجود تھا جس نے اسے اچھی طرح اس گستاخی کی سزا دی اور بالآخر

سلوکس کا حملہ اور اسکی شکست

سلوکش کو اریانہ سی (دریائے سندھ کا مغربی علاقہ) ہاتھ اُٹھالینا پڑا اور پانچسو ہاتھیوں کے حقیر معاوضے میں کابل قندہار اور ہرات کے صوبے ہندی تاجدار کے نذر کرنا پڑے مزید براں سلوکس کو مجبوراً اپنی لڑکی کا عقد چندر گپت کے ساتھ کرنا پڑا۔ چندر گپت کے بلند دماغ ہونے کی یہ دلیل کیا کم ہی کہ بائیس برس کی قلیل مدت میں جو سکندر رومی اور سلوکس کے حملوں کا فصل ہی اُس نے شمالی ہند کا نظام سیاسی ٹھیک کر لیا اور ایسی فوج تیار کر لی جس سے سلوکس کی یونانی فوج پیش نہ پا سکی۔

ہندی شہنشاہی کے حدود اربعہ

۳۔ یہ امر قابل غور ہی کہ پہلی ہندی سلطنت کے حدود قندہار اور ہرات تک پھیلے ہوئے تھے اس سے معلوم ہوتا ہی کہ شاہان ہند کی خواہش جہاں ہندوستان کے عقلی و فطری حدود پر ختم ہوتی تھی جیسا کہ شاہان مغل اور موریہ کے عہدوں میں کابل اور قندہار کے سرحدی موریچے ہونے سے ثابت ہوتا ہی۔

چندر گپت کا تدبر اور سیاست

۴۔ خوش قسمتی سے چندر گپت کے عہد کی دو تصنیفیں موجود ہیں جن سے اُس کے تدبر و سیاست کا اندازہ کیا جا سکتا ہی ان میں سے ایک اُس کے ہوشیار برہمن وزیر اور گُرو کی عجیب و غریب تصنیف ہی۔

ارتھا شاستر

یہ کتاب ارتھا شاستر کے نام سے موسوم ہی اس میں علم سیاست پر بحث کی گئی ہی اور اس عہد کے مروجہ حالات درج ہیں دوسری تصنیف یونانی سفیر میگاس تھینز کی ہی یہ سفیر عرصہ دراز تک پٹالی پتر میں مقیم رہا اس لیئے جو کچھ اس نے لکھا ہی ذاتی مشاہدہ سے لکھا ہی ان دونوں کتابوں میں متفق الخیالی پائی جاتی ہی کہ اُن سے چندر گپت کے عہد کے سیاسی حالات صاف صاف معلوم ہو جاتے ہیں اور تخیل پر زور دینا نہیں پڑتا۔ ان کتابوں سے ظاہر ہوتا ہی کہ چندر گپت ایک مستقل اور مرتب لشکر طیار رکھتا تھا فوج کو شاہی خزانہ سے ماہوار تنخواہیں تقسیم ہوتی تھیں فوج کے لیئے ہتیار بھی شاہی خزانے سے مہیا کیئے جاتے تھے چندر گپت کے لشکر میں چھ لاکھ پیدل تیس ہزار سوار اور نو ہزار جنگی ہاتھی تھے۔

صوبہ نظارت حربیہ میں تیس رکن ہوتے تھے یہ تیسوں ارکان چھ چھ کی جماعتوں میں پیدل، سوار، رتھ (جنگی) ہاتھی بری اور بحری فوج کے پانچوں صیغوں کے ساز و سامان کی بہم رسانی کا انتظام کرتے تھے۔

سلطنت کا بلدی نظام

۵۔ سلطنت کا بلدی نظام اس نہج پر تھا کہ شخصی حکومت تھی بادشاہ اوتار سمجھا جاتا تھا مختلف صوبوں پر بادشاہ کے نائب حاکم ہوتے تھے صوبیداروں کی نگرانی جاسوسوں کے سپرد تھی اور جاسوسوں کا محکمہ اعلیٰ درجہ کا تھا شاہی خزانے سے نئی سڑکیں نکلوائی جاتی تھیں اور پرانی سڑکوں کی مرمت ہوتی تھی شاہی محاصل کا بڑا جزو غالباً اُس عہد میں بھی لگان ہی ہوگا تجارت کے مال کو محصول سے بچانے اور تاجروں کے دوسری قانونی خلاف ورزیوں کے لئے محکمہ علیحدہ تھا آبپاشی پر جیسا کہ ایک ہمدرد حکومت کا فرض ہے۔ چندر گپت کے عہد میں خاص توجہ کی گئی تھی آبپاشی کا محکمہ بالکل الگ تھا اور بادشاہ کو اُس سے خاص دلچسپی تھی کیونکہ کاٹھیاواڑ کے دور اُفتادہ علاقہ میں چندر گپت نے نہایت اہتمام سے رقم کثیر خرچ کرکے نہریں اور تالاب بنوائے تھے۔ یونانی سفیر میگاسس تھنیز تعجب کے ساتھ رقم طراز ہے۔ کہ شاہی افسر مصریوں کی طرح نشیب فراز کی پیمائش کرکے پانی کے بہاؤ کا اندازہ لگاتے ہیں تاکہ پانی متعدد نہروں میں بہے اور ہر شخص حصہ رسدی سے بہرہ اندوز ہو سکے۔

چندر گپت کے دارالامارت کا بلدی نظام

۶۔ چندر گپت کے دارالامارت کا بلدی نظام حیرت انگیز تھا نظارت حربیہ کی طرح دارالامارت کا بلدی نظام ایک مجلس کے سپرد تھا اس مجلس میں تیس رکن ہوتے تھے یہ ارکان چھ چھ آدمیوں کی چھوٹی جماعتوں میں تقسیم ہوتے تھے اور ہر جماعت کے سپرد ایک خاص صیغہ بلدی نظام کا ہوتا تھا۔ شہر کی غیر معمولی وسعت اور آبادی نے از خود بلدی نظام کی ضرورت محسوس ہوئی ہوگی۔ مجلس بلدی غیر ممالک والوں کی فہرست طیار رکھتی تھی اور اوزان و پیمانوں وغیرہ کی دیکھ بھال رکھتی تھی۔ اگر یہ صحیح ہو تو پٹالی پتر کسی طرح شاہان فارس کے قدیم دار السلطنت اصطخر (پرسی پولس) سے کسی طرح آن بان میں کم نہ ہوگا

چندرگپت کا حکومت سے دستکش ہونا

۷۔ جین روایات کے مطابق سنہ ۲۹۸ ق۔م میں چندرگپت سلطنت سے دستکش ہو کر خانقاہ نشین ہو گیا اور اُس کا بیٹا بندوسار تاج و تخت کا مالک قرار پایا۔ بندوسار نے یونانیوں سے دوستانہ تعلقات برقرار رکھے اُس کے دربار میں میگاسس تھنیز کے بجائے ڈیئی ماکیو یونان کا سفیر تھا یونانی سفیر کے علاوہ شاہ مصر کا سفیر بھی اس فرماں روا کے دربار میں رہتا تھا کیونکہ چندرگپت کے بادشاہ ہوتے ہی ہندوستان دنیا کے بین الاقوامی سلسلے میں داخل ہو گیا تھا (پُرانی دنیا کا یہ بین الاقوامی سلسلہ مصر سے آسام تک پھیلا ہوا تھا)

بندوسار

۸۔ بندوسار کے عہد میں چندرگپت کی فتوحات کا سلسلہ جاری رہا اور دکن کا علاقہ مگدھ کی قلمرو میں شامل کر لیا گیا اس بادشاہ کی سیاست داخلی کی شہادتیں موجود نہیں اور بجز اس کے ہم اُس کی تعریف میں کچھ نہیں کہہ سکتے کہ اُس نے اپنے باپ کا نظام حکومت کامیابی کے ساتھ قائم رکھا بندوسار کی عظمت کے لئے اتنا بس ہے کہ وہ ایک جلیل القدر تاجدار کا نور نظر تھا اور ایک عظیم القدر بادشاہ کے باپ ہونے کا فخر اُسے حاصل تھا۔ بندوسار نے سنہ ۲۷۳ ق۔م میں وفات پائی اُس کے بعد اُس کا بیٹا پیادسی تخت سلطنت پر متمکن ہوا جسے تاریخ اشوکھ کے نام سے یاد کرتی ہے۔

اشوک

۹۔ عنفوان شباب میں شاہ اشوکھ کو ولیعہدان سلطنت کی طرح ملکی و انتظامی مسائل طے کرنا پڑتے تھے کیونکہ باپ ہی کے زمانے میں وہ ٹیک سیلا اور اُجین کی صوبے داریوں کا عامل معتبر ہو چکا تھا یہ دونوں صوبے سلطنت مگدھ کے عظیم ترین صوبہ شمار کیے جاتے تھے سنہ ۲۷۳ء اشوکھ باپ کے تخت پر بغیر کسی مخالفت کے جلوہ افروز ہوا اور چالیس برس تک سلطنت مگدھ کا انتظام کر و فر کے ساتھ کرتا رہا اس کے عہد کا پہلا قابل ذکر واقعہ ریاست کالنگا پر فوج کشی کرنے کی ہے یہ لڑائی غالباً خاندانی روایات کی تقلید میں حدود سلطنت کی توسیع کی غرض سے چھیڑی گئی تھی لیکن جنگ و جدال کے خونریز ہنگاموں کا اشوکھ کے نرم دل پر یہ اثر پڑا کہ اُس نے عہد کر لیا کہ آیندہ پھر وہ کبھی لشکر کشی نہیں کرے گا۔ شاید اسی نرم دلی نے اُسے بدھ مذہب

اصول کا پیرو بنا دیا اور انھیں خیالات کی وجہ سے ہم اُس کے ایک جلی کتبہ میں یہ فرمان دیکھتے ہیں (فرمان نمبر ۱۳) "انسان کی سب سے بڑی کامیابی وہ ہی جو زہد و تقوے سے حاصل ہو"

اشوک کے بدھ مذہب اختیار کرنے سے سلطنت پر اثر پڑا

۱۰۔ بادشاہ کے خیالات کی تبدیلی امور سلطنت میں بھی ظاہر ہونے لگی آج تک اُس کے کتبہ لاٹان پہاڑوں اور چٹانوں پر کھُدے ہوئے ملتے ہیں ان کتبوں سے معلوم ہوتا ہی کہ اشوکہ کی زندگی تمام تر بنی نوع انسان کی فلاح و بہبودی میں صرف ہوئی شاہ اشوکہ کے کتبوں کی تعداد تیس سے زیادہ ہی ان میں چودہ جلی کتبے ہیں جن میں اشوکہ کے اصولی سیاست کا ذکر ہی۔ آخر۔ آخر میں اُس نے سات عمودی سے کتبے کھدوائے تھے جن میں کم و بیش لگلے کتبوں کی توضیح و تشریح کی گئی ہی۔ ان تمام کتبوں میں ساتواں کتبہ بہت مشہور ہی ان میں وہ سب تدبیریں ایک ایک کرکے گنا ئی گئی ہیں جو شہنشاہ اشوکہ نے دھرم پھیلانے کے لیۓ اختیار کیں شہنشاہ اشوک کے کتبوں کی حیثیت فرامین سلطنت کی ہی جو مواعظ حسنہ سے لبریز ہیں۔

اشوک اور دوسرے بادشاہوں میں فرق

۱۱۔ اشوک کے عہد حکومت میں اور دوسرے بادشاہوں کے عہدوں میں بین فرق یہ ہی کہ اشوک کی فتوحات کا لنگا کی مستثنیٰ مثال چھوڑ کر خالصاً صلح کُل اور پُرامن تھا، جن میں جنگ و جدال کا عنصر داخل نہ تھا بحیثیت بادشاہ کے اشوک اپنی مثال آپ ہی۔ اس کا معیار زندگی بہت بلند تھا کیونکہ ایک کتبہ میں وہ کہتا ہی "مجھے کاروبار سلطنت کی انجام دہی اور عام بہبودی کی جدوجہد سے کبھی اطمینان نہیں ہوتا" وہ کہتا ہی کہ امیر و غریب سب کو ذاتی جدوجہد کرنا چاہیئے۔ فرامین کی زندہ مثال بادشاہ کی ذات ہمایوں صفات ہی۔ اِس تاجدار کو اپنی قوم سے بڑی محبت تھی۔ کیونکہ کتبوں میں اکثر یہ فقرہ نظر آتا ہی کہ رعایا بمنزلہ میری اولاد کے ہی۔ اس کی ہمہ گیر محبت میدانوں کے متمدن باشندوں تک ختم نہ ہو جاتی تھی۔ بلکہ پہاڑوں کے وحشی قبایل کے لیۓ اس نے اپنے افسروں کو خاص ہدایات دے رکھی تھیں۔ اس کا حکم تھا کہ شاہی فرمان تینوں موسموں کی ابتدا میں۔ بآواز بلند عام شاہراہوں پر

پڑھ کر سنائے جائیں۔ تاکہ جملہ بھی فائدہ اُٹھا سکیں۔

اشوک کی انتظامی قابلیت

۱۲۔ رفاہ عام کے لئے شاہ اشوک نے متعدد شفاخانے تعمیر کروائے تھے۔ سڑکیں بنوائی تھیں۔ انتظامی امور میں وہ اپنے نامور جد کا ہم آہنگ تھا۔ اس کے عہد میں امن وامان ایک طرح سے قائم رہا۔ شاہ اشوک روشن ضمیر بادشاہ تھا اور تمام عمال سلطنت پر اس کی نظر رہتی تھی۔ کیونکہ انہی پر احکام شاہی کے نفاذ کا مدار تھا۔

اشوک نے متعدد وفود ممالک غیر میں بھیجے

۱۳۔ عہد اشوک کا خاص واقعہ یہ ہے کہ اس زریں عہد میں متعدد وفود ممالک غیر میں بھیجے گئے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ شاہان موریہ کے تعلقات۔ خاندان سلوکس (شاہان شام) اور خاندان بطلیموس (مقوقان مصر) سے تھے۔ شہنشاہ اشوک نے جبلی کتبوں میں یہ ارادہ ظاہر کرنے کے بعد کہ وہ قانونی مسایل کی طرف زیادہ اعتبار نہیں کرے گا ان ممالک میں جن سے اس کے تعلقات دوستانہ تھے متعدد وفود روانہ کئے تاکہ ان ممالک میں بدھ مذہب اصول کی اشاعت و ترویج ہو۔ اس سے قبل محکوم ریاستوں اور سرحدی قبایل میں وفود بھیجے جا چکے تھے۔ لیکن اس سے اس کی پیاس کب بجھنے والی تھی۔ اب ایک وسیع تر میدان کی تلاش ہوئی۔ اور اس نے شریف جوشیلے بدھ مبلغین مصر۔ شام۔ (طرابلس) مقدونیہ اور اپایرس روانہ کئے۔ ان وفود کی کامیابی کے بارے میں مشکل سے کچھ کہا جا سکتا ہے۔ گو سرندیپ کے وفد کو کامیابی ضرور ہوئی۔ اشوک نے اپنے حقیقی بھائی مہندر کو جس نے مذہبی فقیری اختیار کی تھی ایک عظیم الشان وفد کے ساتھ سرندیپ بھیجا تھا۔ اس وفد کی کوششوں سے سرندیپ کا راجہ ٹیا مع تمام درباریوں کے بدھ مذہب میں داخل ہو گیا۔ راجہ اور اعیان سلطنت کی تبدیلی مذہب نے پورے جزیرہ کو بدھ مذہب کا حلقہ بگوش بنا دیا۔ سرندیپ کے وفد کی کامیابی کو پیش نظر رکھ کر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اشوک آریہ راجہ رام چندر سے زیادہ کامیاب رہا۔ کیونکہ رام چندر جی کی کامیابی محض جنگی کامیابی تھی۔

اشوک کے حدود سلطنت | ۱۴۔ اشوک کے حدود سلطنت جنوبی ہند کے انتہائی حصے تک پھیلے ہوئے تھے۔ ہم ان کا تعین صحت کے ساتھ کر سکتے ہیں۔ مغرب میں ہرات اور قندھار۔ مشرق میں آسام۔ سلطنت اشوک کے سرحدی صوبے تھے۔ کشمیر اور نیپال میں شہنشاہ اشوک کے صوبیدار متعین تھے۔ جنوب میں اس کی سرحد موجودہ ریاست میسور کی جنوبی سرحد پر جا کر ختم ہوتی تھی۔

اشوک کے عہد میں بدھ مذہب والوں کا جلسہ | ۱۵۔ شہنشاہ اشوک نے اپنے آخری عہد میں بدھ مذہب والوں کا ایک بڑا جلسہ پٹالی پتر میں کیا تھا۔ تاکہ بدھ مذہب والوں کے باہمی اختلافات مٹ جائیں۔ ۲۳۲ ق۔م۔ میں اس جلیل القدر شہنشاہ نے وفات پائی۔ سیاست و تدبر میں شاہ اشوک جولیس سیزر اور شہنشاہ اکبر کے ہمدوش نظر آتا ہے۔ مذہبی و تبلیغی اولوالعزمی میں وہ کنفوشس۔ پالوس اور جرجیس اعظم سے رتبہ میں کسی طرح کم نہیں معلوم ہوتا۔ میدان جنگ سے پرہیز کرنے اور کسی قسم کا ہتیار استعمال کرنے کی قسم کھانے میں اس کی نظیر شاہان عالم میں نہیں مل سکتی۔ وہ ان معدودے چند بادشاہوں میں ہے جو عمر بھر انتہائی بے نفسی کے ساتھ قوم و ملک کی خدمت میں مستغرق رہے۔ بلاشبہ قدیم تاریخ ہند میں اشوک کا بزرگ ترین و شریف ترین نام ہے۔ اور دنیا کی عظیم الشان ہستیوں میں یہ ہندی تاجدار صف اول میں رہنے کے قابل ہے۔

اشوک کے بعد سلطنت موریہ دو حصوں میں تقسیم ہو گئی | ۱۶۔ شہنشاہ اشوک کے بعد اس کے دو پوتوں نے سلطنت کو مشرقی و مغربی حصوں میں تقسیم کر لیا۔ ان میں سے ایک کا نام دسرتھ تھا اور دوسرے کا سمپرتی۔ اسی طرح پچاس برس تک سلطنت موریا زندگی کے دن پورے کرتی رہی یہاں تک کہ آخری موریا تاجدار جس کا نام برہدرتھ تھا اس کے رئیس العسکر پشیامترا نے قتل کر ڈالا پشیامترا ہی دوسرے خاندان کی ابتدا ہوئی جو تاریخ میں خاندان سوریہ کے نام سے مشہور ہے۔ پشیامترا کے عہد میں یونانی بادشاہ مینندر نے حملہ کیا جسے بدھ روایات میں ملندا کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ واسومتر نے جو پشیامترا کا پوتا تھا یونانیوں کو سخت شکست دی۔ اس شکست نے یونانیوں کی

حوصلہ مندیوں کا ہمیشہ کے لیئے خاتمہ کردیا۔ خاندان سوریا تھوڑے ہی دنوں بعد خاندان کے بطنی نزاعات سے تباہ ہوگیا۔ شاہان کانوا اس خاندان کے جانشین ہوئے راجگان کانوا ۲۷ھ ق۔م۔ تک حکمراں رہے۔ پھر اندھرا خاندان نے اس خاندان کا ورق اُلٹ دیا۔

دولت موریہ کی سیاسی اہمیت

۱۷۔ اگرچہ چندرگپت اور اشوک کی سیاسی تعمیر ڈیڑھ سو برس کے عرصہ میں خاک میں مل گئی۔ لیکن شہنشاہی کا خیال سلطنت کے ساتھ مٹنے والا نہ تھا۔ دولت موریہ کی تاریخی اہمیت یہ ہے کہ اس کے سایہ میں پہلی مرتبہ ہندوستان نے متحد ہوکر سیاسی زندگی کا ثبوت دیا۔ آنے والی صدیوں میں شہنشاہی کے دور بلندی تاریخ میں بار بار آتے رہے۔ تقریباً ہر صدی میں کسی نہ کسی خاندان نے کوشش ضرور کی کہ کوہ ہمالیہ سے لے کر راس کموری تک ایک ہی پرچم کے زیر سایہ کرلے۔ گو شہنشاہی کا تخیل اس زمانہ کو دیکھتے ہوئے قبل از وقت ضرور تھا۔ لیکن ہمیں فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ یہ خیال سلطنت موریہ کے اولوالعزم فرمانرواؤں نے بلندی تہذیب میں پیدا کیا تھا۔ اس حیثیت سے چندرگپت۔ بندوسارا اشوک نہ صرف سمدرگپت اور ہارشاوردھن ہی کے اسلاف ہیں بلکہ بابر۔ اکبر اور اورنگ زیب کے بھی ہیں۔

دوسرا باب

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پیشتر ہندوستان کی اجتماعی و معاشرتی حالت کیا تھی

عہد موریہ اور قرون مابعد کی سب سے بڑی خصوصیت

۱۔ عہد موریا اور قرن مابعد کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس زمانہ میں ہندوستان کی اجتماعی زندگی میں نمایاں انقلاب پیدا ہوا اگرچہ سکندر اعظم کی آمد تک برہمنوں کے رسوخ میں فرق نہ آیا تھا۔ لیکن شہنشاہ اشوک کے مذہبی و تبلیغی جوش نے ایک غیر معروف فرقہ کو عالمگیر مذہب میں تبدیل کر دیا تھا۔ گو بدھ مذہب ہندو مذہب کی اصلاح شدہ اور ترقی یافتہ صورت تھی۔ بایں ہمہ اس کی ترویج سے جو اجتماعی انقلاب ملک میں ایک سرے سے دوسرے تک پھیل گیا وہ معمولی نہ تھا۔ ہندو مذہب میں قربانیاں بکثرت تھیں جن کی ادائیگی بغیر برہمنوں کے ناممکن تھی۔ کیونکہ یہی گروہ مذہبی باریکیوں کا جاننے والا سمجھا جاتا تھا۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے ہندو مذہب کی خصوصیات گوتم بدھ سے کہیں پہلے پیدا ہو چکی تھیں در اصل ہندو مذہب کا بدترین پہلو یہ تھا کہ اس میں ادنیٰ طبقہ کی مادی و روحانی فلاح کا مطلق خیال نہ رکھا گیا تھا۔ یہی حالت اب تک چلی آتی ہے۔ بدھ مذہب کے رواج نے ادنیٰ طبقوں میں تمدن کی روح پھونک دی جس کی وجہ سے بدھ مذہب ایک جمہوری اور ہردلعزیز تحریک بن گیا۔ جس میں ادنیٰ و اعلیٰ بلا تفریق ذات دوش بدوش تھے۔ اگلے باب میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ پیادا سی وحشی قبائل میں گوتم بدھ کا پیغام پھیلانے کا اسی قدر مشتاق تھا جس قدر میدانوں کے متمدن باشندوں میں۔ بدھ مذہب کے عروج کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس مذہب کی تبلیغ عام رائج الوقت زبان میں کی گئی۔ چنانچہ اسی زمانہ سے پالی اور پراکرت مہذب زبانیں سمجھی جانے لگیں۔

بدھ خانقاہیں تعلیم گاہیں بن گئیں

۲۔ بدھ مذہب کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس مذہب میں جو گروہ

شامل تھے۔ ایک عام لوگوں کا دوسرا خانقاہ نشین راہبوں کا۔ راہبوں میں مرد اور عورتوں کی تفریق نہ تھی۔ شاہانِ موریہ کے عہد میں نیکدل بادشاہوں اور امیروں نے ملک میں بکثرت خانقاہیں تعمیر کرائیں۔ یہ خانقاہیں رفتہ رفتہ تعلیم گاہیں بن گئیں۔ جن سے ہندوستان کو پہلی مرتبہ تعلیمی بیداری کا سبق حاصل ہوا سنگھا آشرم میں راہب امرا و غربا کو مساوی طور پر انوار حقیقت کی تعلیم دیتے تھے جو سانکیا شاہزادہ پر کئی صدی پیشتر منکشف ہوچکی تھی۔ شاہ اشوک کے عہد میں دور دور تک خانقاہوں کا سلسلہ قائم تھا۔ سات سو برس تک خانقاہوں کے بے نفس خادمین نے ایسی جدوجہد کی کہ ہندوستان کے مدارس اور جامع ایشیا میں مشہور ہوگئے اور تحصیل علم کے دلدادہ پرانی دنیا کے ہر گوشہ سے جوق در جوق ہندوستان کا دور و دراز سفر طے کرنے لگے۔

بدھ مذہب نے طبقۂ اناث کا پایہ بلند کر دیا

۳۔ بدھ مذہب نے صنف ضعیف کا پایہ بھی بہت بلند کر دیا تھا۔ جس کی وجہ سے دیرالراہبات کا عام رواج ہو گیا جن میں شریف گھرانوں کی عفت مآب خواتین فقر و ریاضت کی قسم کھا کر داخل ہوتی تھیں۔ راہبات کے زمرہ میں شہنشاہ اشوک کی بیٹی بھی شامل تھی۔ جسے جزیرہ سرندیپ میں بدھ مذہب پھیلانے کے صلہ میں سنگھامترا (سنگھا کی دوست) کا کبھی نہ مٹنے والا لقب عطا ہوا تھا اگرچہ یہ صحیح ہے کہ وید کے دور میں یا اس کے بعد عورتوں کا رتبہ ہندو مذہب میں نیچا نہ تھا تاہم بدھ مذہب نے طبقۂ نسواں کو ہندو مذہب سے کہیں زیادہ آزادی بخشی اور ان کا پایہ اتنا بلند کر دیا کہ وہ فلسفیانہ اور اجتماعی کاموں میں نمایاں حصہ لینے لگیں۔

بدھ مذہب کے عروج سے ہندو مذہب پر کیا اثر پڑا

۴۔ بدھ مذہب کے عروج سے ہندو مذہب کا عالمگیر اثر فنا نہ ہوسکا شہنشاہ اشوک باوجود مذہباً بدھ ہونے کے ہمیشہ برہمنوں کی قدر و منزلت کرتا تھا اور انہیں بیش بہا عطیوں سے سرفراز کرتا رہتا تھا اس [illegible] کو گو بدھ مذہب سے بیحد محبت تھی لیکن اس نے قدیم مذہب میں کسی طرح کی [illegible]

شینی کی۔ موریا سلطنت کے تباہ ہوتے ہی ہندو مذہب کی تجدید ہونے لگی۔ کیونکہ موریا۔ کانوا اور اندھرا خاندان جو یکے بعد دیگرے سلطنت موریا کے جانشین ہوئے وہ سب ہندو تھے۔ کانوا برہمن خاندان تھا۔ پشیامترا نے اسوامیدھ (گھوڑے کو قربان) کرنے کی قدیم رسم کو ادا کیا تھا۔ یہ راجہ ہندو مذہب کا حامی تھا۔ اسی کے عہد سے ہندو مذہب کی وہ تحریک شروع ہوئی جس نے بارہ سو برس کے طویل عرصہ میں بدھ مذہب والوں کو پھر ہندو مذہب کا حلقہ بگوش بنا دیا۔ ہندو مذہب کے ساتھ سنسکرت بھی از سر نو زندہ ہوئی۔ تین سو برس پہلے پنی اشٹادھیا تصنیف کر چکا تھا۔ اشٹادھیا سنسکرت کی سب سے بڑی قواعد ہے اور اسی کی بدولت سنسکرت کو علمی زبان بننے کا فخر حاصل ہوا ہے۔ پتانجلی سنسکرت کا مشہور قواعد داں جس نے پنی کی شرح لکھی ہے پشیامترا کا ہمعصر تھا۔

عہد موریہ کا تمدن | موریہ عہد کے تمدن کی شہادتیں یونانی سفرا کی تصنیفوں اور نیز کیٹلیا کے ارتھا شاستر میں بکثرت موجود ہیں۔ ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی تمدنی حالت پرانی دنیا کی متمدن قوموں سے کسی طرح کم نہ تھی۔ یہ ملحوظ خاطر رکھنا چاہیئے کہ تیسری صدی قبل مسیح میں متمدن اقوام جزیرہ صقلیہ سے چین کے شہر پیکین تک پھیلی ہوئی تھیں اور یونانی تہذیب کا اثر ہندوستان کے حدود تک پہونچ چکا تھا۔ روم اور مصر مماثل تہذیب کے سرچشمہ تھے۔ سنہ ۲۲۰ ق۔م۔ میں چین کے پہلے شہنشاہ نے اس ملک کو متحد کر دیا تھا۔ سنہ ۲۰۶ ق۔م سے خاندان ہان کی شاندار حکومت کا آغاز ہوا۔ یہ خاندان چار سو برس تک چین پر حکمراں رہا۔ ہندوستان اس بین الاقوامی جماعت کا رکن تھا۔ پتالی پتر کی مجلس بلدی میں ہم ذکر کر چکے ہیں کہ ایک صیغہ غیر ملک والوں کے اعداد و شمار رکھنے کے لئے مخصوص تھا جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ممالک غیر سے آمد و رفت بکثرت تھی اور تعلقات بہت زیادہ تھے اگرچہ اس زمانہ میں بار برداری اور دور دراز مسافت کی دقتیں

ایسی تھیں کہ بین الاقوامی تعلقات سے کوئی بڑی تحریک دوسرے ملکوں میں پھیلائی نہیں جا سکتی تھی لیکن باوجود ان مشکلات کے اور کوہ ہمالیہ کی دشوار گزار حد فاصل کے بدھ مذہب جس کی نشو و نما ہندوستان میں ہوئی تھی چین کے دور افتادہ ملک میں سرعت کے ساتھ عہد موریہ ہی میں پھیل گیا تھا۔

پٹالی پتر بابل ہمدان اور نینوا سے کم نہ تھا

۲۔ سلطنت موریہ کا دارالامارت پٹالی پتر۔ تجارت۔ نظم و نسق۔ کی خوبی اور شان و شوکت میں بابل ہمدان اور نینوا سے کم نہ تھا۔ دریائے گنگا اور سون کے سنگم پر یہ شہر آباد تھا شاہان موریہ کے درباروں کی عظمت و جلالت شہنشاہان مغل کے درباروں کی ہم پلہ تھی پری چہرہ خواصوں کے جھرمٹ میں بادشاہ کی سواری نکلا کرتی تھی یہ خواصیں غالباً باختر اور یونان سے آتی ہوں گی۔ اگنی مترکے دربار کی حشمت کا ذکر کالیداس نے ایک ناٹک میں کیا ہے۔ کالیداس کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس راجہ کا دربار صحیح المذاق اور اعلیٰ تہذیب سے مزین تھا۔ اگرچہ اور درباروں کی طرح اس دربار میں بھی سازشیں ہوتی تھیں۔ لیکن ادبا و رفنون لطیفہ قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ درباریوں کی دلچسپی کے لیے گونے گنجیاں اور ناٹک والے نہیں رکھے جاتے تھے ان کے رکھنے سے محض درباریوں کی اخلاقی اصلاح مقصود ہوتی تھی کنتلیا نے ارتھاشاستر میں جو اصول سیاست بیان کئے ہیں وہ مشیاولی کے اصول سے بہت کچھ ملتے جلتے ہیں ارتھاشاستر کا مصنف ان اصول کے موجد ہونیکا دعویٰ نہیں کرتا وہ ایسی باتیں لکھتا ہے جو راجگان سلف برت چکے تھے اس دعوے کے ثبوت میں متعدد شہادتیں ارتھاشاستر میں پیش کی گئی ہیں جو بدقسمتی سے ہم تک نہیں پہونچ سکیں۔ اس قدیم زمانہ میں حکومت کی بنیاد جاسوسوں پر تھی حکومت کو خوفناک سازشوں کے بےرحمی سے فرو کرنے میں پس و پیش نہ ہوتا تھا اشوک کے عہد کو مستثنیٰ کرکے حکومت کا کوئی خاص سیاسی منشا بجز حاکم کے خودنمائی اور دشمنوں کی تسخیر

سے کم نہ ہوتا تھا۔

شمالی ہند کے مشہور شہر

۷۔ دارالامارت کے علاوہ اور بہت سے شہر شمالی ہند میں تھے جن میں ٹیکسلا، اُجین۔ پُراپٹنی۔ بنارس۔ متھرا اور سانچی زیادہ مشہور تھے یہ بڑے بڑے تجارتی شہر تھے اور ان کی آبادی بھی خاص تھی سری نگر کشمیر کے علاقہ میں شاہ اشوک نے طرب گاہ کے طور پر آباد کیا تھا پاٹلی پتر کے تفصیلی بیان کے بعد ان شہروں کی عظمت کا ذکر طوالت سے خالی نہ ہوگا یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ شہر کم وبیش دارالامارت ہی کی وضع پر ہوں گے اور ان میں بھی غالباً مجالس بلدی قائم ہونگی۔ اس دور کی طرز عمارت پر ہم تحقیق کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتے کیونکہ اس کی یادگار سانچی کے پھاٹک کے سوا اور کوئی باقی نہیں رہی سانچی کے باقی آثار سے ثابت ہوتا ہے کہ ہندی فن تعمیر حد کمال کو پہونچ چکا تھا موریہ عہد تک زیادہ تر مکانات لکڑی کے بنائے جاتے تھے۔ ایم۔ فاؤشر کی تحقیق کے مطابق تیسری صدی قبل مسیح سے لکڑی کے بجائے پتھر استعمال ہونے لگا بدھ گیا اور بھارت کی سنگی جالیاں اسی قرن کی یادگار ہیں ساناکرمی اور موریہ خاندان کے حوالے اس کا قطعی ثبوت ہیں کہ یہ جالیاں دوسری صدی۔ ق۔م۔ میں بنائی گئی ہوں گی اس میں شبہ نہیں کہ شاہان موریہ کو فن تعمیرات سے بڑی دلچسپی تھی شہنشاہ اشوک نے بہت سے خوبصورت محل تعمیر کروائے تھے اور اگر وہ محلات نہ بنواتا تب بھی اُس کی عظمت ظاہر کرنے کے لیے وہ عمودی کتبے کافی تھے جو ہندوستان کے اطراف واکناف میں پھیلے ہوئے ہیں فن تعمیر کے علاوہ دوسرے فنون جنھیں سنسکرت میں کلا کہتے ہیں کمال کو پہونچ چکے تھے منجملہ اُن کے رقص کی تعلیم شاہی محلوں میں دی جاتی تھی جیسا کہ کالیداس کی ملاوی گنگنا متر سے معلوم ہوتا ہے۔ موسیقی اور مصوری عام طور سے پسند کی جاتی تھیں، یونانی سفیر کا بیان ہے کہ چندر گپت کے محل کے مذہب ستون سنہری بنت کاری روپہلی چڑیوں سے مزین تھے علم موسیقی ہندوستان کا نہایت قدیم فن ہے اور عہد موریہ سے بہت پہلے ہندوستان اس فن میں کامل ہوچکا تھا۔

ہندی زندگی سیاسیات سے کم متاثر ہوتی ہے

۸- تجربہ شاہد ہے کہ ہندوستان کی حقیقی زندگی سیاسی انقلابات سے بہت کم متاثر ہوتی ہے۔ چنانچہ زراعت جس طرح عام بسراوقات کا ذریعہ ابھی تک بنی ہوئی ہے۔ اُس زمانے میں بھی اسی پر عام زندگی کا مدار تھا۔ زراعت کے ساتھ ساتھ دوسرے پیشے اور دستکاریاں بھی رائج تھیں۔ شاہانہ لباسوں میں عمدہ سے عمدہ ململ استعمال ہوتا تھا۔ نہایت قدیم زمانہ سے ہندوستان بیش قیمت کپڑوں کے لیئے مشہور ہے۔ کپڑوں کے علاوہ مٹی کے برتنوں کا کام۔ سونے اور چاندی کا طرح طرح کا کام۔ اور دوسری دستکاریاں شاہان موریہ کے عہد میں فروغ پر تھیں۔ ہر پیشہ کے لحاظ سے پیشہ وروں کی جماعتیں علیٰحدہ علیٰحدہ قائم کی گئی تھیں۔ جماعت کے افراد پر جماعت کا پورا قابو ہوتا تھا۔ پیشہ وروں کی جماعتیں شاہان موریہ سے پہلے قائم ہوچکی ہونگی کیونکہ ارتھا شاستر میں ان کا ذکر جابجا پایا جاتا ہے۔ ان جماعتوں کے داخلی نزاعات کا فیصلہ پنچایت کے ذریعہ سے ہوتا تھا۔

ہندی تمدن

۹- یہ امر مسلم ہے کہ حضرت مسیح کی ولادت کے وقت ہندوستان تمدن کے اعلیٰ مدارج طے کرچکا تھا۔ یہ تمدن عرصہ دراز کی تدریجی نشوونما اور فطری ارتقاء کا نتیجہ تھا۔ ہندوستان کی سیاسی زندگی فارس اور باختر کے یونانی حکومت کے اثر سے شہنشاہی کے درجہ پر پہونچ چکی تھی اور اجتماعی زندگی نہایت گھرے اور شریف تمدن کا پرتو تھی۔ آیندہ دوسو برس تک یہ فطری ترقی سیاسی جھگڑوں کی وجہ سے رُکی رہی۔ جس کا ذکر ہم دوسرے باب میں کریں گے۔

مسئلہ کینیا

ہندوستان کے موجودہ سیاسی مسائل میں سب سے زیادہ اہمیت مسئلہ کینیا کو دی جاتی ہے۔ اعتدال پسند جماعت جو ابتک برطانوی رحم و انصاف پر اعتماد رکھتی تھی اور اُسکے زیر سایہ ہندوستان کے پھلنے پھولنے کی توقعات میں اپنے ہموطنوں کو شوریدہ سر اور قابل ملامت سمجھنے میں باک نہ رکھتی تھی، اب فیصلہ کینیا کے بعد اُنھیں "شوریدہ سر" اور قابل ملامت لوگوں کے ہم آہنگ ہو کر حکومت کے لطف و کرم سے بے نیازی کا اظہار کر رہی ہے چنانچہ شاستری صاحب جو کل تک امپیریل کانفرنس کی شرکت اور باوجود اپنے سیاہ رنگ ہونے کے وزراء نو آبادیات کے ساتھ ہمنشینی کا مطلب یہ سمجھتے تھے کہ برطانوی سلطنت میں امتیاز نسل و رنگ اُٹھ جائیگا آج سپرو صاحب کو مشورہ دیتے ہیں کہ امپیریل کانفرنس میں شرکت سے انکار کریں۔ برطانوی نمایش میں ہندوستانیوں کی شرکت قومی بھی خودداری کے خلاف سمجھتے ہیں حکومت کے طریق عمل پر اظہار ناراضگی کے لیئے شرما صاحب سے استعفے کی درخواست کرتے ہیں اور پھر برطانوی مال کے بائیکاٹ کو اپنے مقاصد کے حصول کا واحد ذریعہ تسلیم کرتے ہیں۔

اعتدال پسند جماعت کے رکن اعظم کے خیالات میں یہ انقلاب کیوں پیدا ہوا کہ آخر کار وہ بھی ترک موالات پر آمادہ ہوئے؟ ان سوالات کے جواب کے لئے کینیا کی صورت حال اور اس کا طرز حکومت قابل غور ہے۔

کینیا مشرقی افریقہ میں ایک چھوٹی سی نو آبادی ہے، جس کا رقبہ ۲۴۵۰۹۰ مربع میل ہے اور گزشتہ مردم شماری کے مطابق کل آبادی ۲۷۸۳۹۲۵ ہوتی ہے جس میں ۹۶۵۱ یورپین ہیں ۲۷۰۰۰ ہندوستانی ہیں ۱۰۱۰۲ عرب ہیں اور بقیہ تعداد افریقہ کے دیسی باشندوں کی ہے۔ ہندوستان اور مشرقی افریقہ سے پرانے تجارتی تعلقات ہیں جس کا پتہ پندرھویں صدی سے چلتا ہے، چنانچہ گذشتہ دو تین صدیوں کے اندر ہندوستانیوں کی کثیر تعداد اپنے مفاد نیز افریقہ کے وحشی باشندوں کی فلاح و بہی خواہی کے خیال سے ہندوستان کو چھوڑ کر افریقہ میں آباد ہو گئی ہے اور وہاں انہوں نے اپنی قدیم زندہ تہذیب کو اپنی مثال سے ہر دلعزیز

بنایا اور اپنی کوششوں سے تجارت و عام اقتصادی حالات کو بہتر بنانے کی کوشش کی۔
لیکن خداوندان آزادی کو یہ کب گوارا ہوتا کہ ایشیا و افریقہ کا کوئی گوشہ اُن کی حکومت سے باہر رہے
اور ہندوستان کے غلام افریقہ میں جاکر آزادی کا دم بھر سکیں چنانچہ برطانیہ نے اپنی حکمت عملی کے ذریعہ
سے ہندوستانیوں کو اپنا رفیق کار بنا کر رفتہ رفتہ کینیا پر اپنا تسلط قائم کر لیا۔ اور جنگ کے بعد ۱۹۲۰ء
میں باقاعدہ طور پر یہ نوآبادی کینیا کے نام سے برطانوی نوآبادیات میں شمار ہونے لگی۔

"مسئلہ کینیا" کا آغاز اُسوقت سے ہوا جب باشندگان ہندوستان کینیا میں آکر آباد ہونے لگے یوں تو
۱۸۸۵ء سے کچھ یورپین کینیا میں آباد ہونے لگے تھے لیکن ۱۹۰۲ء سے انکی آبادی میں برابر اضافہ ہوتا
رہا۔ ۱۹۰۸ء میں کینیا کا وہ مرتفع حصہ دریافت کیا گیا جس کو ہائلینڈ کہتے ہیں آب و ہوا، زمین کی زرخیزی
اور چراگاہوں کے لحاظ سے یہ حصۂ ملک کینیا والوں کے لئے جنت تھا، لارڈ الگن اسوقت وزیر
نوآبادیات تھے، اُنھوں نے ایک خاص قانون کے ذریعہ سے "ہائلینڈ" کو یورپین کیلئے مخصوص
کر دیا یہ موقع تھا جب مشرق کی مغلوبیت اور مغرب کی قومیت ثابت کرنیکے لئے ہندوستانیوں کو
ایک حق سے محروم کیا گیا چنانچہ اُسی وقت سے ہندوستانیوں اور یورپین باشندوں میں کشمکش
شروع ہوئی حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ ہندوستانیوں کی بانی مندسس پر حق اولیٰ تھا کہ انہوں نے
صدیوں تک اپنی جانیں پر کھیل کر افریقہ کے دشت و صحرا کا ایک ایک چپہ چھانا اور غیر معلومہ مقامات
کی تلاش کی، وحشیوں کو سب سے پہلے تہذیب و تمدن کی ابجد سکھائی، کینیا پر برطانیہ کا تسلط
بھی اُنھیں کی مدد سے ہوا جس کا اعتراف سر جان کرک نے جو مشرقی افریقہ میں سب سے پہلے
کونسل جنرل تھے ان الفاظ میں کیا ہے "اگر ہندوستانیوں کی مدد نہ ہوتی تو برطانیہ کا اقتدار
کبھی مشرقی افریقہ میں قائم نہ ہو سکتا تھا" سر ہنری جانسن بھی افریقہ میں برطانوی کامیابی کا سہرا
سکھ اور پٹھان سپاہیوں کے سر رکھکر فرماتے ہیں کہ ہندوستانی تاجر جن کی کوششوں سے یوگنڈا کو
ترقی کی شاہراہ پر لا رہے ہیں وہ تعریف سے بالاتر ہیں، جن مقامات پر پہنچنا تک ناممکن تھا
وہاں کاروبار قائم کر رہے ہیں اور سنسان و غیر آباد مقامات پر ہوٹل بنا رہے ہیں"، اس کے بھی

یا تو شہادت مسٹر چرچل کی ہے جو ہندوستانیوں کے حقوق کی پاسداری میں اپنی کتاب
مائی افریقہ میں ایک مقام پر تحریر فرماتے ہیں :-

"ہندوستانیوں کے کیا کیا حقوق ہیں؟ پہلا حق بحیثیت انسان کے اور دوسرا برطانوی
رعایا کے۔ یہ سکھ سپاہی جنہوں نے مشرقی افریقہ کو فتح کر کے نہیں طرح طرح کی مصیبتیں
اٹھائیں اور پھر وہاں امن قایم کیا۔ یہ ہندوستانی تاجر تھے جو غیر معلوم مقامات میں
بلاخوف گھستے چلے گئے جہاں کوئی سفید رنگ انسان جانے کی ہمت نہ کر سکتا تھا نہ وہاں
اپنی روزی کمانے کا کوئی ذریعہ نکال سکتا تھا۔ یہی ہندوستانی تاجر تھے جنہوں نے جنگلی
مقامات میں تجارتیں قایم کیں اور آمد و رفت کے لئے راستے نکالے۔ ہندوستانیوں کی
محنت و مزدوری کی بدولت ایک ریلوے کی تعمیر ہوئی جس پر آجکل تمام ترقی کا دارو
مدار ہے، وہ سرمایہ آج مختلف کاموں میں لگا ہوا ہے اس میں زیادہ حصہ ہندوستانی
ساہوکاروں کا ہے اور اس سے یورپین بھی بلا تکلف مستفید ہوتے ہیں، (مشرقی افریقہ
میں) برطانوی دفاتر کے قیام سے بہت پہلے ہندوستانی وہاں موجود تھے،
جنوبی افریقہ کے سفید رنگ کے باشندے مشرقی افریقہ میں اپنی بود و باش کے
جتنے سال شمار کر سکتے ہیں ہندوستانیوں کی اتنی نسلیں وہاں گذر چکی ہیں پھر
یہ کیونکر ممکن ہے کہ کوئی حکومت جو ذرہ برابر بھی ایمانداری کا دعویٰ کرتی ہو وہ
ہندوستانی باشندوں کو اُن مقامات سے نکال دینے کی پالیسی اختیار کرے جہاں
وہ ایک مدت سے آباد ہی نہیں ہیں بلکہ جس کی ترقی بھی انہی کے ہاتھوں ہوئی
ہے لیکن اس سے بھی بڑھ کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا حکومت برطانیہ کیلئے
اس پالیسی کا اختیار کرنا ممکن بھی ہے جبکہ وہ ہندوستان کے تین کروڑ باشندوں
پر بھی حکومت کرنا چاہتی ہو۔"

یعنی ہندوستانیوں کے صاف اور صریح حقوق کے سامنے یورپین باشندوں کا

کوئی وعدہ قابل تسلیم نہیں ہو سکتا تھا، لیکن اس کا لحاظ نہ کیا گیا۔ مقامی کمشنر نے بیشک وزیر نوآبادیات
کے فیصلہ سے کسی قدر اختلاف کیا اور بمشکل تمام ایکسٹریم کے بعد یہ قانون منظور کیا گیا کہ "ہائیلینڈز میں
ہندوستانیوں کو جاگیریں نہ دیجائیں" اس قانون کی رو سے ایک راستہ ہندوستانیوں کیلئے
کھلا رہ گیا تھا جس سے ہائیلینڈز کے خطے تک داخل ہو سکتے تھے، یعنی اگر موقع ملے تو یوروپین جاگیرداروں
سے زمین خرید سکتے تھے چنانچہ ۱۹۱۵ء میں ایک اور قانون مقامی کونسل میں پاس کر دیا گیا کہ
اگر ہندوستانی ہائیلینڈز میں کوئی جاگیر خریدیں تو گورنر کو اس بیع کے منسوخ کر دینے کا پورا حق ہوگا"
اس قانون کے خلاف ہندوستانیوں کی طرف سے حکومت میں گویا صدائے احتجاج، بلند کی گئی، جسکا جواب
بھی فوراً اسی وہائٹ ہال سے مل گیا کہ ہندوستانیوں کی ناداری اور اطاعت کشی کو پسندیدگی
کی نظر سے دیکھتے ہوئے حکومت برطانیہ ان کو یقین دلاتی ہے کہ جو کچھ کیا گیا وہ امتیاز نسل و رنگ اور
قومیت کی بنا پر تھا (بقول شخصے) "سلطنت برطانیہ میں تمام باشندوں کے مساوی حقوق ہیں"۔

۱۹۱۳ء میں پروفیسر ولیم سمپسن صاحب نے ایک رپورٹ شائع کی تھی اور اس میں یہ دکھلایا
کہ طبی اصول پر یہ ضروری ہے کہ مختلف اقوام کے باشندے آپس میں مل کر نہ رہیں ہر قوم کے لئے
علیحدہ علیحدہ حلقے ہوں اور بازار بھی علیحدہ ہوں۔ حکومت اس تجویز کو فوراً اختیار کرنا چاہتی
تھی لیکن چونکہ جنگ شروع ہونیوالی تھی اسلئے اسپر فوراً عمل درآمد مناسب نہ سمجھا گیا اور اختتام
جنگ پر ۱۹۱۹ء میں حکومت نے اس طرف توجہ کی۔

کینیا کی مقامی کونسل میں پہلے جتنے ممبر ہوتے تھے وہ گورنر مقرر کرتا تھا، لیکن جب
جنگ ختم ہو گئی تو لارڈ ملز نے گیارہ غیر سرکاری اور منتخب شدہ یوروپین نمایندوں کو کونسل میں
جگہیں دیں۔ ہندوستانی اور عرب جن کی تعداد یوروپین باشندوں سے دوگنی تھی ان کا حق
نمایندگی بالکل فراموش کر دیا گیا۔

چنانچہ اس کے خلاف ہندوستان میں بھی اور کینیا میں بھی کچھ شورش کی گئی جس کا نتیجہ یہ
ہوا کہ لارڈ ملز نے مجبور ہو کر ہندوستانیوں کو مقامی کونسل میں دو جگہیں دیں اور میونسپل بورڈ

میں کچھ حقوق دلائے یہ مراعات ایسے نہ تھے جو قابل تسلیم ہوتے اور اس کے خلاف شورش بڑھتی جاتی تھی اس لئے مجبوراً حکومت ہند نے ۱۲ر اکتوبر ۱۹۲۰ء کو لارڈ ملز کی خدمت میں ایک مراسلہ روانہ کیا جس میں کینیا کے معاملات اور سیاسیات کے علاوہ ہندوستان کی سیاسی حالت پر بھی تبصرہ کیا گیا تھا۔ اس مراسلہ کا اثر یہ ہوا کہ تمام مسائل پھر ایکبار ۱۹۲۱ء میں ایک کمیٹی کے سامنے غور وبحث کے لئے پیش کئے گئے چنانچہ ارل ونٹرٹن نائب وزیر ہند اور مسٹر وڈ نائب وزیر نوآبادیات نے نہایت کد وکاوش کے بعد حسب ذیل تجاویز پیش کیں۔

۱- کونسل میں گیارہ منتخب شدہ نمایندے ہوں جسمیں چار ہندوستانی ہوں اور سات یورپین

۲- انتخاب عام ہو جس میں ۲۱ برس کے مرد و عورت دونوں رائے دینے کے مستحق ہونگے

۳- اس کے علاوہ بھی حق رائے دہندگی کے لئے ایسی قیود رکھی جائیں کہ صرف ۱۰ فیصدی باشندے رائے دیسکیں۔

۴- اکزیکیٹو کونسل میں ایک غیر سرکاری ہندوستانی نمایندہ لیا جائے۔

۵- نسل و قومیت کی بنا پر باشندوں کی تفریق اور علحدہ علحدہ حلقوں میں تقسیم کرنے کی ضرورت نہیں ہے لیکن مقامی کونسل کو حق ہوگا کہ صحت عامہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے حسب ضرورت قواعد وضوابط بنائے۔

۶- چونکہ ہندوستانیوں کی تعداد روزافزوں ترقی پر تھی اس لئے یورپین آبادی کا یہ مطالبہ تھا کہ قانون کے ذریعہ سے مزید مہاجرین کا داخلہ کینیا میں روک دیا جائے ورنہ کم تعداد یورپین باشندے مغلوب ہو جائینگے، یہ مطالبہ طرح طرح سے پیش کیا جاتا تھا کبھی اقتصادی اور معاشی نقطہ نظر سے کبھی کینیا کے دیسی باشندوں کی بہبودی میں لیکن ونٹرٹن کمیٹی نے یہ فیصلہ کیا کہ اس معاملہ میں حکومت کا طرز عمل برقرار رہے۔

۷- ہائی لینڈز کے متعلق گذشتہ معاہدوں کو پیش نظر رکھکر اس کمیٹی نے فوراً کوئی

تبدیل کر[illegible] سب نہ سمجھا لیکن اسکے ساتھ نائب وزیر ہند نے یہ تجویز منسلک کر دی کہ وہ اس تجویز کے خلاف ہیں اور آئندہ وزیر ہند کو اختیار ہوگا کہ پھر اس مسئلہ کے متعلق کوئی کارروائی کر سکیں۔
یہ تجاویز اسی زمانہ میں شائع ہوئیں جب امپیریل کانفرنس کے اجلاس منعقد ہو رہے تھے اور مسٹر شاستری صاحب نے اپنے نزدیک علاوہ جنوبی افریقہ کے تمام وزراء نو آبادیات سے ہندوستان کے مساوی حقوق تسلیم کرا لئے تھے مسٹر چرچل اب وزیر نو آبادیات تھے انہوں نے یہ تجاویز حکومت ہند اور گورنر کینیا (مسٹر نارتھی) کے پاس پنج کے طور پر محض انکی رائے دریافت کرنے کیلئے بھیجیں حکومت ہند نے رضامندی کا وعدہ کیا، لیکن مسٹر نارتھی جو کینیا کے یورپین باشندوں کے حامیوں میں تھے کسی طرح اس پر راضی نہ ہوئے۔ ہندوستان میں ترک موالات کا زور ہو رہا تھا اور حالت روز بروز نازک ہوتی جاتی تھی جس کا احساس تمام وزراء سلطنت کو تھا اسلئے مسٹر چرچل نے مسٹر نارتھی کو موقوف کر دیا اور ان کی بجائے سر رابرٹ کارنڈن کو کینیا کا گورنر مقرر کر دیا۔ اور انھیں حکم دیا کہ حکومت کی پالیسی کا اب اعلان کر دیں سر رابرٹ کارنڈن صاحب نے اعلان سے پہلے ایک مراسلہ مسٹر چرچل کی خدمت میں روانہ کیا اور اس پر یقین دلانے کی کوشش کی کہ اس پالیسی کے اعلان سے بڑے خطروں کا اندیشہ ہے۔ خطرے کیا تھے؟ یہ بھی آگے چل کر ظاہر ہو جائیگا۔ غرض یہ کہ اس عرصہ میں برطانوی وزارت میں تبدیلیاں ہوئیں اور مسٹر چرچل کے بجائے ڈیوک آف ڈیونشایر علاوہ فائز ہوئے آپنے بھی مسٹر چرچل کی پالیسی کو مناسب خیال کیا اور سر رابرٹ کارنڈن کو تاکید کی ہے کہ وہ اس پالیسی کا اعلان کریں۔ چنانچہ گورنر نے مجوزہ پالیسی فریقین کے حوالہ کر دی گو ہندوستانیوں کے مطالبات کا ایک حصہ بھی اس سے پورا نہوتا تھا مگر بعد اصرار و مجبوری کچھ عرصہ کے لئے اسکو منظور کرنے پر طیار تھے لیکن یورپین آبادی کسی طرح اسپر راضی نہوئی وہ لارڈ ملز کی پالیسی میں کسی قسم کی ترمیم نہیں چاہتے تھے غرض ان کی طرف سے انتہائی شورش شروع ہوئی اور انہوں نے اپنی کانگریس میں یہ فیصلہ کیا کہ اگر وزراء نے ان کے حسب منشاء فیصلہ نہ کیا تو کینیا کی حکومت وہ اپنے ہاتھوں میں لے لینگے اور

برطانیہ سے کوئی تعلق نہ رہیگا۔ نیز یہ کہنا کہ اگر حکومت نے مفاد مخالفانہ کیا تو وہ تلوار سے بھی مقابلہ کرنیکے لئے تیار ہیں۔"

یہ خطرہ تھا جس سے لارڈ کارنتن خائف تھے اور پالیسی کے اعلان سے جھگڑے [illegible] یہ بھی کوئی بتلا دے کہ جن لوگوں نے یہ اعلان جنگ دیا تھا اور حکومت [illegible] زبان [illegible] نے علم بغاوت بلند کیا تھا وہ کس سزا کے مستحق سمجھے گئے؟ ہندی کانگریس پر بارہا [illegible] کے جلسوں پر دفعہ ۱۴۴ کا بھی نفاذ ہوا؟ ان کے لئے بھی کبھی جیلوں کے دروازے کھولے گئے؟ لیکن یہ ستم آرائیاں تو صرف غلامان مشرق کے لئے ہیں جو اگر اپنی مظلومیت پر کبھی آہ سرد بھی کھینچتے ہیں تو توپوں کے دہانے کھل جاتے ہیں ہوائی جہاز سے گولے برسائے جاتے ہیں جیلوں میں بند کئے جاتے ہیں غرض دفعات تعزیرات اور مارشل لا کی بدولت ایک ایک خطا پر سینکڑوں جرم عائد کئے جاتے ہیں اور ہر سزا کے مستحق سمجھے جاتے ہیں۔

کینیا میں باشندگان یورپ کی باغیانہ شورش کا نتیجہ یہ نکلا کہ وزیر نوآبادیات نے فریقین کے جواب چاہا نیز اس غرض سے مدعو کئے کہ لندن [illegible] کوئی فیصلہ کیا جائے، گورنر کینیا بھی اس کانفرنس میں شریک کئے گئے ہندوستان سے مسٹر شاستری کی زیر سرکردگی ایک وفد اپریل ۱۹۲۳ء میں انگلستان روانہ ہوا تاکہ ہندوستانیوں کے مطالبات ذیل پیش کرے۔

۱۔ تمام متمدن اقوام کے لئے مساوی حقوق ہوں۔

۲۔ لارڈ چمسفورڈ کے اعلانات ۱۹۲۰ء کی پابندی۔

۳۔ فہرست رائے دہندگان سب باشندگان کے لئے ایک ہی ہو اور قیود ایسے عائد کئے جائیں کہ جن لوگوں کے پاس تھوڑی سی جائداد بھی ہو اور کوئی ایشیائی زبان جانتے ہیں جو سلطنت برطانیہ کے [illegible] دے سکیں۔

۴۔ یورپین نمائندوں کے برابر ہندوستانی نمائندے [illegible] کونسل اور لیجسلیٹو کونسل میں لئے جائیں۔

۵۔ ہائی لینڈز میں ہندوستانی جاگیریں خرید سکتے ہیں۔
۶۔ ہندوستان کے جو باشندے کینیا میں جاکر آباد ہونا چاہیں اُن کے لیئے کسی قسم کی رکاوٹ نہو۔
۷۔ تمام سرکاری دفاتر میں ملازمت کی راہیں ہندوستانیوں کیلئے بھی کھلی رکھی جائیں۔
۸۔ جو قوانین قومیت اور نسل کی بنا پر نافذ کئے گئے تھے منسوخ کردئے جائیں۔

ان مطالبات پر غور و خوض کرنیکے بعد جو فیصلہ خداوندان آگاہی نے صادر فرمایا وہ ۲۴ جولائی ۱۹۲۳ء کو صحیفہ یعنی ہوائٹ پیپر میں شائع کیا گیا اور اُسکی تفصیل ذیل میں درج ہے۔

۱۔ ہندوستانیوں کے پانچ نمایندے لیجسلیٹو کونسل میں لئے جائینگے اور ان نمایندوں کا انتخاب ملی اصول پر عمل میں آئیگا یوروپین باشندوں کے گیارہ نمایندے برقرار رہینگے۔ سرکاری نمایندوں کی کونسل میں اکثریت رکھی جائیگی۔ عربوں کا ایک ایک منتخب نمایندہ لیجسلیٹو کونسل میں ہوگا اور ایک ممبر ایکزیکٹیو کونسل میں خود حکومت مقرر کریگی۔
۲۔ اکزیکٹیو کونسل میں کوئی تبدیلی فی الحال نہو گی علاوہ اس کے کہ ایک ممبر کا اور اضافہ کیا جائیگا، لیکن اس جگہہ پر عیسائی مبلغین کی جماعت میں سے کسی شخص کو ترجیح دیجائیگی تاکہ وہ افریقہ کے دیسی باشندوں کی نمایندگی کرسکے۔
۳۔ شہروں میں ایشیائی اور یوروپین باشندوں کو علیحدہ علیحدہ رہنے کے لئے قانون نافذ کیا گیا تھا اب منسوخ کردیا جائیگا۔
۴۔ ہائی لینڈز میں جاگیروں کا عطایا اور اُس کے بیع کے متعلق جو طریقہ عمل ابتک رہا ہے آیندہ بھی وہی رہیگا، لیکن دوسرے مقامات پر کچھ آراضیاں ہندوستانیوں کے لئے بھی مخصوص کردیجائینگی اور صرف اُن لوگوں کو ایک مقررہ زمانہ کیلئے دیجائیں گی جو اُس زمین کو بہتر بنانے کا وعدہ کریں لیکن اگر اس عرصہ میں کوئی شخص اپنی زمین کو پیداوار کے قابل نہ بنا سکا تو حکومت اُس زمین کو واپس لینے کی مجاز ہوگی۔ باقی آیندہ

۳۰۱

اقطابِ انگورہ

شہید حریت احمد جمال پاشا

ترکانِ انگورہ کو آج استقلال و حریت کے جو حیات افروز لمحات نصیب ہوئے ہیں اور مقام العلیٰ خلافت کے حفظ و استقلال کی جو افتخار اندوز ساعت عالم اسلام کو میسر آئی ہے وہ ہز اکسلنسی امیر البحر مارشل جمال پاشا لفٹننٹ گورنر شام کی بہت زیادہ مرہون منت ہے، ممدوح نہ صرف حکومت انگورہ کے موسسین میں ایک ممتاز مرتبہ لیڈر تھے بلکہ آپکی آخری خدمات نے اناطولیہ و ترکستان سے لے کر تاشقند و افغانستان اور شمالی ہندوستان کو جن بیدار کن طریق پر متاثر کیا اُس سے اسلامی تاریخ کے صفحات ہمیشہ جگمگاتے رہیں گے ترکی قوم کا یہ جلیل القدر سپاہی انگورہ گورنمنٹ سے وہی تعلق رکھتا تھا جو خود بانی انگورہ گورنمنٹ شوکت پناہ مصطفےٰ کمال پاشا کو حاصل ہے، وہ ابتدائی اسکیم جو آخر ۱۹۱۸ء میں مقام "حلب" انگورہ گورنمنٹ کی تاسیس کے لیے طیار ہوئی تھی احمد جمال پاشا کے قیمتی مشورے سے مزین تھی، اور یہ امر واقع ہے کہ قہرمان ترکی مارشل مصطفےٰ کمال پاشا کو حلب سے اناطولیہ جانے کے لئے احمد جمال پاشا نے جو سہولتیں بہم پہونچائیں یہ اُنھیں کا نتیجہ تھا کہ کمال ممدوح اناطولیہ میں "تحریک انگورہ" کو فروغ دینے میں کامیاب ہو گئے۔

احمد جمال پاشا کا وطن "مدلہ" اور سال پیدائش ۱۸۷۲ء ہے آپ ترکی، فارسی، عربی اور روسی، زبانوں کے ماہر اور زبردست قانون داں تھے آپ فوجی تعلیم سے فارغ ہو کر ترکی سپاہ میں داخل ہوئے کچھ عرصہ بعد آپ کو ترکی گورنمنٹ نے "اسکوار" کا حاکم اعلیٰ مقرر کیا پھر آپ "ادنہ" کے حاکم مقرر ہوئے پھر "بغداد" کے لفٹننٹ گورنر [illegible] کچھ عرصہ بعد قسطنطنیہ کے ڈپٹی مقرر ہوئے، اس سلسلہ اعتبار سے کہ ترکی [illegible] کمالات ہوتے ہیں احمد جمال پاشا ڈپٹی کے عہدہ سے پھر فوجی لائن میں

بدل دیئے گئے اور آپ پہلی ترکی اسکواڈرن کے کمانڈر انچیف کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے، احمد جمال پاشا مشہور حکمراں ترکی جماعت "انجمن اتحاد و ترقی" کے اُن مخصوص بلند مرتبہ ارکان میں تھے جو انجمن کی جان کہے جاتے ہیں ممدوح الصدر انجمن اتحاد و ترقی کے سیکرٹری اور پریسیڈنٹ بھی رہ چکے تھے، حضرت جمال پاشا کی یہ اُن خدمات کا نہایت ہی مختصر اجمال ہے جو جنگ یورپ سے پہلے آپ نے انجام دیں، اور جن کی شرح ایک طویل داستان ہے۔

۱۹۱۵ء ترکی قوم کے ابتلا و آزمائش، آلام و مصائب کا نہایت صبر آزما سال تھا جبکہ ترکی حکومت جنگ فرنگ کے نازک ترین دور سے گزر رہی تھی، روسی محاذ کی حوصلہ شکن مصروفیت کے باوجود ترکی مقبوضات عراق کی حفاظت و صیانت اور ولایت شام و فلسطین کا تحفظ ایک عقل سوز مہم تھی جہاں اندرون ملک جاہل عربوں بدوؤں کے گروہوں اور متفرق قبائل کو ترکی گورنمنٹ کا وفادار رکھنا اور محاذ جنگ پر فوجوں کی ترتیب ترسیل وغیرہ مہمات مسائل تھے جن کی رُوبراہی ایک فاضل و پختہ کار جنگی و سیاسی لیڈر ہی کر سکتا تھا، چونکہ ترکی گورنمنٹ جمال پاشا ممدوح کی سیاسی و جنگی بلند پایگی سے اچھی طرح واقف تھی اس لیئے آپ کو شام و فلسطین کی ٹرکی سپاہ کا کمانڈر انچیف بنایا گیا اور جمال پاشا دمشق میں آ گئے، آپ نے نہر سویز عبور کرنے کے لیئے جو جد و جہد فرمائی وہ مہمات جنگ کی ایک لاجواب نظیر ہے، جمال پاشا ممدوح نے باوجود ریلوے لائن اور ریلوے ذرائع کے فقدان کے ترکی سپاہ اور ترکی محاذوں کا جو انتظام فرمایا اُس کی تفصیل جمال پاشا کی جنگی مہارت کا حیرت انگیز کارنامہ ہے، شام و فلسطین اور عراق کے متعلق خود جمال پاشا مرحوم نے "تذکرہ" کے نام سے ایک جامع "تاریخ" لکھی ہے اور جس کا اُردو ترجمہ شاید ہندوستان میں شائع ہو گیا ہے اور جس کے چند حصے مصر کے مشہور عربی رسالہ "الہلال" نے شائع کیئے

ہیں ان کے دیکھنے سے جمال پاشا کی خداداد فراست و جنگی تدبر کا کافی اندازہ ہو سکتا ہے جہاں ممدوح نے باوجود گوناگوں مشکلات کے "انتظام و انصرام" اور سیاست و مآل اندیشی کے حکمت اندوز نمونے پیش کیے ہیں، یہ جمال پاشا ہی کی مقتدر اور سیاست شناس ہستی تھی جس نے باغی عربوں سے ترکی حکومت کے مفاد کو عرصہ تک محفوظ رکھا، آپ نے "عربی بغاوت" کی روک تھام میں جن مساعی اور ذرائع سے کام لیا وہ "مجلۂ الہلال مصری" یا آپ کے خود نوشت "تذکرہ" ہی کے دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں، یہ آپ ہی کا تدبر پناہ اور حقیقت آگاہ دماغ تھا جس نے عربی ہیجان کو قبل از وقت محسوس فرما کر ترکی فوجوں کو صحیح سالم روسی محاذ پر منتقل کرنے اور سرکاری قیمتی اشیاء کو قسطنطنیہ پہونچانے کی تدابیر اختیار کیں۔

مذکورہ حالات کے بعد ترکی حکومت کا وہ پُرآشوب دور شروع ہوا جس نے کئی صدی کے بعد ترکی قومیت کو تباہ کن مصائب کے عمیق گڑھے میں ڈال دیا، ترکی فوجوں کے ہتیار ڈالتے ہی ملک میں عام ہیجان و برہمی کے مہلک اثرات پھیل گئے، التوائے جنگ کی درخواست پیش ہوتے ہی ترکی کے ممتاز مرتبہ لیڈروں نے وطن عزیز کو خیرباد کہنا شروع کر دیا، حضور دانش پناہ احمد جمال پاشا عین اوس دن (۱۰ اگست ۱۹۱۸ء) جبکہ معاہدۂ التوائے جنگ پر دستخط ہوئے ایک جرمن جہاز پر مع اہل و عیال قسطنطنیہ سے بندرگاہ "سباسٹپول" چلے گئے اور یہاں چند قیام کے بعد آپ "برلن" جا پہونچے، جب قسطنطنیہ پر اتحادی غلبہ مستحکم ہو گیا تو اتحادیوں نے قسطنطنیہ کی نام نہاد ترکی گورنمنٹ کی وساطت سے "انجمن اتحاد و ترقی" کے سربرآوردہ ارکان کو گرفتار کرانا چاہا، اور اس سلسلہ میں احمد رفعت پاشا ترکی سفیر مقیم برلن نے جرمن گورنمنٹ سے جمال پاشا کی حوالگی کی درخواست کی، چونکہ جرمن گورنمنٹ ارکان اتحاد و ترقی کی طرفدار تھی اوس نے فوراً جمال پاشا کو جرمنی حدود چھوڑ دینے کا اشارہ کیا اور اس طرح جمال پاشا کو اتحادیوں کے ہاتھ چڑھنے سے بچا لیا، حضور جمال پاشا جرمنی سے "سوئزرلینڈ" اسی لئے چلے

آپ نے قصبہ "گوس ترس" میں مستقل اقامت اختیار فرمائی، قصبۂ گوس ترس" میں آپ نے اپنا نام "خالد بے" رکھ لیا اور ایک بخیر کی حیثیت اختیار فرما کر ... قصبہ گوس ترس اب تک سوئٹزرلینڈ میں آپ کا اِل آٹھ ماہ مقیم ہے، اور اسی اقامت کے ... دن میں آپ نے اپنی یادداشتیں مرتب کیں، یہ وہ معرکۃ الآرا سیاسی یادداشتیں ہیں، جن کا مجموعہ یورپ کی تمام زبانوں میں شائع ہو چکا ہے، غرض جب جرمنی میں امن وامان قائم ہو گیا تو آپ سوئٹزرلینڈ سے "فونگ" میں تشریف لے آئے اور مستقل قیام اختیار فرما لیا۔ مئی ۱۹۱۹ء میں اناطولیا میں سالار ملت دین پناہ غازی مصطفےٰ کمال پاشا کی تحریک کا آغاز ہوا، جس کی طرف تمام کی نگاہیں اُٹھنے لگیں، اور تاڑنے والوں نے تاڑ لیا کہ اناطولی ویرانوں کی یہ حقیقت تحریک ایک دن سارے مشرق کو بیدار کر دے گی لہٰذا ناممکن تھا کہ جمال پاشا ایسا عظیم الشان مدبر اس وقت خاموش بیٹھا رہتا، آپ فوراً جرمنی سے روس تشریف لے گئے مخالفین تو آج تک یہی کہتے ہیں کہ انور وجمال کو "انگورہ تحریک" سے کوئی تعلق نہ تھا لیکن جو لوگ ترکوں کی قوم پرستی، ملت اور "وحدت خیال" سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ انور وطلعت، اور خلیل وجمال نے "انگورہ تحریک" کو کامیاب بنانے کے لئے کیسی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں؟

مارشل جمال پاشا جب ماسکو پہونچے تو آپ نے کوشش کی کہ کسی طرح انگورہ اور ماسکو گورنمنٹ میں اتحاد عمل پیدا ہو جائے اور مشرق کی یہ دونوں طاقتیں متحد ہو کر دشمنوں کے مقابل آجائیں، چنانچہ آپ ابھی ماسکو میں سرگرم عمل ہی تھے کہ انگورہ گورنمنٹ کے ذی عہدہ نمائندہ ڈاکٹر بکر سامی بے ماسکو پہونچے ڈاکٹر بکر سامی اور جمال پاشا کی متفقہ کوششوں سے انگورہ و ماسکو گورنمنٹ میں ایک معاہدہ اتحاد ہو گیا، ڈاکٹر صاحب تو انگورہ واپس آگئے لیکن جمال پاشا روس ہی میں رہے جہاں آپ نے وسطی ایشیا کو بیدار و آمادہ کرنے کے لئے ایک زبردست لائحہ عمل تیار کیا، یہ وہ وقت ہے جبکہ ماسکو گورنمنٹ ... اپنے اثرات کی اشاعت چاہتی تھی اور اس کا ارادہ تھا کہ ... [illegible]

افغانستان تک بالشویک اثرات وسعت پذیر ہو جائیں، تاکہ کسی مناسب موقع پر وہ ہندوستان پر ایک کامیاب ضرب لگانے کے قابل ہو سکے، ادھر ترکی لیڈر بھی چاہتے تھے کہ جس طرح ممکن ہو انگریزی مفاد کو نقصان پہونچایا جائے لہٰذا ماسکو میں جمال پاشا کو ان خدمات کا بہترین ذریعہ تصور کیا گیا اور آپ کو ماسکو کے محکمہ خارجہ میں "معاملات شرقیہ" کا چیف ڈائرکٹر مقرر کیا گیا، خیال تھا کہ جمال پاشا بالشویک گورنمنٹ کی خیر سگالی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھیں گے لیکن جمال پاشا کے پیش نظر ایک دوسری اسکیم تھی اور آپ چاہتے تھے کہ وسط ایشیا میں مسلمانوں کی متعدد و متفرق جماعتوں اور ریاستوں کا ایک زبردست "جامعہ" بنا دیا جائے، جس کا مرکز "تاشقند" ہو، لہٰذا اس خیال سے آپ نے "تاشقند" میں اپنا ہیڈ کوارٹر مقرر کر کے عملی کام شروع کر دیا، گو بظاہر کچھ عرصہ تک آپ یہاں بالشویک مقاصد کو تقویت پہونچاتے رہے لیکن یہ صرف اس لئے کہ آپ کو بالشویک ذرائع سے اسلامی مصالح کو استوار کرنا تھا، تاشقند میں جمال پاشا کے ساتھ ترکی جنرلوں اور ترکی لیڈروں کی ایک طاقتور جماعت تھی جس کے ذریعہ انگورہ تحریک کو فروغ دیا جاتا تھا، البتہ ابتدا میں اس تحریک پر بالشویک رنگ چڑھایا گیا تھا، جب جمال پاشا نے انگورہ تحریک کو فروغ دینا شروع کیا تو بالشویک گورنمنٹ جمال پاشا سے بدظن ہو گئی اور آپ کو دوبارہ ماسکو طلب کیا گیا، اس طلبی کے موقع پر آپ کو بالشویک سفیر "ایم سوریٹز" سے ملایا گیا جو اصل میں جمال پاشا کا نگراں تھا، اور اسی موقع پر آپ کے عملہ تبلیغ میں مشہور انقلابی علامہ برکت اللہ بھوپالی کا بھی اضافہ کیا گیا علامہ برکت اللہ بھوپالی کی شرکت سے جمال مشن میں زبردست اضافہ ہو گیا، کیونکہ ممدوحین میں "تحریک اتحاد اسلامی" کے خیالات یکساں موجود تھے، اور دونوں "پان اسلامزم" کے زبردست مؤید تھے، علامہ برکت اللہ بھوپالی ایک راسخ العقیدہ اور متبحر ہندی عالم ہونے کے ساتھ ہی نہایت مشہور انقلابی ہیں، جب سے آپ نے ہندوستان کو خیر باد کہا ہے آپ "تبلیغ اسلام" اور "تحریک پان اسلامزم" کے سرگرم کارکن رہے ہیں، ممالک مغربی خصوصاً

چین و جاپان میں علامہ برکت اللہ بھوپالی نے اسلام و اسلامیت کی تبلیغ و اشاعت میں
میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں، وہ سیاسی نقطۂ نظر سے علامہ جمال الدین افغانی کے تبع
ہیں، وہ ۱۹۰۹ء میں جاپان ٹوکیو یونیورسٹی میں ہندوستانی زبانوں کے پروفیسر اور اخبار
"اخوۃ اسلام" کے چیف ایڈیٹر و مالک تھے تو انھوں نے افغانی قوم کو اسلامی مرکزیت
میں جذب ہونے کے لیے "سراج الاخبار کابل" کے ذریعہ پرجوش دعوت دی تھی، وہ ۱۹۱۵ء میں
برلن کے محکمۂ شرقی میں ہندی قیدیوں کو انقلابی خیالات کی تعلیم دیتے تھے اور پھر ایک طاقتور
جرمن مشن لے کر وہ افغانستان گئے تھے، غرض اب جمال پاشا اور علامہ برکت اللہ بھوپالی
کا اتحاد عمل بخارا و افغانی قوم کی بیداری کا ایک مبارک ذریعہ تھا، جمال پاشا نے تاشقند
و بخارا میں ایک تبلیغی مدرسہ قائم کیا جس کے ذریعہ بالشویک پروپیگنڈا کیا جاتا تھا اور اس
تمام پروپیگنڈا کے مصارف بالشویک گورنمنٹ برداشت کرتی تھی، یہ وہ وقت ہے جبکہ جمال پاشا
کے متعلق نہایت غلط اور مبالغہ آمیز خبریں شائع ہوتی رہتی تھیں؛ تھوڑے عرصہ بعد
یعنی اکتوبر ۱۹۲۰ء میں وہ افغانی حدود میں داخل ہوئے چونکہ افغانی قوم اور تاجدار
افغانستان آپ کی بلند مرتبہ شخصیت سے پہلے ہی واقف تھے اس لیے آپ کا نہایت
شاندار استقبال کیا گیا، اس میں شک نہیں کہ آپ افغانستان میں بالشویک ذرائع سے
داخل ہوئے تھے لیکن چند ماہ بعد ہی تاجدار افغانستان نے آپ کی خدمات کو افغان گورنمنٹ
کے لیے حاصل کر لیا، اور آپ کو افغانی کیبنٹ میں "وزیر جنگ" کا عہدہ سپرد کیا گیا، اس وقت
افغانی فوجیں نہ تو جدید قواعد و ضوابط سے واقف تھیں اور نہ اُن کے پاس جدید قسم کے
آلات حرب تھے لیکن جمال پاشا نے اپنی ممتاز جنگی مہارت کے ذریعہ اس کمی کو بہت جلد پورا
کر دیا، اور تمام افغانی فوجوں کو ایک نئی ترتیب کے ساتھ آراستہ کر دیا، آپ نے اس عرصہ
میں سرحدی قبائل کی اصلاح میں بھی نمایاں اصلاحات فرمائیں اور بعض تجربہ کار ترکی جرنیلوں
کو ان کا نگراں مقرر کر کے اُنھیں افغانستان کی مرکزی فوجوں سے متعلق کر دیا، جس وقت

جمال پاشا قبائل کی اصلاح میں سرگرم تھے اُن کے خلاف ہندوستان میں پروپیگنڈا کیا جارہا تھا اور سرحدی علاقہ میں ہر وقت ایک نئی جنگ کا خطرہ محسوس کیا جاتا تھا حضرت محترم جمال پاشا نے ترکستان و تاشقند، اور افغانستان و شمالی ہند تک جن اسلامی مصالح کو تقویت بہم پہونچائی اُن کی تفصیل سے چونکہ اخبار بیں طبقہ اچھی طرح واقف ہی اس لئے اب صرف یہ بتا دینا کافی ہی کہ آپ وسط سنہ ۱۹۲۲ء میں افغان گورنمنٹ کے لئے جدید اسلحہ اور سامان حرب و ضرب خریدنے کے لئے جرمنی و فرانس تشریف لے گئے، جہاں سے وہ انگورہ اور اپنے وطن عزیز تشریف لے جانے والے تھے، اُس وقت آپ کے اہل و عیال "طفلس" میں تھے، جب آپ جولائی سنہ ۱۹۲۲ء میں "طفلس" پہونچے اور ایک دن بازار میں اپنے جنگی ایڈی کانگ ثریا بے، اور نصرت بے، کے ساتھ "جو فکروسکی اسٹریٹ" کے گوشے پر پہونچے تو یکایک آپ پر گولی چلائی گئی اور جمال پاشا تین گولیاں کھا کر گر پڑے اسی طرح مرحوم نصرت بے پر پانچ گولیاں چلائی گئیں اور وہ بھی گر پڑے، ثریا بے، یہ دیکھ کر فرار ہونا چاہتے تھے کہ "دبولاک اسٹریٹ" پر پہونچتے ہی اُن پر حملہ کیا گیا اور اس طرح اسلام و اسلامیت اور ملت غرا کے یہ تابان و درخشندہ تارے طفلس میں ہمیشہ کے لئے ڈوب گئے۔ انا للہ الخ

حلیہ و خصائص ۔ مارشل جمال پاشا متوسط قامت اور نہایت وجیہ آدمی تھے چہرا ابھرا ہوا آنکھیں بڑی بڑی، اور نہایت خوشنما گھنی داڑھی مونچھیں جرمنی طریق کی اوپر کو چڑھی ہوئیں، یورپین لباس پر اناطولی ٹوپی زیب سر فرماتے تھے، مزاج کے نہایت حلیم اور بردبار آدمی تھے، گو غصہ بہت کم آتا تھا لیکن چہرہ سے جنگی شہامت و تدبر کے پر جلال آثار ہویدا تھے۔

ملا توحیدی،

جاپان اور زلزلے

جاپان چینی لفظ نیفن کی بگڑی ہوئی صورت معلوم ہوتی ہے۔ نیفن کے معنی The land of Rising sun کے ہیں۔ چونکہ جاپان چین کے مغرب میں ہے اور صبح کو اسی طرف چینی آفتاب کو طلوع ہوتے دیکھا کرتے تھے۔ اسی مناسبت سے وہ ان جزائر کو نیفن پکارنے لگے۔ اور خدا کی عجیب قدرت کہ جاپان نے دورِ جدید میں مغربی اقوام کے ساتھ ساتھ تہذیب و تمدن میں جو مقابلہ کیا تو اُس کی ترقی کا آفتاب اس طرح طلوع ہوا کہ چینیوں نے جو نام رکھا تھا وہ صادق آیا۔ جاپان سے مراد وہ تمام حصہ ہے جو ایشیا کے مغربی ساحل پر شمال میں جزیرہ سکھالین سے لے کر جنوب میں جزیرہ فارموسا تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ تمام جزائر شمار میں کم و بیش ایک ہزار ہیں۔ اس میں سب سے بڑا ہانشیو یا ہانڈو کہلاتا ہے۔ یہ جاپان کا اصل حصہ ہے۔ اسی جزیرہ میں دار السلطنت ہے۔ اہم تعلیمگاہیں مختلف کارخانجات دفاتر سرکاری اور سفارتخانے وغیرہ بھی اسی جزیرے میں ہیں۔ جاپان کا مشہور آتش فشاں پہاڑ فوجی یامہ بھی اسی حصہ میں ہے۔ اور یہی حصہ ہمیشہ سب سے زیادہ زلزلوں کی زد میں رہا ہے۔

بیسویں صدی سے قبل جاپان کا دروازہ غیر اقوام کے لیئے بالکل بند تھا۔ خود جاپانی کسی دوسرے ملک میں نہیں جایا کرتے تھے۔ البتہ ہندوستان بطور جاترا کے اکثر آتے تھے اور چند یوم کی سیاحت کے بعد واپس ہو جاتے تھے یہی وجہ تھی کہ جاپانی تہذیب پر آئینی اثر بالکل نہ پڑا تھا۔ شوگن جماعت جو اُس وقت حکمراں تھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یورپ کی حرص و آز کو خوب سمجھ گئی تھی۔ یہ جماعت سپاہیوں کی ایک چھوٹی سی جماعت تھی جو حکومت کرتی تھی جس طرح سے فرانس کے (Mayors of Palace) تھے یہ جماعت بھی اسی طرح بنی تھی اور اپنا نام شوگن قرار

دیا تھا۔ اس نے قدیمی شہنشاہ کو جو مکاڈو کہلاتا ہے معزول کر دیا اس جماعت نے مغربی اقوام کو سوائے ڈچ کے (وہ بھی صرف ایک بندرگاہ سے) جاپان میں داخل ہونے کی ممانعت کر دی تھی [illegible] اگر کوئی اس حکم کے خلاف ورزی کرتا تھا تو اُسے موت کی سزا ملتی تھی ۱۸۵۳ء میں ایک امریکن مسمی کموڈور پیری ایک بیڑہ لے کر جس کی تاب جاپان نہ لا سکتا تھا خلیج یڈو میں آپہونچا اور جاپان کو ایک تجارتی صلحنامہ کرنے پر مجبور کیا۔ اس صلحنامہ کی ماتحت امریکہ کے لیئے جاپان کے کئی بندرگاہ کھل گئے اور سلسلۂ تجارت آمد و رفت شروع ہو گئی۔ اس کے بعد یورپ کی بحری اقتدار رکھنے والی سلطنتوں نے بھی ہمت کی اور جاپان نے مثل چین کے بالآخر اپنے تمام بندرگاہ کھول دیئے ان آئینی اقوام خصوصاً یورپین قوموں کے جاپان میں داخل ہونیکا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۶۸ء میں ایک انقلاب ہوا اور شوگن جماعت معزول اور حکومت پھر قدیم شاہی خاندان مکاڈو کو مل گئی۔ غرضیکہ بیسویں صدی کے اوائل سے جاپان نے مغربی تہذیب کو قبول کرنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ اب اُس کے شہر تقریباً تمام مغربی آسائشوں سے پُر ہیں یورپ کے طرز کی پارکیں، ہوٹل، ریسٹارن، سینما، تھیٹر، ٹرامویے، ٹیلیفون، برقی روشنی گیس پائپ، یہ تمام چیزیں اب ہر بڑے جاپانی شہر میں پائی جاتی ہیں۔

باوجودیکہ جاپان زلزلوں اور کوہ آتش فشاں پہاڑ کی تباہیوں کا ہمیشہ آماجگاہ رہا ہے مگر پھر بھی کوئی قوم اپنی حکمراں شاہی خاندان کی قدامت پر اتنا نازاں نہو گی جتنا کہ جاپانی۔ مکاڈو خاندان پورے پچیس صدی سے چلا آرہا ہے گو درمیان میں شوگن جماعت نے اس خاندان کو حکومت سے معزول کر دیا تھا مگر جاپانی قوم ہمیشہ اس خاندان کے ارکان کو عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتی رہی۔

جاپان اپنی صناعی، اپنی مخصوص طرز معاشرت کے علاوہ اپنے زلزلوں کی وجہ سے زیادہ مشہور ہے جاپان میں جس کثرت اور تسلسل سے زلزلے آئے ہیں اور جس قدر جانی و مالی نقصانات جاپان نے اس ہیبت ناک عذاب سے اُٹھائے شاید بہت سی قوموں نے لڑائیوں

میں بھی نہ اُٹھائے ہوں گے۔ جاپان کی تاریخ بتلاتی ہے کہ ہزاروں زلزلوں میں ہزاروں جانیں
تلف ہوئی ہیں اور بڑی بڑی بربادیوں کا جاپان کو سامنا کرنا پڑا ہے۔

یکم ستمبر ۱۹۲۳ء کی دوپہر کو جاپان کے لئے مہیب ترین ماتم خیز دو منٹ کی گھڑی آئی کہ جس کے دو منٹ
کے اندر ٹوکیو کا خوبصورت شہر اور اس کا حسین بندرگاہ یاکوہاما نیز شہر [illegible] اور
اطراف کے بہت سے مواضعات اپنی تمام چہل پہل کے ساتھ اس طرح مٹ گئے کہ تباہ و برباد
ہو گئے کہ اس کی یاد سے انسانی خیال لرز جاتا ہے۔ دنیا کے اکثر حصوں میں زلزلے آئے ہیں خود
جاپان کے تمام گزشتہ زلزلوں سے بڑھ کر یہ زلزلہ اپنی تباہ کن اور بربادی خیز نوعیت میں
یکتا تھا۔ ٹوکیو کا قدیمی نام یدو تھا۔ شوگن حکومت کے انقلاب کے بعد جب میکاڈو خاندان پھر
برسر حکومت ہوا تو اس نے دار السلطنت کا نام بدل دیا اور ٹوکیو رکھا۔ جس کے لفظی معنی
"مغربی دار السلطنت" کے ہیں۔ موجودہ عہد کے تمام شہروں میں یہ عظیم الشان شہر شمار کیا جاتا
تھا۔ یہ شہر اپنی وسعت میں یکتا تھا۔ شہر کے اندر کئی نہریں اور بہت سی پارک و باغات تھے۔
اس کا رقبہ [illegible] مربع میل تھا۔ اس کی آبادی ۲۸۶۰۰۰۰ نفوس کی تھی۔ شہر کی خاص سڑک
گنسزا پر ٹریموے اور یورپ کی وضع کی دکانیں تھیں جن میں ہر مذہب کی عبادت گاہیں تھیں۔ اساکوسہ
حصہ میں ایک اتنا عظیم الشان اور وسیع مندر تھا کہ اس کے احاطہ کے ساتھ کئی تھیٹر گاہیں۔
تیر اندازی کے لئے کافی جگہ، چائے خانے ہوٹل وغیرہ ڈالے ہوئے تھے جن سے عبادت گاہ کے
ارد گرد شام کو ایک عجیب تماشا لگ جاتا تھا۔ اسی طرح سے یاکوہاما جاپان کا سب سے وسیع
بندرگاہ تھا۔ جو بیس میل سمندر پر واقع تھا۔ اس بندرگاہ سے ۲۴۲۲۷۰۰۰۰۰ روپیہ کی قیمت کا
مال سالانہ جاپان میں آتا تھا۔ اور اسی طرح ۲۰۰۶۵۷۰۰۰۰ روپیہ کی قیمت کا مال سالانہ باہر
جایا کرتا تھا۔ اس بندرگاہ سے سالانہ ۲۳۲۴۰۰۰ ٹن کا مال آتا جاتا تھا۔ [illegible]
بندرگاہ کی وسعت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ [illegible]
زیادہ تر یورپ کے باشندے آباد تھے [illegible]۔

اُنھیں کے مذاق کے مطابق یہ شہر تعمیر ہوا۔ یاکوہاما کی آبادی ۲۵۰۲۶ ہوتی - جاپان کے یہ دونوں شہر اپنی تمام شان و شوکت کے ساتھ یکایک منہدم نظر آنے لگتے ہیں - ایک خاک کا تودہ یا دل کی طرح ..... آتا ہے - اور جاپان کا یہ نامور شہر اور عظیم الشان بندرگاہ اس طرح تباہ ہو جاتا ہے کہ جو حصے زلزلے کی زد سے بچ جاتے ہیں اُن میں گیس کے نلوں کے پھٹ جانے سے آگ لگ جاتی ہے اور لکڑی کا تمام حصہ جل کر خاک سیاہ ہو جاتا ہے - ذرا اُس شہر کی حالت کا خیال کرو جو ابھی چند لمحہ قبل ایک تجارتی منڈی، ایک چلتے پھرتے لوگوں کی بستی، زندہ انسانوں کی آبادی تھی یکایک خاک کا ڈھیر، راکھ کا انبار اور جلے ہوئے مکانات کے ڈھانچے میں تبدیل ہو جائے اور جہاں اب سوائے لاشوں کے اور کوئی زندہ جسم نظر نہ آئے - انسانی جانوں کی بربادی کی یہ کیفیت تھی کہ ایک معمولی سی بنک کی عمارت میں آگ لگ جانے سے ستر جانیں فوراً تلف ہو گئیں - کوئی گھر نہیں بچا کہ جس میں کئی کئی جانیں نہ ضائع ہوئی ہوں -

جاپان نے گزشتہ تہائی صدی میں بڑی ترقی کی اور قریب قریب ہر شعبہ میں اُس نے مغربی اقوام کے ہم پلہ ہونے کی کامیابی کے ساتھ کوشش کی تھی - جاپان پر گزشتہ کبھی زلزلے سے اتنی تباہی و بربادی نہ آئی تھی جتنی کہ اس آخری زلزلہ سے - انسانی جانوں کی بڑی تباہی کی وجہ یہ ہوئی کہ ٹوکیو اور یاکوہاما میں لندن کی طرح گیس کے نل لگا دئے گئے تھے - جو زلزلے کے دھکوں سے پھٹ گئے اور جن کی وجہ سے مکانات میں آگ لگ گئی - اگر جاپان کے شہران مغربی تعیشات سے آراستہ نہ ہوتے تو شاید گزشتہ زلزلوں کی طرح اس قدر جانیں تلف نہ ہوتیں جاپان کی مغرب پرستی کا اس وقت ایشیا کی سادہ زندگی اور حسن معاشرت سے مقابلہ کرو تو دونوں کا فرق ..... عبرت انگیز نقشہ پیش کرتا ہے -

..... کہ جاپانی قوم کو قدرت نے زلزلوں اور آتش فشاں پہاڑوں کی مصیبت ..... قوت ..... کہ وہ ..... انسان ..... [illegible]

ہو سکے۔ اور تباہی کے بعد فوراً ہی تعمیر میں منہمک ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ گذشتہ زلزلہ کے بعد ہی فوراً ٹوکیو کو از سر نو تعمیر کرنے کے لئے ایک کمیٹی بنا دی گئی جس کے ساتھ اتحاد عمل کے لئے رعایا سے ایک شاہی پیام میں درخواست بھی کی گئی ہے، یہ کمیٹی جلد سے جلد اسکیم اور خاکہ تیار کرنے کے بعد تعمیر کا کام شروع کرے گی۔ جاپانی گورنمنٹ ایسے تباہی کے موقعوں پر اپنی رعایا کے ساتھ جس قدر مراعات اور آسانیاں بہم پہونچا سکتی ہے کبھی دریغ نہیں کرتی چنانچہ گذشتہ زلزلہ کے بعد سے حکومت نے جہاز اور ریل کے سفر کو مفت کر دیا ہے۔ اور تباہ شدہ حصے کو دریا فارموسا، یا چین جانے والے کو کچھ نہیں خرچ کرنا پڑتا۔ اسی طرح سے مصیبت زدہ حصوں میں تمام ذرائع باربرداری کا مفت انتظام ہے۔ ڈاکخانہ، تار، ٹیلیفون وغیرہ بھی پبلک کے استعمال کے لئے عام کر دئے گئے ہیں اور کسی قسم کا محصول یا معاوضہ نہیں دینا پڑتا۔ تمام سرکاری ٹیکس اٹھا لئے گئے ہیں۔ گورنمنٹ نے ۹۵ لاکھ ین جو قریب ڈیڑھ کروڑ روپیہ کے ہوتا ہے امداد کیلئے منظور کئے ہیں۔ شاہی خاندان نے بھی اپنی جیب خاص سے ایک کروڑ ین بدیں غرض عطا کئے ہیں۔ دوسرے ممالک سے بھی برابر امداد پہونچ رہی ہے خصوصاً اس موقعہ پر برطانیہ اور امریکہ اپنی ہمدردی اور فیاضی کا ثبوت دے رہے ہیں۔ امریکہ نے تو چالیس کروڑ ڈالر کی امداد منظور کی ہے۔ اور برطانیہ کی خاطر غریب ہندوستان سے بھی لارڈ ریڈنگ صاحب بالقابہ جاپان ریلیف فنڈ میں روپیہ وصول کر رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت جاپان پر ہمدردی کا جادو چلانا مقصود ہے۔ اور یہ "سیاسی" ہمدردیاں آیندہ کی کسی تجارتی مراعات کی پیشنگوئی کر رہی ہیں ورنہ برطانیہ اور امریکہ کو تو ایک پیسہ بھی کسی ایسی "قوت" کی امداد کے لئے خرچ کرنا گوارا نہ ہوتا جو کم سے کم ایشیائی تجارت پر اپنا اقتدار چاہتی رہی ہو۔

جاپان میں زلزلے اسی قدامت کے ساتھ سُنے جاتے ہیں جس قدامت پر جاپانی قوم نازاں ہے۔ تاریخ سے پتہ لگتا ہے کہ سب سے پہلا زلزلہ جاپان میں ۲۸۶ء قبل مسیح میں آیا تھا اسی زلزلے کے بعد کوہ فوجی یامہ اپنی پوری شان و شوکت کے ساتھ سطح زمین پر نمودار

ہوا ۔ جھیل بیوا بھی جس کا اس سے قبل کہیں نام و نشان بھی نہ تھا صفحۂ زمین پر پائی گئی ۔
تاریخ قدیم میں یہ واقعات نہایت ہی اہمیت کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں ۔ دوسرا زلزلہ غالباً
بہت عرصے کے بعد یعنی ۸۳۴ء میں آیا ۔ اور اس کے بعد پندرہ صدی کے عرصہ میں یعنی ۱۸۶۶ء
جاپان میں کل ۲۴۹ زلزلے آئے جن میں ۳۰ ۱۵۰۰ء کے قبل آئے ۔ ان زلزلوں کا خاص شکار
ہمیشہ شہر کیوٹو رہا ہے جو ہر مرتبہ بالکل مسمار ہو گیا ہے ۔ برخلاف اس کے یڈو ٹوکیو ۔ اس عرصہ میں
صرف ایک دفعہ زلزلہ محسوس کیا گیا ۔ اور ناگاساکی میں دو مرتبہ ۔ ناگاساکی کے یہ دونوں
زلزلے صرف تین سال کے عرصہ میں یعنی ایک ۱۲۲۳ء میں اور دوسرا ۱۲۲۵ء میں آیا ۔ اور
ہر مرتبہ شہر بالکل برباد ہو گیا اور ہزاروں جانوں کا نقصان ہوا ۔
بارہویں صدی میں صرف ایک مرتبہ ۱۱۸۵ء میں زلزلہ آیا ۔ کیوٹو میں کثیر نقصانات
ہوئے اور لاکھوں انسان فنا ہو گئے اور مسلح حصے غاروں میں تبدیل ہو گئے ۔
تیرہویں صدی میں کل سترہ زلزلے محسوس کئے گئے ۔ جس میں سے ۱۲۹۳ء میں جو زلزلہ
آیا اس میں اکیس ہزار آدمی ضائع ہوئے ۔ چھ سال بعد ۱۲۹۹ء میں دوسرا زلزلہ پھر آیا اور
اس میں بھی دس ہزار انسانوں کی جانیں گئیں ۔ اسی طرح اسی صدی میں ایک معمولی سے
زلزلہ میں ایک مندر کے گر جانے سے پچاس پوجاری دب کر مر گئے ۔
چودہویں صدی میں آٹھ زلزلے آئے ۔ جو قریب قریب اپنی بربادکن نوعیت میں ایک
دوسرے سے سبقت لے گئے ۔
سمندر کا پانی ان زلزلوں کی وجہ سے چڑھ آتا تھا ساحل پر جو شہر آباد تھے ان میں
ایک عجیب طوفان خیز حالت ہو جاتی تھی ۔
پندرہویں صدی میں پندرہ زلزلے آئے ۔ اور حسب سابق کے کثیر نقصانات کے
باعث ہوئے ۔
سولہویں سترہویں یا اٹھارہویں صدی میں کل ۲۶ زلزلے آئے ۔ بعد یہ سب

نہایت ہی تباہ کن تھے۔ ۳۰ر اگست ۱۵۹۶ء کا زلزلہ عجیب و غریب تھا۔ زلزلہ کے ساتھ ہی آتش فشاں بھی شروع ہو گئی تھی۔ ابھی لوگ سنبھلے بھی نہ تھے کہ چار روز بعد پھر یعنی ۴ر ستمبر کو دوبارہ زلزلہ آیا۔ جاپانیوں کا خیال ہے کہ یہ زلزلے ہیدے یوشی کی جو اُس وقت حکمران تھا، بداعمالیوں کے عذاب تھے۔ ہیدے یوشی ایک ٹیلہ پر جا کر پناہ گزیں ہوا اور دنیا[illegible] زندگی چھوڑ کر راہبانہ زندگی بسر کرنے لگا۔

جب ہم اٹھارہویں صدی کے زلزلوں کو شمار کرتے ہیں تو چودہ زلزلے صرف ۱۷۸۲ء تک آ چکے تھے۔ جس کے معنی یہ ہوئے کہ قریب قریب ہر پانچ سال کے بعد ایک زلزلہ آیا۔ ان میں ۱۷۰۷ء کا زلزلہ سب سے زیادہ مہیب تھا۔ جبکہ زلزلہ کے بعد ہی فوجی یاما نے آگ اور دھوئیں کی بارش شروع کر دی، جو ۱۶ر دسمبر ۱۷۰۷ء سے ۲۲ر جنوری ۱۷۰۸ء تک برابر جاری رہی۔ یہ ایک عجیب ردناک عذاب الٰہی تھا۔ جس کی تپش میلوں تک جاتی تھی۔ گرم راکھ جلتے ہوئے کوئلوں اور لاوے کا طوفان کئی میل رقبہ کو محیط کئے ہوئے تھا۔
اس کے بعد ۲۲ر دسمبر ۱۸۵۴ء کو پھر ایک زلزلہ آیا جس کی وجہ سے کیوٹو کے کئی بڑے بڑے کارخانے اور بہت سی عمارات کا نقصان ہوا اور ہزارہا آدمی مر گئے۔

اس کے بعد پھر ۱۸۵۵ء میں دوسرا زلزلہ آیا۔ جس کا سب سے زیادہ اثر اس مرتبہ ٹوکیو پر پڑا۔ گو ٹوکیو ایک سال قبل کا تباہ شدہ تھا تاہم سال بھر کے اندر دوبارہ تباہ ہونے کیلئے بہت کچھ تعمیر ہو چکا تھا۔ چنانچہ چودہ ہزار مکانات، چھ سو فائر پروف گودام اور ایک لاکھ چار ہزار نفوس پھر زلزلہ کی زد میں آ گئے۔ اس کے بعد پندرہ سال تک کوئی زلزلہ نہیں آیا۔ مئی ۱۸۷۰ء میں پھر آیا۔ اُس کے بعد ۱۸۸۰ء تک تین زلزلے آئے جس میں سے ۲۲ر فروری ۱۸۸۰ء کا سب سے زیادہ سخت تھا جس نے یاکوہاما کو بالکل تباہ کر دیا تھا۔ ۱۸۸۴ء میں ایک معمولی سا زلزلہ محسوس ہوا جس سے شہر کے ساحل کے دوسرے شہروں میں نقصانات ہوئے۔ [illegible]

تھا۔ اس سے بھی یاکوہاما اور ٹوکیو کو سب سے زیادہ برباد کیا۔ ان دونوں شہروں نے اس زلزلے کے بعد سے ہی مغربی صورت اختیار کرنی شروع کی۔

جاپان کی سرزمین پر نظر ڈالنے سے پتہ لگتا ہے کہ مسلسل زلزلوں کی وجہ سے جاپان نے بڑے بڑے ملکی نقصانات اٹھائے ہیں۔ سطح زمین پہاڑ بن گئی۔ کہیں جھیلیں پیدا ہوگئیں۔ غرضیکہ اس قسم کی تبدیلیوں کا بہت کچھ سراغ ملتا ہے۔ تاہم جاپان نے ان زلزلوں سے فائدے بھی اٹھائے ہیں۔ ۱۸۲۳ء میں جب زلزلہ آیا تو اس کے بعد اوسوشما (Ossomashima) کا خوبصورت جزیرہ سطح آب پر نمودار ہوا۔ جو آج کل یورپین باشندوں کے لیئے ایک نہایت ہی دلچسپ فرحت افزا تفریح گاہ بنا ہوا ہے۔ اسی طرح سے جزیرہ ہانگو کو بھی ایک زلزلے کے بعد جاپان کو قدرت نے عطا کیا اور سمندر سے اوپر نکال دیا۔ تواریخوں میں ایک واقعہ نقل کیا جاتا ہے کہ کسی ٹیلہ پر ایک کسان کی جھونپڑی تھی۔ شب میں زلزلہ آیا۔ ٹیلہ سطح زمین بن گیا۔ صبح کو کسان اٹھتا ہے تو اپنی جھونپڑی کو بجائے ٹیلہ کے ایک میدان میں پاتا ہے متعجب ہوتا ہے۔ مگر جب اُسے معلوم ہوتا ہے کہ شب میں زلزلہ آیا تھا تو اُسے یقین ہوتا ہے کہ اُس کی جھونپڑی اپنی اصلی جگہ پر ہے۔

جاپان کا یہ آخری زلزلہ جو یکم ستمبر ۱۹۲۳ء کی دوپہر کو ۲۹ برس کے بعد نمودار ہوا اور جس نے یکایک وہ تمام کوششیں ملیامیٹ کر دیں جو جاپان نے اپنے شہروں کو مغربی رنگ میں لانے کے لیئے کی تھیں، تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتا اس عظیم بربادی نے دو منٹ کے اندر اُن تمام عشرت گاہوں، عیش و نشاط کے محل خانوں، تفریحی مقامات، تھیٹروں، بڑے بڑے کارخانوں اور گوداموں کو اس طرح خاک سیاہ کر دیا کہ جہاں ہزارہا انسانوں کی چہل پہل رہتی تھی آج سوائے بیجان لاشوں کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ یہ خدا کی کرشمہ سازیاں ہیں۔ اور یہی ہیں جبروت و ملکوتیت کی بدیہی مثال، فاعتبروا یا اولی الابصار۔

محمد جعفری

رفتارِ تعلیم

آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا چھتیسواں[۳۶] اجلاس آیندہ ماہ دسمبر ۱۹۲۳ء میں بمقام علی گڑھ ہوگا۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب اس کے صدر ہوں گے۔ ہندوستان کے اطراف واکناف سے علم دوست حضرات مدعو کئے گئے ہیں مختلف مضامین پر مشاہیر ملک کے لکچر بھی ہونگے اسی سلسلہ میں کچھ نمائش کا انتظام بھی کیا گیا ہے جس میں پرانے کتبات، قلمی نسخے، اور شاہی فرامین دکھائے جائیں گے۔ مسلمانوں کی تعلیمی حالت پر غور کیا جائے گا۔ کانفرنس کے گزشتہ کارنامے بیان کئے جائیں گے۔ آیندہ ترقی بھی پیش نظر ہوگی۔ تعلیم نسواں اور تعلیم ابتدائی کے وسائل اور ذرائع بھی زیر بحث ہوں گے۔ مختلف تجاویز وترمیمات بھی پیش ہونے کو ہیں اور ہوں گی، غرض اس چند روز کے عرصہ میں بہت کچھ ہونے کی امیدیں بندھی ہیں۔ "مسلم قوم" منتظر ہے کہ اس کے مرض کی دوا یہیں سے ملے گی۔ ہر شخص آنکھیں لگائے ہوئے ہے کہ شاید آیندہ کے لیے کوئی سامان پیدا ہو، خود حضرات شرکا بھی سمجھتے ہوں گے کہ آئے ہیں تو کچھ کرکے ہی جائیں گے۔ فی الحال تو ہم بھی انھیں کے ساتھ اپنی امید وابستہ کرتے ہیں اور نتیجے کے منتظر ہیں۔ دسمبر کے پرچہ میں ہم انشاء اللہ کانفرنس کی کارروائیوں اور ان کے آیندہ نتائج پر تفصیل کے ساتھ گفتگو کرسکیں گے۔

کہا جاتا ہے کہ نپولین اور واشنگٹن کو فوج میں ہزارہا سپاہیوں کے نام یاد تھے۔ روزولٹ اور لنکن (ہر دو امریکہ کے پریسیڈنٹ رہ چکے ہیں) کو ہر بات جو انھوں نے کبھی پڑھی یا سنی، زبانی یاد تھی۔ پاسکل مشہور سائنس داں کو پوری انجیل برزبان تھی۔ شیکسپیر کو ۱۵ ہزار الفاظ اور ملٹن کو ۸ ہزار الفاظ یاد تھے۔ غرض ہر بڑے شخص کے ساتھ قوت حافظہ ایک مخصوص عنصر رہا ہے اور جیسا کہ بیکن نے کہا ہے "علم کیا ہے؟ فقط اشیاء کی یاد داشت"

لیکن اس سے یہ نہیں لازم آتا کہ حافظہ صرف بڑے اشخاص کا حصہ ہے، جو عام آدمی کو میسر نہیں آتا۔ ہزارہا اشخاص عام طور پر ایسے ملیں گے جو اپنی غیر معمولی یادداشت کا ثبوت دے سکتے ہیں۔ غرض اکتسابی طور پر بھی کوئی شخص چاہے تو اپنی قوت حافظہ کو بڑھا سکتا ہے۔ ڈاکٹر فنسٹن نے آٹھ چھوٹے چھوٹے قاعدے بتائے ہیں جن کی مدد سے قوت حافظہ بڑھائی جا سکتی ہے۔

قاعدے یہ ہیں۔

۱۔ اپنے خیال میں یکسوئی پیدا کرنے کی عادت ڈالو۔

۲۔ کسی چیز کا خیال قائم کرنے کے لیے جتنے حواس کام میں لا سکتے ہو، لاؤ۔

۳۔ جو قوت دماغی کمزور ہو، اُس کو رفتہ رفتہ باقاعدہ مشق سے بڑھاؤ۔

۴۔ کسی چیز کے متعلق جو پہلا خیال قائم ہو، اُسے مستحکم کرو۔

۵۔ اپنے قائم کردہ خیالات کو بار بار دُہراتے رہو (ایکٹروں کو جو کھیل وہ کئی بار کھیل چکے ہوں انھیں کچھ کچھ عرصہ کے بعد دہرانا چاہیئے۔

۶۔ اپنی یادداشت پر اعتماد رکھو۔ نوشتہ چیزوں اور دوسروں کی یادداشت پر بھروسہ نہ کرو۔

۷۔ اشیا کے خیال قائم کرنے میں جو جو صورتیں اور جن جن طریقوں سے ہو سکے، قائم کرو۔ کسی چیز کے یاد رکھنے میں کیا ہے؟ کہاں سے آئی؟ کہاں، کب، کیسے، اور کیوں آئی؟ اور کہاں جا رہی ہے؟ اس قسم کے جتنے سوالات ہوں پیش نظر رکھو۔

۸۔ اپنی اس مشق کو عملی اور مفید بناؤ۔

اس کے متعلق خود راقم الحروف کا ایک تجربہ ہے۔ ایک شخص نے انھی اصولوں کی بنا پر دعویٰ کیا کہ "تمہیں مختلف چیزوں کے نام ایک ساتھ لو اور میں اسی ترتیب کے ساتھ انھیں سننے کے بعد دیکھے بتا دوں گا۔" چنانچہ میں نام لیے۔ باہم کوئی ربط نہ تھا اور اکثر ان میں سے نامانوس اور مشکل تھے۔ ان میں سے ایک لفظ "ماقرقرا" بھی تھا۔ لیتے گئے اس پر مستزاد یہ کہ

شخص مذکور اس ملک کا باشندہ نہ تھا بلکہ یورپین تھا لیکن ۵ منٹ تک آنکھیں بند رکھنے کے بعد اس نے اسی ترتیب سے تمام نام یکے بعد دیگرے سنا دیئے۔ بعد میں اس نے اسی راز کو افشا کیا اور کہا کہ میں ہر چیز کی ایک تصویر اپنے ذہن میں قائم کرتا تھا اور دوسری چیز سے اُسے اسی خیالی تصویر کی بنا پر جوڑتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ میرے ذہن میں میں اشیاء کا ایک کامل تصور سلسلہ بن گیا۔ اور اس ۵ منٹ میں آنکھ بند کر کے میں نے اس پر ایک نظر دوڑائی اور پھر ان قائم کردہ ذہنی تصویروں کی بنا پر اس سلسلہ کی مدد سے تمام اشیاء کے نام یکے بعد دیگرے بیان کر گیا"

اس طویل گفتگو سے صرف یہ بتانا منظور تھا کہ "تعلیم" نہ صرف محسوس طریقہ اور مرئی اشیاء کے ذریعہ ہو سکتی ہے بلکہ غیر محسوس طریقے سے بھی ممکن ہے اور "رفتار تعلیم" میں بہت کچھ ترقی کی جا سکتی ہے۔

یوں تو ہندوستان میں کم و بیش ساڑھے تین سو زبانیں بولی جاتی ہیں لیکن ان میں چند ایسی ہیں جن پر علمی زبان کا صحیح معنوں میں اطلاق ہو سکتا ہے۔ انہی میں سے ایک مرہٹی زبان بھی ہے جسے ہندوستان کی تمام دیسی زبانوں میں انسائیکلو پیڈیا شائع کرنے کا فخر حاصل ہے۔ علاوہ اس کے زبان مذکور نظم و نثر کے لحاظ سے بھی دوسری زبانوں میں خاص مرتبہ رکھتی ہے اس زبان کے متعلق بیتی انجمنیں اور مجالس کام میں برابر مصروف ہیں ان میں سے ایک مجلس تراجم دکن بھی ہے۔ اس کی تاریخ یوں بیان کی جاتی ہے کہ جس زمانہ میں دکن میں پیشوا کی حکومت تھی، اس وقت پنڈتوں اور علمی اشخاص کو حکومت کی طرف سے قریباً ایک لاکھ روپئے بطور وظائف (جنھیں "دکشنا" کہتے تھے) عطا کئے جاتے تھے۔ جب انگریزوں نے مرہٹی علاقہ برطانوی ہند کے ساتھ ملحق کر لیا تو ماؤنٹ سٹوورٹ الفنسٹن (جو غالباً ہندوستان کی مشہور "الفنسٹن ہسٹری" کے مصنف ہیں) نے وہ رقم مشرقی علوم کی ترقی کے لئے وقف کر دی چنانچہ دکشنا پرائز کمیٹی کے نام سے ایک مجلس قائم کی گئی جو مصنفین و مترجمین کو اس رقم سے صلہ عطا کرے

کام کر رہی تھی کچھ عرصہ کے بعد ہماری "انجمن ترقی اُردو" کی طرح یہ کمیٹی بھی بیکار ہو گئی لیکن مرہٹی لٹریچر کی خوش نصیبی سے ۱۹۴۳ء میں مجلس تراجم دکن نے اس کی جگہ لے لی۔ آیندہ خیال یہ ہے کہ اس مجلس کے ساتھ مزید علمی حضرات کا اضافہ کرکے اس کا نام اکاڈیمی آف مرہٹی لٹریچر رکھ دیا جائے تاکہ مرہٹی زبان میں تصنیف و تالیف کا کام مستقل طور پر ہو سکے۔

امید ہے کہ قدر شناسان ریختہ اور حامیان اُردو اس کے پڑھنے کے بعد اپنی زبان کی "رفتار ترقی" پر بھی غور فرمائیں گے۔

کچھ عرصہ قبل ترک منشیات کی جو تحریک امریکہ نے اُٹھائی تھی، اس کے خلاف سب سے بڑا عذر جو پیش کیا گیا، وہ کوئی اخلاقی یا مذہبی نہ تھا بلکہ سراسر دنیوی پہلو لیے ہوئے تھا۔ کہا جاتا تھا کہ اس کی آمدنی سے جو معقول رقم آتی ہے وہ تعلیم پر صرف کی جاتی ہے اور اس بنا پر ان کو اندیشہ تھا کہ اس لعنت کے دور ہو جانے سے ایک بڑی برکت ہاتھ سے چلی جائے گی۔

اسی طرح تحریک ترک موالات کے سلسلہ میں جب ترک منشیات کی کوشش کی جا رہی تھی ہندوستان کے بعض حامیان تعلیم نے بھی یہی سبق دُہرایا کہ "محکمہ آبکاری کے بند ہو جانے سے ہندوستان کی تعلیم پر برا اثر پڑے گا" لیکن شاید وہ یہ دیکھ کر کہ حکومت امریکہ نے قبل از تحریک اور اس کے بعد میں تعلیم پر کس نسبت سے صرف کیے کیا جواب دیں گے؟ اس کے لیے اعداد حسب ذیل ملاحظہ ہوں:-

اس دو برس میں		سال	مصارف
اس دو برس میں شراب کی بکری کم ہوئی	{	۱۹۱۶ء	۵۳،۵۰،۷۱،۲۴۳۴ ڈالر
		۱۹۱۸ء	۵۹،۰۸،۷۴،۳۶۷ ڈالر
اس سال کم تھی	{	۱۹۲۰ء	۵۰،۲۸۱،۳۹۱،۱ ڈالر

یہ تو ابتدائی اور ثانوی تعلیم کا حال ہے۔ اعلیٰ تعلیم کے اخراجات کا اندازہ اعداد

ذیل سے کیجئے۔

سال		اخراجات	عطیات
اس دو برس میں شراب کی بکری کم ہوئی تھی	سنہ ۱۹۱۶ء	۱۱۳۸۱۵۰۸۴۸	۱۹۷۷۶۳۶۳ ڈالر
	سنہ ۱۹۱۸ء	۱۳۷۰۰۵۴۱۵	۱۶۷۴۶۱۴۰ ڈالر
اس سال کم نہ تھی	سنہ ۱۹۲۰ء	۱۸۹۲۳۵۲۴۲	۵۰۹۰۶۷۵۲ ڈالر

سر جے، سی بوس کی شخصیت ہندوستان کے دورِ حاضر میں، اپنی مثال نہیں رکھتی، نہ صرف یہی بلکہ آپ کا شمار دنیا کے مشہور ترین ماہرین سائنس میں ہوتا ہے۔ سنہ ۱۹۱۹ء میں جب آپ یورپ تشریف لے گئے تو رائل سوسائٹی نے آپ کو اپنا فیلو بنانا فخر سمجھا۔ پیرس میں مشہور سائنس دانوں نے آپ کا شاندار استقبال کیا۔ وائنا اور برلن میں آپ کے علمی کاموں کو نہایت پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا گیا۔

آپ کا سب سے بڑا کارنامہ بوس انسٹیٹیوٹ ہے جو چھ سال سے پیشتر آپ نے کلکتہ میں قائم کیا۔ اس میں کوئی ایک درجن اشخاص تحقیق و تفتیش کا کام نہایت محنت و سرگرمی کے ساتھ کرتے ہیں۔ سر مائیکل سیڈلر نے اس انسٹیٹیوٹ کے متعلق ایک بہت اچھا فقرہ کہا ہے "یہ وہ چراغ ہے جس سے ہزاروں اشخاص نشانِ راہ پائیں گے"۔

ان دونوں کے تعارف کے بعد ہم سر جے۔ سی بوس کی ایک تازہ ترین تحقیق ناظرین کے سامنے پیش کرتے ہیں جو آپ نے گزشتہ ہفتہ یونیورسٹی کالج، میں پیش کی ہے۔ آپ نے بسلسلۂ تحقیق نباتیات ایک ایسا آلہ ایجاد کیا ہے جس کے ذریعہ سے پودا اپنی خوراک از خود لے سکتا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس جدید آلہ کی اختراع سے آئندہ طب پر جو اثر پڑے گا اس پر علمی رائل سوسائٹی کے کسی خاص اجلاس میں غور کیا جائے گا۔

مطبوعاتِ جدیدہ

افاداتِ مہدی | یہ کتاب دورِ جدید کے مشہور انشا پرداز ایم مہدی حسن (جنھوں نے ابھی حال میں وفات پائی ہی) کے مضامین کا ایک مجموعہ ہی جو ان کی بیگم صاحبہ نے مقدمہ، سوانح مصنف اور چند ضمیموں کے اضافہ کے ساتھ شائع کیا ہی۔ یہ مجموعہ چونکہ خود کوئی مستقل کتاب نہیں ہی۔ اس لیئے مضامین کے انتخاب اور ان کی ترتیب تالیف میں کما حقہ لحاظ نہیں پایا جاتا ہی۔ لیکن "حالی و شبلی کی معاصرانہ چشمک"۔ "ادبِ اردو کے عناصرِ خمسہ"، "فلسفۂ حسن و عشق" اور "اُردو لٹریچر کا نفسِ واپسیں" نیز دیگر مضامین جو اپنی وقتی اور ہنگامی اہمیت کے علاوہ آج بھی ذوقِ سلیم کے لیئے خاص لطف اور دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس مجموعہ میں کچھ مضامین ایسے ملیں گے جن کی زبان علمی حیثیت سے نہایت پاکیزہ اور سلیس ہی۔ مصنفین کے گزشتہ دور اور جدید انگریزی داں طبقہ کے متعلق لکھتے لکھتے تحریر فرماتے ہیں:۔

> "یہ ایک کھلا ہوا راز ہی کہ جو بساط ابھی دیکھتے دیکھتے اُٹھ گئی یعنی لٹریچر کے جو حقیقی مالک تھے وہ قریب قریب ایسے تھے جنھیں مشرقی تعلیم نے پیدا کیا تھا اور جن کو مغربیت کچھ یونہی چھو گئی تھی لیکن ان کی قوتِ اجتہادی کا مظہر وہ معرکۃ الآرا سرمایۂ ادب ہی جو ورثہ میں وہ ہمارے لیئے چھوڑ گئے ہیں بہرحال نوجوان طبقہ کی بیگانہ وشی بہت ہی لائقِ افسوس ہی۔"

اور جو مضامین خالص ادبی ہیں وہ اسی رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ "فلسفۂ حسن و عشق" میں ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

> "آہ عورت! تو فسانۂ زندگی ہی۔ تو جس طرح ایک جھونپڑے کو اپنی صاف شفاف ہستی سے شیش محل بنا سکتی ہی، بڑے سے بڑے ایوانِ عیش کی تکمیل اس وقت تک ممکن نہیں جب تک تیری موجودگی کے آثار اس میں نہ پائے جائیں!"

گنجائش نہیں اس لیے علمی و ادبی رنگ کے یہ اقتباسات بطور مشتے نمونہ از خروارے
مختصراً پیش کیے گئے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ مصنف ایک انگلش اسٹائل کے موجد تھے جو اپنے ساتھ
لائے اور لیتے گئے۔ نئی اصطلاحات مثلاً "قاموس الاسلام" (Encyclopaedia) اور
"تنقید عالیہ" (Higher Criticism) اختراعی ترکیبیں جیسے "پنجتن اصفیٰ"
(اردو کے عناصر خمسہ کے لیے) "خاتم المصنفین" (مولانا شبلی کے لیے) نیز انگریزی
ترکیبیں مثلاً "شائقین ترقی کو اپنی سب سے پہلی فرصت میں توجہ کرنی چاہیے" یا "آدھ گھنٹہ
علامہ شبلی کے ساتھ" یہ چیزیں مصنف کی خصوصیات میں سے ہیں جنھیں وہ اپنے ساتھ لائے
اور لیتے گئے۔ بہر حال یہ مجموعہ اب بھی اخلاف کے لیے شمع راہ کا کام دے سکتا ہے۔
بیگم صاحبہ نے اسے جلد شائع کر کے اردو زبان کی ایک بڑی خدمت انجام دی ہے۔
کتابت و طباعت نہایت عمدہ، کاغذ اعلیٰ قسم کا، شروع میں مصنف مرحوم کا ایک فوٹو
بھی ہے۔ ملنے کا پتہ:

مہدی بیگم، محلہ بسنت پور، گورکھپور

باغ نو: یہ کتاب ڈاکٹر ٹیگور کی "شِشُو" کا اردو ترجمہ ہے جسے حامد اللہ افسر صاحب، بی۔ اے
نے کیا ہے۔ اصل کتاب مختصر نظموں کا ایک مجموعہ ہے اور بہ لحاظ مضمون بچوں کے جذبات
و حسیات اور ان کے خیالات کا ایک مرقع ہے۔ یوں تو ٹیگور کی نظر میں ع

ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

لیکن خدا کا جلال اور اس کی معرفت اسے جتنا ایک بچے میں نظر آتی ہے شاید اور کسی چیز
میں مشکل سے معلوم ہوتی ہو۔ یہی سبب ہے کہ اس کے اکثر قصے اور افسانے بچوں کے متعلق
اور انھیں کے مذاق کے مطابق ہوتے ہیں۔ اصل زبان یعنی بنگالی بھی جہاں تک معلوم
ہوا ہے بہت سلیس اور عام فہم ہوتی ہے۔ ایسی کتاب کا ترجمہ بلاشبہ اردو زبان میں
ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ خود مترجم نے بھی سلاست بیان اور عام فہمی کی کوشش کی ہے

گو بعض جگہ یہ رشتۂ خیال ہاتھ سے چھوٹ بھی گیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک طرف اگر "پیڑ" "تالی" (بمعنی کنجی)، "مسکراہٹ" "جتا" "چترائی" اور "کونے" جیسے سادہ الفاظ پائے جاتے ہیں تو دوسری جانب "مضطرب" "مستعد" "موسیقیت" "پرعناز" "طلائی مشجر" "اسرار معنی خیز" اور "بزرگ خورد سال" جیسے الفاظ اور ترکیبیں بھی نظر آتی ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ مترجم صاحب آئندہ تالیفات میں اس کا لحاظ رکھیں گے کتاب کی لکھائی چھپائی معمولی قسم کی ہے۔ قیمت دس آنہ۔ ملنے کا پتہ: منیجر انڈین بک ڈپو۔ اندرکوٹ شہر میرٹھ۔

دختر سمرنا | یہ کتاب خالدہ ادیب وزیر تعلیم انگورہ کے ناول "قمیص من نار" کا اردو ترجمہ ہے جسے مولوی غلام ربانی صاحب لودھی (علیگ) نے کیا ہے اور جسے "صوفی پبلشنگ کمپنی" نے شائع کیا ہے۔ سلسلہ عبارت میں کہیں کہیں اس قسم کے فقرے اور ترکیبیں آجاتی ہیں مثلاً "میں گھر کی طرف خط لکھ رہا ہوں" "میری والدہ نے مکان کو یورپین طرز پر سجایا ہوا تھا" "البتہ تمہارے انتظار میں ہوں کہ تم آؤ اور اکٹھے پیوستہ کریں" جس سے عام زبان میں ایک اجنبیت سی محسوس ہونے لگتی ہے۔ بہرحال نفس واقعہ ناظرین اردو کے لئے دلچسپی سے خالی نہیں اور کتاب اس لحاظ سے قابل قدر ہے کہ اس کو پڑھ کر ناظرین ترکی کی معاشرت و سیاست سے یک گونہ آشنا ہو جائیں گے۔

لکھائی، چھپائی اور کاغذ معمولی۔ صفحے ۱۷۶ قیمت ۱۲؍ ملنے کا پتہ
صوفی پرنٹنگ اینڈ پبلشنگ کمپنی لمیٹڈ، پنڈی بہاء الدین، پنجاب

سپاہیانہ زندگی | اکبر شاہ خاں صاحب نجیب آبادی کی یہ تصنیف ہے مصنف نے سپاہیانہ کے لفظ کو اس قدر وسعت دی ہے کہ انسانی زندگی کے تقریباً ہر پہلو یعنی سادگی لباس و طعام، ایثار نفسی اور ایفائے وعدہ کو اس میں شامل کر لیا ہے اور خود ایک "مورخ" ہونے کی حیثیت سے تاریخ عالم سے حوالے بھی دئے ہیں۔ ظہور اسلام سے قبل انبیائے کرام

اور دیگر نامور اشخاص اور بعد میں خود آنحضرت صلعم، خلفاء راشدین اور سلاطین کے سوانح سے شجاعت و بہادری کے واقعات پیش کیے گئے ہیں۔ ایک باب میں قرآن سے بھی استدلال کیا ہے۔ آخر کے چند صفحات میں ہندوستانی سوسائٹی کے ہر طبقہ میں معائب گنائے گئے ہیں۔ پوری کتاب کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یا تو مصنف کا مقصد مشہور اشخاص کے حالات زندگی اور واقعات تاریخی پیش کرنا تھے یا ہندوستانی سوسائٹی کے عیوب بیان کرنا۔ بہرحال عنوان کتاب کا لحاظ نہ کیا جائے اور تاریخی واقعات کی حیثیت سے دیکھا جائے تو کتاب فائدہ سے خالی نہیں۔ طباعت و کتابت معمولی صفحے ۱۲۶، قیمت عمر صوفی پبلشنگ کمپنی لمیٹڈ پنڈی بہاء الدین پنجاب نے شائع کیا۔

شرحِ دردِ اشتیاق

(از جناب عابد حسین صاحب بی۔ اے۔ از برلن)

میں رخِ امکاں کا رنگِ پریدہ ہوں — آفرینش کا دلِ پُر درد ہوں
زیست کے آئینۂ دل کا غبار — مرگ کے نقشِ قدم کی گرد ہوں
تھا عدم کی آنکھ میں اک قطرۂ خوں — سینۂ ہستی میں آہِ سرد ہوں
مجھ کو لائے ہیں مری مرضی بغیر — یعنی میں آمد نہیں آورد ہوں

چوں مرا در دارِ دنیا کردہ اند
پس پشیمانند بیجا کردہ اند

اے خوشا روزے کہ میں معدوم تھا — بے نیازِ ہستیٔ موہوم تھا
نقش میرا سطحِ امکاں پر نہ تھا — لوحِ قدرت پر مگر مرقوم تھا
ہیں مشیت کے جو معنی دہر میں — میری ہستی کا وہی مفہوم تھا
رشکِ صد ایجاد تھا میرا عدم — سب سے پنہاں تھا اُسے معلوم تھا

از شرابِ شوق جامے داشتم
در دلِ ساقی مقامے داشتم

آکے اس بازیچۂ اسباب میں — پڑ گیا ہوں سخت پیچ و تاب میں
بحر کی وسعت نظر سے چھپ گئی — موج کے ہمراہ ہوں گرداب میں
آنکھ کا پردہ ہی خود حدِ نظر — مبتدی ہوں معرفت کے باب میں
رکھ لیا محرابِ طوعت اس کا نام — سجدہ زن ہوں طوعت محراب میں

سوئے موجودات مائل گشتہ ام
از مآلِ کار غافل گشتہ ام

میرا مونس تھا بد انجام عشق — اصل سے ہٹ کر ہوا بدنام عشق
تھا نوا سنج سکونِ دائمی — دہر میں ہے مورثِ آلامِ عشق
شورشِ بدِ تخیل کو کہتے ہیں حسن — اضطرابِ قلب کا ہے نام عشق!
چشمِ بینا۔ اور یہ نادار حسن! — قلبِ صافی۔ اور یہ ناکام عشق

دردمندی را کہ سازد چارہ ساز
وائے بر گمراہیِ عشقِ مجاز

باعثِ تسکیں مگر ہے یہ خیال — عارضی ہے زیست کا رنج و ملال
اتحادِ نور و ظلمت تابہ کے — چند لحظے چند ساعت چند سال۔
پھر وہی آہنگِ سیرِ لامکاں — پھر وہی سودائے حسنِ لازوال
قیدِ صورت سے ملے گی پھر نجات — شاہدِ معنی سے پھر ہوگا وصال

مرغِ جاں را آشیانے دیگر ست
"ایں مکاں را ہم مکانے دیگر ست"

عابد

قیدِ ناگزیر

(از نتائجِ فکرِ جناب مولوی فضل الحق صاحب آزاد عظیم آبادی)

شب کے اخیر حصۂ غفلت میں یک بیک — جب ساری کائنات ہی آغوشِ خواب میں
کھلتی کبھی ہی اور جھپکتی کبھی پلک — اک التہاب ہی دلِ پُر اضطراب میں

جس طرح آبدانِ برآتش میں جوشِ آب — خمیازہائے نشترِ عناصر لیے ہوئے
آنکھوں میں مستحیل کچھ آنسو ہیں یا گلاب — خونِ جگر سے دعوتِ مژگاں کیے ہوئے

کیوں؟ دل میں یہ کھٹک ہی کسی گلِ عذار کی — دل آب آب جس کے ہوا ہی فراق سے؟
یا آگئی ہے یاد کسی جاں نثار کی — یا آگئے ہیں آنکھوں میں اشک اتفاق سے؟

کچھ بھی نہیں وہ ہائے کہاں ہم کہاں وہ دل — کیسی کسی کی یاد یہ سب اک خیال ہی
ماضی کی حسرتیں غمِ آیندہ جاں گسل — اس قیدِ ناگزیر سے چھٹنا محال ہی

آزاد عظیم آبادی

غزل

از تازہ افادات مولانا محمد علی مدظلہٗ

گلہ اے دل! ابھی سے کرتا ہے؟ — عشق کا دم اسی پہ بھرتا ہے!
جان دیتا ہی عیشِ فانی پر — بس اسی زندگی پہ مرتا ہے؟
راحتِ جاوداں کو بھول گیا — کوئی دنیا میں یہ بھی کرتا ہے؟
عشق بن گر جئے تو خاک جئے — زندہ وہ ہے جو اُس پہ مرتا ہے
نام پر اُس کے سب جو دے بیٹھا — وہی اک ہے جو نام کرتا ہے
وقتِ مومن ہے آزمائشِ عشق — اس میں پورا وہی اُترتا ہے
جس کو دنیا نے نامراد کہا — وہی ناکام کام کرتا ہے
ہے مسلماں کی بس یہی پہچان — کہ فقط اک خدا سے ڈرتا ہے
قولِ مومن ہے اُس کے فعل کی شرح — وہ جو کہتا ہے کر گزرتا ہے
مطمئن رہ، دلا، وہ جانِ جہاں — وعدہ کرکے کہیں مکرتا ہے
میرے رنگِ کفن کی شوخی دیکھ — یوں ہی عاشق ترا سنورتا ہے!
آج کر لو جو کر سکو، کل تک — کون جیتا ہے، کون مرتا ہے؟
قلزمِ عشق میں گرا سو گرا — اس کا ڈوبا کہیں اُبھرتا ہے؟
اس قدر احتیاط، اے صیاد! — کہ قفس میں بھی پر کترتا ہے؟
وہی دن ہے ہماری عید کا دن — جو تری یاد میں گزرتا ہے

مے اسلام کا بھلا، جوہر!
نشہ چڑھ کر کہیں اترتا ہے؟

اگست سنہ ۱۹۲۲ء

غزل

(از مولانا حسرت موہانی)

نظر اُس رُخ پہ ہے ادب کے خلاف
دل ہے اس فیصلہ میں سب کے خلاف

کچھ بھی ہم اُن سے کہہ سکے نہ کہیں
ناخوشیہائے بے سبب کے خلاف

شکرِ غم تابعِ خمار نہیں
مستیٔ بادۂ عنب کے خلاف

آج پر کیا وہ روز کرتے ہیں
بیرخی، وعدہائے شب کے خلاف

حُسنِ جاناں کے عہد میں حسرت
شوق ٹھہرا ہی ماوجب کے خلاف

تواریخ صلح لوزان کانفرنس

(نتائج فکر جناب مولوی حامد حسن صاحب قادری اڈیٹر اخبار "سعید")

۱

(در صنعت زبر و بنیات غیر منقوط)

صلح کرد و کمالِ کامل
عادل۔ محمود عصر و ہمدرد

حامد را کرد ملہم الہام
صلح حاصل مراد دل کرد

۱۳۴۱

۲

(در صنعت زبر بقاعدۂ معمولی غیر منقوط)

مالکِ ملکِ دو عالم کرد مسلم را عطا
صلح کامل، دارِ دردِ دل و آرام دل

مصرعِ سالِ حصولِ صلح آمد در دلم
سرور و سالار صالح کرد حاصل کام دل

۱۳۴۱

۳

(در صنعت زبر و بنیات بغیر صنعت غیر منقوط)

اے کمال اکملِ عصری لاریب
عادل و شیر دل و دریا دل

ناخنِ زیرکی و ہمت تو
حل کند عقدۂ کارِ مشکل

صلح در مجلسِ لوزان کردی
بحقیقت شدہ فتحے کامل

حامد اندر زبر و بنیہ گفت
کردہ فتح بینے حاصل

۱۳۴۱

تاریخ رہائی مولانا محمد علی

(در صنعت زبر و بینات)

آں محمد علی رہبر ہند | عزت قوم را علم بردار
کہ بر اسلام و مسلماں کردہ | وقف، مال و متاع و جاہ و وقار
ہم سر خویشتن بکف دارد | کہ کند بہر دینِ خویش نثار
چوں ز قیدِ فرنگ شد آزاد | گشت مسرور قلب حامدِ زار
گفت تاریخ بینات و زُبُر | باشد آزاد سرور سالار

۱۹۲۳
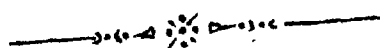
شذرات

'مغربی تہذیب' کہئیے یا 'تمدن جدید' اس کے معائب و نقائص پر گزشتہ ربع صدی کے اندر مشرق میں بہت کچھ کہا اور لکھا جا چکا ہی اور اب تک زبان و قلم اس تہذیب کی ہرزہ گوئی سے تھکے بھی نہیں۔ جنھوں نے مذہبی نقطہ نظر سے دیکھا، ان کی نظر میں مغرب بیگانہ از دین مذہب، اور مادیت کا مجسمہ نظر آیا۔ جنھوں نے اخلاقی عینک لگا کر اس تہذیب پر نظر ڈالی انھیں اس کا ہر ہر جزو مخرب اخلاق دکھائی دیا۔ جنھوں نے اس کی معاشی زندگی کا مطالعہ کیا انھیں سرمایہ و مزدور باہم دست و گریباں نظر آئے اور بعض نے اس کے سیاسی نظام کو دیکھا انھیں یہ تہذیب رو بہ زوال، اور اندر سے کھوکھلی معلوم ہوئی۔ غرض جس نے جس پہلو سے دیکھا، اُسے یہ تہذیب اور نظام سرتاپا عیب ہی عیب نظر آیا اور مشرق یہ سُن سُن کر خوش ہو رہا تھا اور بعض بہی خواہانِ مشرق تو اس حد تک پہونچ گئے کہ زوال مغرب خود عروج مشرق ہی۔ لیکن شاید مشرق اس حقیقت سے بے خبر ہی کہ اطبائے مغرب ان امراض تہذیب کی تشخیص و علاج سے بھی غافل نہیں۔ ابھی حال میں جرمنی کے ایک فاضل مصنف نے "پان یوروپا" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہی جس میں وہ حسرت کے ساتھ کہتا ہی:۔

"جہاں بقیہ دنیا دن بدن ترقی کر رہی ہی، یورپ رو بہ تنزل ہی، صرف اسی قدر کہہ دینا ایک تفصیل سے کم نہیں"

آگے چل کر وہ لکھتا ہی کہ

"گزشتہ عالمگیر جنگ نے یورپ کے ہر شخص کی سیاسی حالت بدل دی لیکن وہاں کے سیاسی نظام میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوا ہی۔ آج بھی یورپ میں طوائف الملوکی، جبر و تعدی، بغض و عداوت، معاشی حیثیت سے اختلافات مراتب اور سیاسی

چالوں کا اسی طرح وار دو رہ ہے جس طرح قبل از جنگ تھا یورپ کی موجودہ پالیسی آیندہ کی بہ نسبت گزشتہ پالیسی سے زیادہ مشابہ ہے۔ یورپ تاریخ مستقبل کی بجائے ماضی کی طرف کیے ہوئے ہے۔ ہمارے علمی بازار میں بھی تزک و سوانح کی زیادہ زور ہے۔ عام مباحثے بھی زیادہ تر گزشتہ جنگ کے اسباب و علل پر ہوتے ہیں نہ کہ آیندہ جنگ کے انسداد پر۔

"یورپ کا ہمیشہ پیچھے مڑ مڑ کر دیکھنا ہی اس کے انحطاط اور اختلافات کا اصل باعث ہے۔ یہ اس کے نوجوانوں کا فرض ہے کہ اسے بدلیں۔ ان سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ قدیم یورپ کے باقی ماندہ نشانات پر جدید عمارت کھڑی کر دیں"

فاضل مصنف کے ان ارشادات میں کیا ہندوستان کے لئے کوئی سبق نہیں؟ ہے اور بہت کچھ ہے بشرطیکہ گوش دل سے سنیں اور عمل کریں۔

لائق حکیم نے امراض اور ان کی تشخیص ہی پر بس نہ کیا بلکہ ان کا علاج بھی سوچا ہے۔ اس کی تجویز یہ ہے کہ تمام یورپ اپنے اندرونی سیاسی و معاشی اختلافات کو مٹا کر ایک ہو جائے اور ایک دوسرے کی امداد و اعانت کے لئے تیار رہے۔ جو راہ عمل وہ ملک کے سامنے پیش کر رہے ہیں، وہ "پان یوروپا" یعنی "اتحاد یورپ" کی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:۔

"لوگ یہ سمجھیں گے کہ "پان یوروپا" ایک خیال ہے۔ یہ اعتراض ٹھیک نہیں۔ کوئی قانون قدرت اس کے لئے مانع نہیں .... ہر بڑے تاریخی کارنامے کی ابتدا خیال ہی سے ہوئی اور خاتمہ حقیقت پر ہوا..... "پان یوروپا" (اتحاد یورپ) کا مستقبل زیادہ تر ان ابتدائی ہزار اشخاص پر منحصر ہے جو اپنے اعتقاد اور عزم سے لاکھوں کو اس کا قائل بنا دیں اور کل دگزشتہ کے "خیال" کو کل (آیندہ) کا حقیقت کر دکھائیں۔ میں یورپ کے نوجوانوں سے یہ اپیل کرتا ہوں کہ وہ اس فرض کو

انجام دیں"
یہ سب سننے کے بعد ہم تو ان اطباء سے عرض کریں گے کہ آپ یہ دیں جیتے۔ زخم کہنہ ہو کر ناسور کی جا پہونچ گیا اور اس پر صحت کی امید۔

ع این خیال است و محال است و جنوں

ایم امیل کوئی ایک فرانسیسی ڈاکٹر نے ایک جدید طریقۂ علاج ایجاد کیا ہے اور ہزار ہا مریض ہر روز ان کے شفاخانے پر آتے ہیں اور بے دوا شفا پا کر چلے جاتے ہیں۔ وہ یہ کرتا ہے کہ مریضوں کو تیس تیس، چالیس چالیس کے گروہ بٹھا کر ان سے کہتا ہے کہ اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں میں انگلیاں ڈال کر خوب زور سے دبائیں یہاں تک کہ ہاتھ کانپنے لگتا ہے، پھر اس کے بعد ان سے یہ کہتا ہے کہ وہ خیال کریں کہ وہ اپنا ہاتھ ایک دوسرے سے جدا نہیں کر سکتے اور پھر ان سے کہتا ہے کہ اب چھڑا لو لیکن وہ ناکام رہتے ہیں۔ اس کے بعد کوئی انھیں یہ سمجھاتا ہے کہ جہاں تم نے یہ سمجھا کہ "میں یہ نہیں کر سکتا" تو اس وقت تمھارے لئے ہاتھوں کا چھڑانا ناممکن ہے۔ اس کے بعد مریض آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور وہ ان سے کہتا ہے کہ اپنے اپنے دلوں میں اطمینان رکھو۔ تمھارے تمام اعضا درست ہو گئے اور تم اب بالکل اچھے ہو گئے اور چلتے وقت ان سے یہ تاکید کر دیتا ہے کہ وہ صبح و شام بیس مرتبہ یہ کہیں کہ "میں ہر ہر نقطۂ نظر سے اچھا ہوتا جاتا ہوں"

بعض وقت جب درد کی شکایت ہوتی ہے تو انھیں یہ نسخہ بتایا جاتا ہے کہ وہ جس قدر جلد ہو سکے یہ کہیں کہ "درد کم ہو رہا ہے، درد کم ہو رہا ہے" اس سلسلہ میں یہ امر خاص طور پر ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ اس علاج کی طرف زیادہ تر اناث کا طبقہ رجوع کرتا ہے اور جو لوگ اس شفاخانے میں آتے ہیں، وہ ڈاکٹر اور اس کے طریقۂ علاج کی شہرت و اہمیت سے مرعوب ہو چکتے ہیں۔

یاد ہوگا قدیم ہندوستان میں اور آج بھی بہتیرے قصبات و دیہات میں ہزارہا مریض ایک منتر یا معمولی دعا و تعویذ سے شفایاب ہو جاتے ہیں۔ بہت سے امراض ایسے ہیں جن کے علاج سے اکثر اطبا اور ڈاکٹر عاجز آجاتے ہیں لیکن کسی مقامی یا قریبی دیہات کے ایک معمولی شخص کی "جھومنتر" اور "جھاڑ پھونک" سے وہ مریض فوراً اچھے ہو جاتے ہیں۔ مغرب اور مغربی تہذیب کے مشرقی شیدائی اِسے "توہم" اور "جہالت" سے تعبیر کریں گے اور حقارت کے ساتھ معالج اور معالجہ دونوں کو "قرن وسطی" سے منسوب کریں گے۔ لیکن کوئی اور اس کے طریقۂ علاج کا ان کے پاس کیا جواب ہے؟ یہ ناآشنایانِ حقیقت اب تک ان معالجین اور ان کے طریقۂ علاج کے پیچھے پڑے تھے لیکن وہ اس راز سے بے خبر تھے کہ یہ مریضار کے "اعتقاد" اور "یقین" کا نتیجہ تھا جس نے ان کو شفا بخشی۔ یا بعض ماہرین نفسیات کی اصلاح میں یہ (Sub-Conscious mind) کا اثر تھا۔

دیوان غالب اردو

جس طرح نظم اردو کی بہترین کتاب تسلیم کی جاتی ہے اسی طرح جو اڈیشن ہم نے خاص اہتمام سے جرمنی سے چھپوا کر منگایا ہے اُس کے متعلق بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اس سے بہتر اُردو زبان میں آج تک کوئی کتاب طبع نہیں ہوئی نہایت نفیس ٹائپ سُرخ جلد پر سُنہرا کام ہے اندر مرزا صاحب کی رنگین تصویر ہے اور پھر مکمل دیوان مع قصائد و غزلیات رباعیات اور اس کے بعد بیاض کے لیے سادہ اوراق دئیے ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ قابل قدر خود مرزا غالب مرحوم کا لکھا ہوا مقدمہ ہے جو شروع میں درج ہے اس اڈیشن کی مقبولیت کی یہ حالت ہے ہم کو کسی طرح امید نہیں کہ شائقین تک پہنچ سکے بہر حال درخواست خریداری بھیج دیجیے تاکہ نام درج رجسٹر ہو جائے اور اس وقت نہیں تو دوسرے اڈیشن میں مایوسی نہ ہو۔ قیمت صرف تین روپیہ

المشتہر

مہتمم مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ